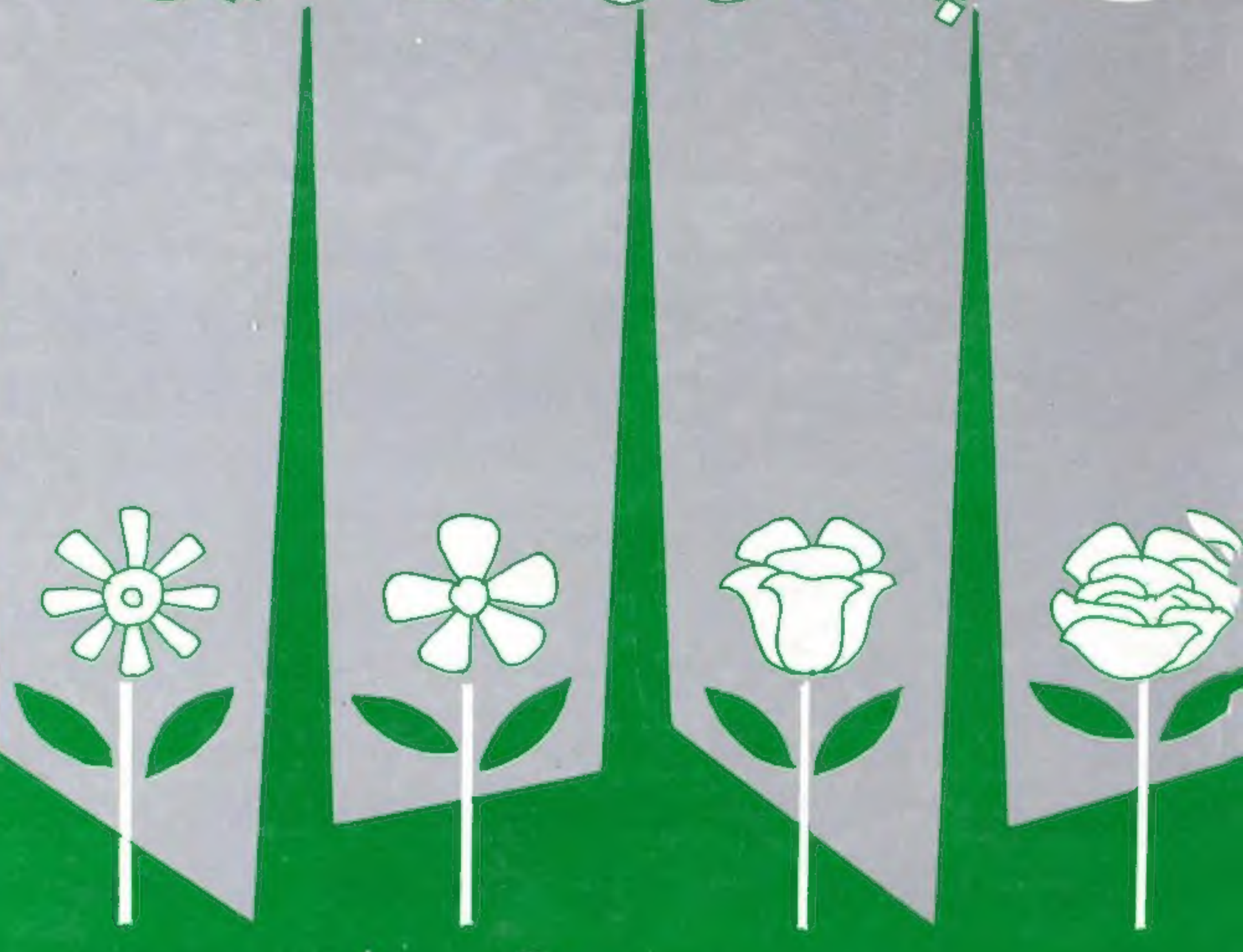
پاکستان کی لوک داستانیں



شفیع عقیل

مقتدرہ قومی زبان
پاکستان

پاکستان کی لوک داستانیں

شفیع عقیل

مقتدرہ قومی زبان
پاکستان

سلسلہ مطبوعات: ۳۳۵

عالمی معیاری کتاب نمبر: X - ۱۸۴ - ۴۷۴ - ۹۶۹ ISBN

طبع اول ـــــــــــــ ۱۹۹۷ء

تعداد ـــــــــــــ ایک ہزار

فنی تدوین ـــــــــــــ ڈاکٹر انعام الحق جاوید

پروف خوانی ـــــــــــــ نور محمد خاور

سرورق ـــــــــــــ آذر زوبی

اہتمام ـــــــــــــ اجمل وجیہہ

مطبع ـــــــــــــ ایس ٹی پرنٹرز، گوالمنڈی، راولپنڈی

ناشر ـــــــــــــ افتخار عارف

صدر نشین

مقتدرہ قومی زبان، پطرس بخاری روڈ،

ایچ ۸/۴، اسلام آباد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

پیش لفظ

مقتدرہ قومی زبان، اردو کے فروغ و اشاعت کے ساتھ ساتھ پاکستان کی دیگر زبانوں کو اجاگر کرنے میں بھی کوشاں ہے۔ اس سلسلے میں اب تک جو علمی کام سامنے آئے ہیں ان میں پنجابی زبان و ادب کی مختصر تاریخ، بلوچی زبان و ادب کی مختصر تاریخ، پشتو ادب کی مختصر تاریخ، کشمیری زبان و ادب کی مختصر تاریخ اور سندھی زبان و ادب کی مختصر تاریخ (زیرِ طبع) قابل ذکر ہیں۔ زیرِ نظر کتاب "پاکستان کی لوک داستانیں" اس زمرے کا ایک اور اہم کام ہے جس میں پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کی چار چار عوامی داستانوں کا علمی اور تحقیقی تجزیہ کیا گیا ہے۔ پاکستان کی یہ لوک داستانیں ایسے سولہ عوامی کرداروں سے متعلق ہیں جو آج بھی ان خطوں کے عوام کے دلوں میں آباد ہیں۔ ان داستانوں کے کردار علامتوں اور استعاروں کی شکل میں ہماری تہذیب و ثقافت کے حوالے سے جانے پہچانے ہیں۔ کتاب کے مصنف جناب شفیع عقیل کا نام پاکستانی ثقافت کے حوالے سے محتاج تعارف نہیں۔ انھوں نے پاکستانی زبانوں کے ادبیات کو قومی زبان میں منتقل کرنے میں متعدد کارنامے انجام دیے ہیں اور بالخصوص پنجاب کے صوفیانہ ادب کو قومی سطح پر روشناس کرانے میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ یقین ہے کہ پاکستان کے پچاس سالہ قومی جشن کے موقع پر "پاکستان کی لوک داستانیں" کی اشاعت قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگی۔

ـــــــــ افتخار عارف

فہرست

چند باتیں

اس کتاب کے بارے میں مجھے کئی ایک باتیں کہنی ہیں۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ ہمارے ہاں اکثر ادیب اور نقاد لوک کہانی کا جو مفہوم لے رہے ہیں وہ درست نہیں ہے۔ ہر مقبول یا عوامی قصّے کو لوک کہانی کہہ دیا جاتا ہے اور یہ روش اتنی عام ہو گئی ہے کہ اب غلط اور صحیح میں امتیاز ہی باقی نہیں رہا حالانکہ اس موضوع پر بعض ممالک میں باقاعدہ تحقیق و تلاش ہوئی ہے۔ لوک کہانی کسے کہتے ہیں۔؟ اس کی تعریف کیا ہے۔؟ ادب میں اس کی حیثیت کیا ہے۔؟ سماج سے اس کا رشتہ کتنا ہے۔؟ وہ ہماری زندگی کا ساتھ کہاں تک دیتی ہے۔؟ اس کی علامات اور استعارے کیا کیا روپ اختیار کرتے ہیں۔؟ پھر یہ کہ وہ تاریخ کا کتنا سفر طے کر کے ہم تک پہنچی ہے۔؟ اور مختلف ملکوں کی لوک کہانیوں میں جو اکثر باتیں مشترک ملتی ہیں ان کی وجوہ کیا ہیں۔؟ ان تمام سوالات پر میں اپنی لوک کہانیوں کی کتابوں میں اظہار خیال کر چکا ہوں۔ خاص طور پر میری کتاب "پنجابی لوک داستانیں" میں ان موضوعات پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے جس کو یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن بعض ایسے پہلوؤں کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے جن کا تعلق اس کتاب سے ہے۔ مغرب کی بعض یونیورسٹیوں اور ثقافت کے تحقیقی اداروں نے لوک ادب (FOLK LORE) پر جو تحقیق کی ہے، اس میں انھوں نے ان کہانیوں یا داستانوں کی باقاعدہ درجہ بندی کی ہے چنانچہ مقبول کہانی یا عوامی کہانی (POPULAR STORY) کو کئی اقسام میں ترتیب دیا گیا ہے تاکہ ان میں تخصیص کی جا سکے۔ چند ایک درج ذیل ہیں۔

لوک کہانی (FOLK TALE)

جس میں خیالی اور تصوراتی قصے بیان کیے گئے ہوں۔ یہ کسی ایک آدمی کی تخلیق نہیں ہوتی بلکہ نسل در نسل سفر کرتے ہوئے ہم تک پہنچتی ہے اور اس میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ اور کمی ہوتی رہتی ہے اسی لیے ایک ہی کہانی کے مختلف روپ ملتے ہیں۔

جانوروں کی کہانی (FABLE)

ایسی کہانیاں جانوروں سے متعلق ہوتی ہیں اور ان میں درندے، چرندے، پرندے اور رینگنے والے ہر طرح کے سب جانور آجاتے ہیں جو انسانوں کی طرح نہ صرف باتیں کرتے ہیں بلکہ انھی کی طرح کردار بھی ادا کرتے ہیں۔ یہ تخصیص ڈاکٹر جانسن (JHONSON) نے کی تھی۔

بھوت پریت کی کہانی (GHOST STORY)

اس قسم کی کہانیوں میں جنوں، بھوتوں، ڈائنوں اور چڑیلوں وغیرہ کے قصے بیان کیے جاتے ہیں لیکن ان کے ساتھ ساتھ انسانی کردار بھی موجود ہوتے ہیں۔ بھوت پریت کی ان کہانیوں میں بعض اوقات قوموں کے اعتقادات کی جھلک بھی آجاتی ہے۔

پریوں کی کہانی (FAIRY TALE)

ان کہانیوں میں ان دیکھی اور خیالی دنیا میں رہنے والی پریوں کے قصے ہوتے ہیں۔ پریوں کا ذکر آئے گا تو ظاہر ہے ان کے ساتھ دیووں کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ یہ دیو پریاں عام طور پر کہانی کے کرداروں کی مہماتی زندگی کا حصہ ہوتے ہیں۔

رزمیہ کہانی (EPIC)

اس درجے میں شمار ہونے والی کہانی میں بہادری اور مہم جوئی کے کارنامے اور جنگ و

جدل کے واقعات ہوتے ہیں اور ان کا تعلق کسی نہ کسی طرح کسی قوم یا ملک کی تاریخ سے ہوتا ہے لیکن یہ تاریخ آہستہ آہستہ حقائق سے دور ہو کر افسانے کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔

دیومالائی کہانی (MYTH)

اس نوع کی کہانیوں میں دیویوں اور دیوتاؤں کے قصے ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق براہ راست مذہبی اعتقادات سے ہوتا ہے۔ جن قوموں کے مذہب یا عقیدے میں دیومالائی تصورات و خیالات کا عمل دخل ہوتا ہے، یہ کہانیاں ان میں بہت مقبول و مشہور ہوتی ہیں۔

نیم تاریخی داستان (LEGEND)

نیم تاریخی داستان یا نیم تاریخی روایت میں کسی قوم یا کسی خطے کی ایسی کہانیاں آتی ہیں جن کی بنیاد تو تاریخ کے واقعات پر ہوتی ہے لیکن یہ باقاعدہ تاریخ نہیں ہوتی اور نہ ہی ان کی تاریخی حیثیت سے انکار کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ روایت کا حصہ ہوتی ہیں۔

مقبول یا عوامی داستانوں کی یہ آخری قسم ہی میری کتاب کا موضوع ہے۔ میں نے پاکستان کے چاروں صوبوں کی جو مقبول داستانیں تحریر کی ہیں، یہ ایسی ہیں جو باقاعدہ تاریخ کے حقائق تو نہیں ہیں مگر کوئی ان کی تاریخی حیثیت سے انکار بھی نہیں کر سکتا کیونکہ یہ اس خطے کی تاریخی روایات کا حصہ بن چکی ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینکا (-ENCYCLOP AEDIA BRITANNICA) میں لوک کہانی اور مقبول کہانی (-FOLK TALE AND POP ULAR STORY) کے متعلق لکھا گیا ہے کہ۔

"نیم تاریخی داستانوں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ تاریخ کی مسخ شدہ شکل ہے۔ ان کی اصل تو ضرور کوئی تاریخی حقیقت ہوتی ہے لیکن دیومالائی استفادے سے ان میں حالات کی مناسبت سے کمی بیشی کر دی جاتی ہے۔"

میں نے اس کتاب میں جو مقبول داستانیں تحریر کی ہیں ان کے مختلف روپ مروج ہیں۔ اگرچہ بنیادی طور پر واقعات اور کردار وہی ہیں مگر پھر بھی ان میں خاصا فرق دیکھنے میں

آتا ہے۔ ایک ہی داستان مختلف لوگ، مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں اور جب بیان کرتے ہیں تو اکثر اوقات اپنی مرضی اور پسند سے ان میں تبدیلی کر لیتے ہیں۔ اس مشکل کو دور کرنے کے لیے میں نے ان تمام دستیاب کتابوں کا مطالعہ کیا، جو ان کے بارے میں ہیں۔ اس کے بعد جو بہتر اور زیادہ مقبول و مروج صورت نظر آئی اسے تحریر کیا ہے۔ جب میں نے کتاب شروع کی تو ارادہ تھا کہ پاکستان کی تمام لوک داستانیں تحریر کروں لیکن اندازہ ہوا کہ اگر چاروں صوبوں کی ساری کہانیاں لی جائیں تو ان کے لیے کئی جلدیں درکار ہوں گی اور پھر یہ ایک آدمی کے بس کی بات بھی نہیں ہے۔ میں نے پنجاب کی لوک کہانیاں تحریر کی تھیں جو دو جلدوں میں چھپی ہیں اور ابھی میرے پاس اتنی کہانیاں موجود ہیں کہ مزید دو جلدیں مرتب ہو جائیں۔ یہی کچھ دیکھتے ہوئے میں نے نیم تاریخی داستانوں کا انتخاب کیا اور چونکہ ان کی تعداد بھی کم نہ تھی اس لیے ان میں سے بھی ہر صوبے کی صرف ایسی چار چار داستانوں کو لے لیا جو زیادہ مشہور و مقبول ہیں اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ باقی داستانیں مشہور یا مقبول نہیں ہیں۔ مراد صرف اتنی تھی کہ نمائندہ داستانوں کو شامل کر لیا جائے۔ میں نے جن لوک داستانوں کو تحریر کیا ہے، ان کا کوئی نہ کوئی تاریخی حوالہ ملتا ہے جس سے اس کا زمانہ متعین کرنے میں مدد ملتی ہے اسی لیے داستان کے شروع میں تاریخ کے عہد کے بارے میں اشارہ کر دیا گیا ہے۔ یہاں یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ میں نے سسی پنوں کی داستان کا وہ روپ لیا ہے جو سندھ میں رائج ہے کیونکہ اس کا تعلق سندھ ہی سے ہے۔

ان داستانوں کے بارے میں مجھے یہ بھی بتانا ہے کہ عام طور پر یہ لوک داستانیں بیانیہ انداز میں ملتی ہیں اور پوری کہانی دو تین صفحات ہی میں بیان کر دی جاتی ہے۔ اس اختصار کی وجہ سے اکثر داستانوں میں حالات اور واقعات کا تسلسل برقرار نہیں رہتا۔ میں نے اس ضمن میں تھوڑا سا اجتہاد کیا ہے اور وہ اس طرح کہ ان کو کہانی یا افسانے کے روپ میں تحریر کیا ہے۔ مشہور مستشرق رچرڈ ٹمپل (RICHARD TAMPLE) نے اپنی معروف کتاب "لیجنڈز آف دی پنجاب" (LEGEND'S OF THE PUNJAB) میں ایک جگہ لوک کہانیوں پر اظہار

خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"کوئی وجہ نہیں کہ انھیں ادبی لحاظ سے تاحد امکان دلچسپ نہ بنایا جائے بشرطیکہ ان کی صحت میں فرق نہ آئے۔"

میں نے اسی مقولے پر عمل کیا ہے۔ ان داستانوں کے کردار' واقعات' مقامات' حالات' غرض ہر چیز اصل کے مطابق ہے۔ میں نے کسی داستان کے پلاٹ اور اس کے تانے بانے میں فرق نہیں آنے دیا البتہ مکالموں میں اجتہاد کیا ہے۔ کہانی کا ماحول' اس ماحول کے رسم و رواج' کرداروں کی حرکات و سکنات' احساسات و جذبات اور نفسیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے بیشتر جگہوں پر مکالمے تحریر کیے ہیں تاکہ دل کشی کے ساتھ ساتھ داستان میں روانی قائم رہے۔ یہ بات اس لیے بھی ضروری تھی کہ بیانیہ ہونے کی وجہ سے اکثر داستانوں میں اس تسلسل کا فقدان ہوتا ہے جو داستان گوئی یا داستان نگاری کے لیے لازمی ہے۔ میں نے مکالموں سے یہ تسلسل ٹوٹنے نہیں دیا اور داستان کی دلچسپی بھی برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ظاہر ہے' اس کے لیے مجھے افسانوی انداز کی زبان اور بیان اختیار کرنا پڑا اور بعض اوقات ماحول کی عکاسی یا منظر نگاری کی خاطر لفاظی کا بھی سہارا لیا تاکہ داستان کا تاثر گہرا ہو جائے اور قاری کے لیے اس میں دلکشی پیدا ہو جائے۔

یہ لوک داستانیں زیادہ تر شعراء کے توسط سے ہم تک پہنچی ہیں اور ہر شاعر نے اپنے اپنے انداز میں زور بیان دکھایا ہے اور منظر کشی کی ہے اس سلسلے میں بلوچی داستانوں کو یہ انفرادیت حاصل ہے کہ جن شاعروں نے انھیں نظم کیا ہے' وہ خود ہی ان کہانیوں کے کردار ہیں لہٰذا میں نے ان کے بعض اشعار کو بھی داستان کے متن کا حصہ بنایا ہے۔ مزید یہ کہ میں نے تمام داستانوں کی طوالت قریب قریب ایک سی کی ہے اور اس عمل کے لیے بھی مکالموں اور اشعار کے مفہوم سے مدد لی ہے۔

یوں تو دنیا بھر کی داستانوں میں بہت سی باتیں مشترک ملتی ہیں' یہاں تک کہ پنجاب کی ہیر رانجھا کی داستان سے ملتی جلتی کہانی یونان میں بھی موجود ہے لیکن اس وقت میرا یہ موضوع

نہیں ہے' اس کے باوجود اگر پیشِ نظر کتاب میں شامل داستانوں کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں بھی بہت سی باتیں مشترک ملیں گی۔ ایک بات تو یہی ہے کہ تمام داستانوں کے ہیرو خوبصورت ترین افراد ہیں اور ساری کی ساری ہیروئنیں حسین و جمیل ہیں، اور حسین و جمیل بھی ایسی جن کا کوئی ثانی ہی نہیں۔ پھر یہ کہ اکثر داستانوں میں ہیروئن کی منگنی اس کے چچا زاد ہی سے ہوتی ہے کسی دوسرے سے نہیں۔ اسی طرح کئی داستانیں ایسی ہیں جن میں ماں باپ اولاد سے محروم ہوتے ہیں اور اس کے لیے پیروں فقیروں کے پاس جاتے ہیں اور پھر کسی بزرگ کے تبرک عطا کرنے یا کھلانے سے ان کی امید بر آتی ہے۔ یہ سب کچھ لوگوں کی پیر پرستی یا عمومی اعتقادات کا حصہ ہیں جو آج بھی ہمارے معاشرے میں موجود ہیں۔ بچے کی پیدائش پر جوتشیوں سے اس کے مستقبل کے بارے میں دریافت کرنا بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ اس کے علاوہ ان داستانوں میں بعض باتیں ایسی ہیں جو ہندومت یا ہندو دیومالا کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔ ان میں کسی گورو کا چیلا بن کر مقصد کے حصول کے لیے جوگ لے کر جوگی بننا' بانسری کی آواز پر مویشیوں کا مست ہو جانا' جوگی بن کر ہیروئن کے پاس جانا اور اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی خاطر کھولتے تیل کے کڑھاؤ میں ہاتھ ڈالنا اور جلتی آگ میں سے گزرنا شامل ہیں۔ ان کہانیوں میں بہت سی خارق عادت یا فوق الفطرت باتیں اور واقعات بھی ملتے ہیں۔ قبر کا شق ہو جانا اور ہیرو ہیروئن کا اس میں ایک ساتھ سما جانا' کٹے ہوئے ہاتھ پاؤں کے باوجود بارہ برس تک اندھے کنوئیں میں زندہ رہنا اور پھر کسی گورو کی دعا سے پلک جھپکتے میں صحیح سالم باہر آ جانا' یا پھر سوکھے باغ میں گورو کے جاتے ہی اس کا ہرا بھرا ہو کر پھلوں پھولوں سے بھر جانا' یا سسی کا پیدا ہوتے ہی صندوق میں بند دریا برد ہونا اور دریا میں اتنا لمبا سفر طے کرنے کے باوجود زندہ رہنا' یہ سب ان ہونی باتیں ہیں۔ اگر آپ ان داستانوں کا بغور جائزہ لیں تو اس کے علاوہ بھی بہت سی خارق عادت باتیں اور فوق الفطرت واقعات ملیں گے۔

یہ بات بھی ظاہر ہے کہ یہ کتاب تصنیف کے ذیل میں نہیں آتی کیونکہ یہ داستانیں مختلف شکلوں میں پہلے سے موجود ہیں لیکن یہ تالیف بھی نہیں ہے اس لیے کہ میں نے انھیں

محض مرتب ہی نہیں کیا بلکہ اپنے اسلوب میں از سرنو تحریر کیا ہے۔ اس قسم کی ادبی تحریروں کے لیے انگریزی زبان میں RETOLD کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ آپ نے پڑھا ہو گا کہ انگریزی میں لوک کہانیوں اور لوک داستانوں کی جو کتابیں ملتی ہیں ان پر "RETOLD BY" لکھا جاتا ہے کیونکہ ہر لکھنے والا اپنے انداز اور اپنے اسلوب میں اسے از سرنو لکھتا ہے اردو میں مجھے اس کے لیے کوئی ایک لفظ نہیں ملا البتہ فارسی زبان میں باز نویسی اور بازنوشتِ کے الفاظ موجود ہیں چنانچہ میں نے فارسی لوک کہانیوں کی جو کتاب لکھی تھی اس پر باز نویسی ہی تحریر کیا تھا۔

آخری بات صرف یہ ہے کہ اس کتاب کا خیال برادرم افتخار عارف کا تھا' میں نے انھی کے کہنے پر یہ لکھی ہے۔ یہ کیسی ہے۔؟ اس سلسلے میں مجھے کچھ نہیں کہنا کیونکہ یہ مسئلہ میرا نہیں قارئین کا ہے۔ وہی بہتر رائے دے سکتے ہیں۔

شفیع عقیل ـــــــ

پنجاب

ہیر رانجھا

پنجاب میں صدیوں سے دریائے چناب بہہ رہا ہے اور اس کی تند و تیز لہریں صدیوں سے حسن و عشق کی کئی داستانیں بیان کررہی ہیں۔ ان داستانوں میں ایک ہیر رانجھا کی کہانی بھی ہے جو ہندوستان میں مغلوں کی آمد سے کچھ ہی عرصہ پہلے واقع ہوئی تھی۔بعض محققین کا کہنا ہے کہ اس داستان کا تعلق بہلول لودھی کے دور سے ہے۔ لیکن یہ آج بھی اس ذوق و شوق سے سنی سنائی جاتی ہے جیسے کل ہی کی بات ہو۔ اس عشقیہ داستان کا تعلق جھنگ شہر سے ہے، جو دریائے چناب سے کچھ فاصلے پر آج بھی شاد و آباد ہے۔ ہو سکتا ہے ماضی میں یہ دریا اس کے قریب سے ہی گزرتا ہو کیونکہ دریاؤں کا اپنا راستہ تبدیل کرنا تاریخ کا حصہ ہے۔کہا جاتا ہے کہ یہ شہر کسی زمانے میں ایک قصبہ تھا جہاں سیال قوم کے لوگ آباد تھے۔ جن کا سردار مہر چوچک تھا جو اس قصبے کا چودھری تھا اور اس کہانی کی ہیروئین اسی کی لاڈلی بیٹی تھی جو آج بھی ان گنت دھڑکتے دلوں میں زندہ ہے۔ سیالوں کے اسی جھنگ میں ہیر اور اور رانجھے کی عشق کی داستان کا آغاز ہوا یہیں پر ان کی محبت پروان چڑھی۔ اور پھر یہیں پر اس کا المیہ انجام بھی ہوا۔ تاہم اس داستان کی ابتدا ضلع سرگودھا کے علاقہ سے ہوئی۔ تخت ہزارہ ضلع

سرگودھا میں واقع ایک قصبہ تھا جس کا چودھری یا مُکھیا معظم تھا۔ جو موجو چودھری کے نام سے معروف و مشہور تھا۔ یہ ایک بڑا زمیندار اور معزز شخصیت کا مالک تھا جو ذات کا رانجھا جاٹ تھا۔ اس کے آٹھ بیٹے تھے جن میں سب سے چھوٹا دھیدو تھا۔ جو تاریخ میں ذات کے حوالے سے رانجھا کے نام سے جانا جاتا ہے۔ رانجھے کے تمام بھائی شادی شدہ تھے۔ لیکن یہ ابھی کنوارا تھا۔ ایک تو یہ کہ ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی تھی' پھر یہ کہ باپ کے بڑھاپے کی اولاد تھی اور اس پر مزید یہ کہ اپنے بھائیوں میں چھوٹا ہونے کے علاوہ انتہائی خوبصورت بھی تھا۔ اس لیے موجو چودھری اس کو بہت چاہتا تھا۔ اس کی پرورش بڑے لاڈ پیار میں ہوئی تھی۔

اسی وجہ سے وہ اپنے بھائیوں کی طرح کھیتی باڑی کے کام کاج میں بالکل دلچسپی نہ لیتا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس نے کھیتی باڑی کا کام سیکھا ہی نہ تھا۔ وہ نہ ہل چلانا جانتا تھا اور نہ بوائی کٹائی کے طریقوں سے واقف تھا۔ بس اسے تو ایک ہی کام آتا تھا کہ ہر وقت بانسری بجانے میں مست رہتا تھا۔ اسے بانسری بجانے میں اس قدر مہارت حاصل ہو گئی تھی' جو بھی اس کی بانسری کے نغمے سنتا' سر دھنتا رہ جاتا۔ دن بھر ادھر ادھر گھومتا رہتا تھا اور بانسری سے اپنے ساتھ لوگوں کے دل بھی بہلاتا۔ اگرچہ اس کے بھائی اسے بہت چاہتے تھے اور اس کا ہر طرح سے خیال بھی رکھتے تھے لیکن ان کی یہ خواہش ضرور تھی کہ وہ بھی کھیتی باڑی کے کام میں حصہ لے اور زمینوں کی دیکھ بھال کرے اسی لیے وہ ایک دوسرے سے کہتے۔

''ہم سارا دن کاشت کاری میں لگے رہتے ہیں اور اس کو بانسری بجانے کے سوا دوسرا کوئی کام ہی نہیں۔!''

جب تک باپ زندہ رہا بھائیوں اور بھابیوں کا زیادہ بس نہ چلا لیکن جونہی موجو چودھری کی آنکھیں بند ہوئیں' ان کی زبانوں کے جیسے تالے کھل گئے۔ وہ اس سے کہنے لگے۔

''تم نے بہت حرام کی کھالی۔۔۔اب ہمارے ساتھ کھیتوں میں برابر کا کام کرنا ہو گا''۔

بھابیاں تو اور بھی بڑھ بڑھ کے باتیں بنانے لگیں۔ حالانکہ وہ اپنے چھوٹے دیور سے پیار بھی کرتی تھیں لیکن پھر بھی انھوں نے کہا۔

"یہ گھر بیٹھا مفت کی روٹیاں توڑتا رہتا ہے۔ اب یہ بھی محنت کر کے کھائے۔"
شروع شروع میں تو وہ یہ باتیں سمجھانے بجھانے کے انداز میں کہتے تھے مگر آہستہ آہستہ ان کا لہجہ بدلتا گیا اور بات طعنوں تشنوں تک پہنچ گئی۔ اس کے ساتھ ہی بھائیوں نے یہ کیا کہ گاؤں کے چند بڑوں کو بلا کر زمین کا بٹوارا کر لیا اور وہ اس طرح کیا کہ اچھی، ہموار اور زرخیز زمین اپنے اپنے حصے میں بانٹ لی اور بنجر، شور اور ٹیلوں والی دھیدو کو دے دی۔ اب تو ظاہر ہے اسے کام کرنا ہی تھا، اس نے ہمت کی اور زمینوں پر کام شروع کر دیا لیکن وہ نازوں میں پلا ہوا تھا، اس کے نرم و نازک ہاتھ پاؤں یہ محنت اور مشقت برداشت نہ کر سکے۔ کھیتوں میں ہل چلانے، ڈھور ڈنگروں کو سنبھالنے اور کھیتی باڑی کا دوسرا کام کرنے سے اس کے ہاتھ پاؤں میں چھالے پڑ گئے اور پاؤں سوج گئے۔ ایک طرف تو یہ تھا اور دوسری جانب بھائیوں کی گھرکیاں اور تلخ ترش باتیں الگ تھیں۔ اس کے علاوہ بھابیوں کے روز روز کے طعنے تشنے اس کی برداشت سے باہر ہوتے جا رہے تھے۔ وہ روز بروز لاچار ہوتا چلا جا رہا تھا۔ آخر ایک وقت ایسا آیا جب اس کے صبر و تحمل کا پیمانہ چھلک گیا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔
"تخت ہزارہ سے میرا دانہ پانی اٹھ گیا ہے۔ اب یہاں رہنا میرے بس میں نہیں رہا۔"
اس وقت وہ جوان اور خوبصورت گبھرو تھا جس کی خوبصورتی پورے تخت ہزارے میں مشہور تھی۔ ادھر جھنگ سیال کی ہیر کے حسن کا چرچا قریب و دور تک پھیلا ہوا تھا اور رانجھے نے بھی اس کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ ایک روز بھابیوں نے اسے طعنہ دیتے ہوئے کہا۔
"بات تو جب ہے کہ تم سیالوں کی ہیر کو بیاہ کر لاؤ!"
بھابیوں کا یہ طعنہ رانجھے کے دل میں بیٹھ گیا تھا۔ آخر وہ گھڑی بھی آ پہنچی جب اس کا دل تخت ہزارے سے بالکل اچاٹ ہو گیا۔ اس نے اپنی محبوب بانسری ہاتھ میں پکڑی، کمبل کاندھے پر ڈالا، گھر پر الوداعی نظریں ڈالیں اور اللہ کا نام لیکر چل کھڑا ہوا۔ اس کی بھرپور جوانی اور اس پر گردن تک سر کے پٹے لہرا لہرا کر اسے اور بھی حسین بنا رہے تھے۔ وطن سے جدائی کے ان لمحوں میں اس کا ایک ہی ساتھی تھا اور وہ تھی اس کی بانسری۔۔ اس نے بانسری کو لبوں سے

لگایا اور تانیں اڑاتا ہوا قصبے سے نکل گیا۔ اس کی نہ تو کوئی منزل طے تھی اور نہ ہی راستہ متعین تھا کہ اسے کہاں اور کدھر جانا ہے۔؟ وہ اداس اداس دھیمے قدم اٹھاتا ہوا تخت ہزارے سے باہر آیا اور وہاں سے جنوب کی طرف سفر شروع کر دیا۔

چلتے چلتے جب اسے زیادہ تھکاوٹ ہو جاتی تو وہ تھوڑی دیر کے لیے کہیں کسی درخت کی چھاؤں میں دو گھڑیاں بیٹھ کر ستا لیتا' چند لمحے بانسری کی سریلی تانوں سے جی بہلاتا اور پھر آگے چل دیتا۔ اس طرح سفر کرتے کرتے اسے رات ہو گئی۔ راستے میں قریب ہی ایک گاؤں دکھائی دیا تو اپنے آپ سے کہنے لگا۔

”کیوں نہ اس گاؤں میں رات بسر کر لی جائے۔ صبح آگے چلوں گا۔“

یہی سوچ کر گاؤں کی مسجد میں گیا اور رات بسر کرنے کی غرض سے وہاں بیٹھ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک آدھ دن وہاں ٹھہر کر آرام کر لے اور پھر آگے کا سفر شروع کرے لیکن اتفاق سے مسجد کے مولوی سے پہلی ہی رات اس کی تو تو میں میں ہو گئی۔ اس پر دوسری مصیبت یہ آئی کہ صبح جب گاؤں کی لڑکیاں مسجد کے کنویں سے پانی بھرنے کے لیے آئیں تو انھوں نے رانجھے کو دیکھ لیا اور اس کا حسن و جوانی دیکھ کر اس پر فریفتہ ہونے لگیں۔ ایک لڑکی تو اس قدر دیوانہ وار اس پر فدا ہو گئی کہ اس نے گھر جا کر اپنی ماں سے کہا۔

”اگر میں شادی کروں گی تو صرف اسی اجنبی نوجوان سے کروں گی۔“

بیٹی کی یہ حالت دیکھ کر اس کی ماں رانجھے کے پاس آئی اور اسے اپنی بیٹی سے شادی کرنے کے لیے کہا مگر وہ تو کسی اور دنیا کے سفر پر جا رہا تھا۔ ایک ان دیکھی دنیا کے سفر پر۔۔ اس نے انکار کر دیا' عورت تو چلی گئی لیکن رانجھا دل میں سوچنے لگا۔

”یہاں رہا تو یقیناً کسی نہ کسی مشکل سے دوچار ہو جاؤں گا۔“

چنانچہ وہ بڑی خاموشی سے چھپتا چھپاتا اس گاؤں سے آگے کی طرف چل دیا اور چلتا چلاتا دریائے چناب کے کنارے ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں گھاٹ تھا اور وہاں سے لوگ کشتی پر دریا پار کرتے تھے۔ رانجھا وہاں پہنچ کر بیٹھ گیا اور ستانے لگا۔ وہاں سے دریا کے دوسری

جانب چھوٹے بڑے مکانات اور مسجدوں کے مینار اور مندروں کے کلس نظر آرہے تھے۔ یہی جھنگ شہر تھا، ہیر کا شہر اور رانجھے کی منزل۔۔ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد اس نے بانسری منہ سے لگائی اور کوئی راگ چھیڑ دیا۔ ایک تو بانسری کی سریلی آواز اور پھر راگ کی دلکشی ایسی تھی کہ درختوں پر بیٹھے ہوئے پنچھی بھی مست ہو گئے۔ اتنے میں ایک کشتی کنارے کی طرف آتی دکھائی دی، کشتی میں سوار لوگوں نے بھی رانجھے کی سریلی بانسری سن لی تھی اور وہ جیسے مست ہو کر اس کی طرف کھنچے چلے آئے تھے۔ کشتی وہاں آکر رکی اور اس میں سے دیگر مسافروں کے علاوہ پانچ پیر بھی کنارے پر اترے۔ ان پانچوں پیروں نے خوش ہو کر رانجھے کو چوچک کی بیٹی ہیر بخش دی۔ کشتی خالی ہو گئی اور دوسری طرف جانے کے لیے دوبارہ لوگ اس میں سوار ہونے لگے۔ اس کشتی کے ملاح کا نام لڈن تھا۔ رانجھے نے اس سے کہا۔

"مجھے بھی دریا پار جانا ہے؟"

اس پر ملاح بولا۔

"کرایہ نکالو۔۔۔؟"

مگر رانجھے کے پاس پیسے کہاں تھے۔ اس نے جواب دیا۔

"میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔۔ اگر تم نہیں لے جاتے تو نہ لے جاؤ، میں تیر کے دریا پار کر لوں گا۔"

یہ سن کر مسافروں نے لڈن کو سمجھایا کہ بیچارے کو لے چلو تمہارا کیا نقصان ہے۔ لڈن کو بھی شاید اس کی حالت اور جوانی پر رحم آگیا تھا، اس نے رانجھے کو کشتی میں بٹھا لیا۔ پھر جیسے ہی کشتی دریا کی لہروں پر کھینے لگی، اس کے ساتھ ہی رانجھے نے بانسری پر ایسی سریلی تانیں چھیڑیں کہ ایک سماں بندھ گیا۔ جو لوگ کشتی میں سوار تھے وہ اس قدر محو ہو گئے تھے کہ انھیں پتا بھی نہ چلا، کب دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ لڈن بھی اس سے بہت خوش تھا۔ اس کشتی میں ایک رنگین پلنگ بچھا ہوا تھا، جب سب مسافر اتر گئے تو رانجھے نے لڈن سے پوچھا۔

"یہ پلنگ کس کا ہے۔؟"

جواب میں لڈن نے بتایا۔
"یہ مہر چوچک کی لاڈلی بیٹی ہیر کا پلنگ ہے اور یہ کشتی بھی اسی کی ہے۔ وہ کبھی کبھی اس میں بیٹھ کر دریا کی سیر کرتی ہے۔"
رانجھا سفر سے تھکا ہوا تھا پھر اس کی کوئی مخصوص منزل تو تھی نہیں، اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ بانسری سن کر ملاح لڈن اس پر مہربان ہو چکا تھا۔ لہٰذا سوچا۔
"کیوں نہ کچھ دیر اس پلنگ پر آرام کر لوں۔؟"
یہی سوچ کر اس نے لڈن سے منت سماجت کے لہجے میں کہا۔
"اگر تم اجازت دو تو میں تھوڑی دیر کے لیے اس پلنگ پر لیٹ جاؤں۔ بہت زیادہ تھکا ہوا ہوں ۔۔؟"
اگرچہ لڈن یہ جانتا تھا کہ اگر اچانک ہیر آگئی تو وہ بہت ناراض ہوگی اور وہ اس کے غصے سے بھی اچھی طرح واقف تھا لیکن اس کے باوجود اس نے رانجھے کو اجازت دے دی اور رانجھا پلنگ پر لیٹ گیا۔ پیدل سفر کر کے تھکا ہوا تو تھا ہی، لیٹتے ہی گہری نیند سو گیا اور لڈن بھی کشتی کھڑی کر کے اپنے دوسرے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ اسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ ہیر کسی بھی وقت آسکتی ہے۔ اور ہوا بھی یہی کہ ہیر اپنی سہیلیوں کے ساتھ دریا پر آگئی اور اس نے جب کشتی میں بچھے اپنے پلنگ پر کسی کو سوتے ہوئے دیکھا تو غصے میں تلملا کر لڈن پر برس پڑی۔
"یہ تم نے میرے پلنگ پر کس کو سلا دیا ہے۔؟ تمھاری یہ جرأت کیسے ہوئی۔؟"
اس وقت ہیر اور اس کی سہیلیوں نے ہاتھوں میں شیشم کی چھڑیاں پکڑ رکھی تھیں، انھوں نے لڈن کی چھڑیوں سے پٹائی کی اور پھر ہیر اپنے پلنگ کی طرف بڑھی جس پر رانجھا بے خبر سویا ہوا تھا۔ اتنے میں شور سن کر رانجھا جاگ گیا۔ ہیر نے چمک کر اس سے پوچھا۔
"تم کون ہو اور تمھیں میرے پلنگ پر لیٹنے کی ہمت کیسے ہوئی ۔۔؟"
آگے سے رانجھے نے سر اٹھایا۔ حسین گبھرو جوان، شانوں پر جھولتے ہوئے سیاہ پٹے، چہرے پر سرخی اور لبوں پر پیار بھری مسکراہٹ۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"میں ایک تھکاہارا مسافر ہوں - پل دو پل کے لیے پلنگ پر لیٹ گیا - واقعی مجھ سے غلطی ہوئی"۔

مگر اب اس کے لیے اس غلطی کی معافی مانگنا ضروری نہیں رہی تھی کیونکہ ہیر اس کے حسن و جوانی کو ایک نظر دیکھتے ہی اپنا آپ ہار چکی تھی۔ ایک وہی کیا رانجھا بھی اپنے عشق کی منزل پر پہنچ چکا تھا۔ دونوں بھرپور شباب کے عالم میں تھے اور دونوں کا حسن ایک دوسرے کی نگاہوں کا مرکز بن گیا تھا۔ ہیر نے آہستہ سے پوچھا۔

"تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو اور کہاں جانا ہے۔؟"

اب رانجھے کو کہاں جانا تھا۔؟ اسے جہاں جانا تھا، وہاں پہنچ گیا تھا۔ اور ہیر کو بھی اس کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے تمام سہیلیوں کو وہاں سے ٹالا اور خود رانجھے کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اس طرح پہلی ہی ملاقات میں دونوں ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہو گئے۔ دیر تک آپس میں بیٹھے یوں باتیں کرتے رہے، جیسے برسوں کے بچھڑے ہوئے ملے ہوں۔ جب ہیر جانے لگی تو اس نے رانجھے سے کہا۔

"میں اپنے والد سے کہوں گی کہ وہ تمھیں ڈھور ڈنگر چرانے پر ملازم رکھ لے"۔

مہر چوچک کے پاس بہت سی بھینسیں تھیں اور اسے واقعی ایک چرواہے کی ضرورت تھی۔ پھر ہیر سارے گھر کی چہیتی تھی جو اسے ملازم رکھنے کے لیے کہہ رہی تھی چنانچہ مہر چوچک نے رانجھے کو اپنے مویشی چرانے پر ملازم رکھ لیا۔ اس طرح ہیر نے اپنی ذہانت اور چالاکی سے رانجھے سے ملاقاتوں کا راستہ نکال لیا تھا۔ اب ہوتا یہ کہ رانجھا ہر روز بھینسیں چرانے چناب کے کنارے بیلے یعنی جنگل میں چلا جاتا اور کسی نہ کسی بہانے سے ہیر بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ ادھر آنکلتی ۔ اور اس طرح دونوں کی ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا اور ایک وقت آیا جب وہ ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہ رہ سکتے تھے۔ ہیر چوری چھپے گھر سے چوری بنا کر لاتی اور رانجھے کو اپنے پاس بٹھا کر کھلاتی۔ وہ اپنی بانسری پر سریلے راگ چھیڑتا اور وہ اس کی تانوں میں کھو جاتی لیکن ان کے عشق کی آگ چھپی نہ رہ سکی۔ آہستہ آہستہ دونوں کے پیار کا چرچا ہونے

لگا۔ پہلے تو لوگ دبے دبے لفظوں میں ذکر کرتے تھے مگر پھر عام باتیں ہونے لگیں۔ باتیں کرنے والے ان لوگوں میں مہر چوچک کا لنگڑا بھائی کیدو سب سے آگے تھا۔ وہ ایک بدطینت انسان تھا جسے لوگوں کی برائی اور ادھر ادھر کی لگائی بجھائی کرنے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ وہ ہر وقت چونکہ دونوں کے کھوج میں لگا رہتا تھا اس لیے ایک روز اس نے دونوں کو بیلے میں ایک ساتھ بیٹھے اور باتیں کرتے دیکھ لیا۔ گھر آکر اس نے اپنے بھائی، ہیر کے باپ سے کہا۔

"ہیر اور رانجھا دونوں بیلے میں ملتے ہیں۔ ان کے لچھن ٹھیک نہیں ہیں۔"

اس قسم کی شکایت پہلے بھی چوچک کے پاس پہنچی تھی مگر اسے اس بات پر یقین نہیں آتا تھا کیونکہ اسے اپنی بیٹی پر اعتماد تھا۔ وہ اس طرح کے الزام پر توجہ دینے کے لیے تیار نہ تھا لیکن اب جب کہ اس کے بھائی کیدو نے اسے بتایا کہ اس نے دونوں کو اپنی آنکھوں سے ایک ساتھ دیکھا ہے تو وہ قدرے سوچ میں پڑ گیا اسے بھی شک ہونے لگا لیکن وہ اس کا کوئی ثبوت چاہتا تھا۔ اور جلد ہی کیدو لنگڑے نے یہ ثبوت بھی پیش کر دیا۔ ایک روز جب ہیر رانجھے کے لیے چوری لیکر گئی تو اس نے فقیر بن کے اس کا پیچھا کیا اور بیلے میں پہنچ کر ایک جگہ چھپ کر بیٹھ گیا۔ جب ہیر رانجھے کے لیے پانی لینے گئی تو کیدو فقیر کے روپ میں اس کے پاس گیا اور خیرات میں تھوڑی سی چوری مانگ کر لے آیا۔ اس کے بعد بھاگا بھاگا مہر چوچک کے پاس پہنچا اور چوری اس کے آگے رکھتے ہوئے بولا۔

"یہ رہا ثبوت۔ یہ چوری ہیر رانجھے کے لیے لے کر گئی تھی، میں اس سے خیرات میں تھوڑی سی مانگ کر لایا ہوں۔ کیا تمھیں اب بھی میری بات کا یقین نہیں۔؟"

چوچک نے چوری دیکھی تو غصے میں تلملا گیا لیکن کیا کرتا؟ بیٹی کا معاملہ تھا، قدم قدم پر بدنامی کا خوف تھا لوگ کیا کہیں گے؟ اس نے کیدو لنگڑے کے مشورے سے رانجھے کو اسی روز نوکری سے نکال دیا تاکہ اس طرح دونوں کی ملاقاتوں کا سلسلہ ختم ہو جائے لیکن ایک مصیبت یہ آ پڑی کہ مہر چوچک کی بھینسیں رانجھے کی بانسری کی آواز کی عادی ہو گئی تھیں۔ وہ روزانہ بانسری بجاتے ہوئے چلتا تو بھینسیں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگتیں اور اسی طرح شام کو اس کی بانسری

کی آواز پر گھر آتی تھیں‘ اب رانجھے کے جانے کے بعد انھوں نے چارا تک کھانا چھوڑ دیا تھااور کسی کے قابو میں نہ آتی تھیں۔دوسری طرف ہیر پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔وہ نہ بولتی اور نہ کسی سے بات کرتی۔۔۔ نہ کچھ کھاتی اور نہ پیتی۔۔۔اسے ہروقت چپ سی لگی رہتی تھی۔بیٹی کی یہ حالت دیکھ کرماں سے نہ رہا گیا۔اس نے مہر چوچک سے کہا۔

”دشمن یونہی ہماری بیٹی پر تہمت لگا کر ہمیں بدنام کر رہے ہیں“۔

پھروہ شوہر کی کمزور رگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

”تمام بھینسیں بیمار ہونے لگی ہیں۔میری مانو تو رانجھے کو واپس بلوا لو‘ابھی وہ یہیں کہیں ہو گا۔ایسا بغیر تنخواہ کا نوکر تو کسی کو نہیں مل سکتا۔“

چوچک تو پہلے ہی رانجھے کو نکال کر پچھتا رہا تھا۔ادھر رانجھا بھی جھنگ سے گیا نہیں تھا۔ لہٰذا اسی روز اسے بلا کر پھر سے ملازم رکھ لیا گیا۔رانجھا پھر سے مہر چوچک کی بھینسیں چرانے لگا مگر اب ہیر کے والدین بہت چوکنا ہو گئے تھے۔وہ رانجھا اور اپنی بیٹی کی ہر حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے۔اگرچہ دوسری جانب ہیر اور رانجھا بھی بڑے محتاط رہتے تھے لیکن لنگڑا کیدو اپنی عادت سے مجبور تھااور ہر وقت ان کی ٹوہ میں لگا رہتا تھا۔مہر چوچک بھی اس کی لگائی بجھائی کی عادت سے واقف تھا اسی لیے اس کی باتوں اور چغلیوں پر زیادہ توجہ نہیں دیتا تھا مگر یہ ہیر اور رانجھا کی بدقسمتی تھی کہ ایک روز اس نے خود دونوں کو بیلے میں پیار محبت کی باتیں کرتے دیکھ لیا۔اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا تھا۔؟اب اس سے زیادہ برداشت نہ ہو سکتا تھا۔فوراً“ خاندان کے بڑے بوڑھوں کو جمع کیا گیا اور کھیڑوں کی طرف سے آئے ہوئے رشتے کو منظور کر کے‘ہیر کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ہیر کو جب اس بات کا پتہ چلا تو وہ تڑپ کر رہ گئی۔گھر میں اس کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور وہ رو رو کر دن رات گزار رہی تھی۔اس نے اپنی ماں سے صاف صاف کہہ دیا کہ۔

”میں شادی کروں گی تو صرف رانجھے سے کروں گی۔اور کسی سے نہیں!“

مگر اب اس کے کہنے سے کیا ہوتا تھا۔اب اس کے رونے دھونے کی کسی کو پرواہ نہ تھی۔اس

کا دکھ بٹانے والا ایک رانجھا تھا اور اسے بھی نوکری سے نکال دیا گیا تھا جو اس وقت نہ جانے کہاں تھا اور معلوم نہیں کس حال میں کتنا دکھی تھا۔۔؟

ضلع مظفر گڑھ میں ایک قصبہ رنگ پور تھا جہاں کھیڑوں کے ایک خاندان کا سربراہ چودھری اجو تھا۔

اور یہ لوگ جھنگ میں آباد سیال راجپوتوں کی برادری ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ سیال راجپوتوں کے آباؤ اجداد میں سے ایک رائے سیال نے حضرت بابا فرید گنج شکر کے ہاتھ پر ۱۲۵۸ء میں اسلام قبول کیا تھا اور اسی سلسلے کے ایک فرد مل خان نے ۱۴۶۲ء میں شہر جھنگ بسایا تھا۔ کھیڑا اجو چودھری بھی سیالوں کی ایک شاخ سے تھا اور اس کے بیٹے کا نام سیدا کھیڑا تھا۔ جس سے ہیر کی شادی ہو رہی تھی۔ ہیر کے والدین کی کوشش تھی کہ جلد سے جلد بیٹی کی شادی کر کے اسے رخصت کر دیا جائے۔ انھوں نے کھیڑوں سے شادی کی تاریخ بھی مقرر کر دی تھی اور کھیڑے بڑی دھوم دھام سے بارات لانے کی تیاریاں کرنے میں مصروف تھے۔ ہیر لاکھ روئی پیٹی، فریاد پکار کی، آہ و زاری کرتی رہی، واسطے دیے لیکن اب یہ سب کچھ بیکار تھا۔ شادی کی مقررہ تاریخ آگئی اور اس کے ساتھ ہی دھوم دھڑکے سے کھیڑوں کی بارات بھی آپہنچی۔ صرف مہر چوچک کے گھر میں ہی نہیں پورے قصبے میں شادی کی رسمیں ریتیں ادا ہونے لگیں۔ ہیر کے خاندان والے اس لیے خوش تھے کہ جوان بیٹی کا کاج ہو رہا ہے اور کھیڑے اس لیے خوشی میں پھولے نہیں سما رہے تھے کہ وہ ہیر جیسی خوبصورت بہو بیاہ کر لے جا رہے تھے۔ گھر میں ہر طرف شادی کی رسمیں ادا ہو رہی تھیں اور ہیر بیچاری رنج والم میں ڈوبی ہوئی تھی جس کی کوئی خبر لینے والا نہیں تھا۔ ایک ایک کر کے تمام ریتیں ادا ہو رہی تھیں اور ہیر کی مرضی کوئی نہیں پوچھ رہا تھا۔ صرف ایک وقت ایسا آیا جب اس کی پسند کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ اور یہ وقت وہ تھا جب قاضی اس کا سیدے سے نکاح پڑھانے آیا اور اس نے پوچھا۔

"کیا تمھیں سیدا کھیڑا ولد اجو چودھری قبول ہے۔؟"

اور جواب میں ہیر نے کہا۔

"مجھے یہ رشتہ ہرگز قبول نہیں۔ میرا نکاح تو بہت پہلے پانچ پیروں نے رانجھے کے ساتھ پڑھا دیا تھا۔"

مگر اس کا یہ انکار کام نہ آسکا کیونکہ قاضی شرعی فرض پورا کرنے کی بجائے مہر چوچک کا حکم بجالا رہا تھا۔ ہیر انکار کرتی رہی، چیختی رہی لیکن اس کا نکاح زبردستی سیدے کھیڑے سے پڑھوا دیا گیا اور مبارک باد کے شور میں اس کی ساری چیخ و پکار دب کر رہ گئی۔ کھیڑوں نے ہیر کو ڈولی میں ڈالا اور باجوں گاجوں کے ساتھ اپنے شہر رنگ پور کی طرف چل دیے۔ اس طرح ہیر کو تو کھیڑے لے کر چل دیے مگر رانجھے کی تو ساری دنیا ہی لٹ گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کرے۔۔۔؟ کہاں جائے۔۔۔؟ پہلے سوچا کہ وہ بھی رنگ پور جائے مگر اس سے ہیر کے مصائب میں اضافہ کرنے کے سوا کچھ حاصل ہونے کی توقع نہیں تھی۔ وہ چند روز اپنی ناکام محبت کو گلے لگائے جھنگ میں ہی ادھر ادھر گھومتا پھرتا رہا تاکہ کسی نہ کسی طرح ہیر کے بارے میں خیر خبر ملتی رہے اور پھر ایک روز زیادہ اداس ہوا تو اپنے شہر تخت ہزارے کی طرف چل دیا۔ تخت ہزارہ پہنچا تو آگے بھائیوں اور بھابیوں نے کچھ زیادہ خوشی کا اظہار نہ کیا حالانکہ اس عرصہ میں وہ کئی بار ہیر کو خط لکھ چکے تھے کہ کسی طرح رانجھے کو واپس بھیج دو مگر اب وہ گیا تو کسی نے پرجوش محبت سے اسے خوش آمدید نہ کہا۔ شاید اس لیے کہ ان تک بھی ہیر کی کھیڑوں میں شادی کی خبر پہنچ چکی تھی۔ رانجھے کو ایسے معلوم ہو رہا تھا جیسے دنیا میں اس کے رہنے کے لیے کوئی جگہ ہی نہ رہی۔ اس کا دل واقعی زندگی سے اچاٹ ہو رہا تھا۔ صرف ہیر کی ایک یاد تھی جو اسے زندہ رکھے ہوئے تھی۔ لیکن ہیر تک پہنچنا اسے ناممکن نظر آرہا تھا۔ آخر ایک روز اس کے جی میں نہ جانے کیا آیا کہ وہ جہلم کی طرف چل دیا۔ جہلم کے علاقے میں ایک جگہ جوگیاں کا ٹلا تھا جہاں اس دور کے مشہور جوگی گوروبال ناتھ کا استھان تھا جہاں دور دور سے لوگ جوگ لینے کے لیے آتے تھے۔ بعض لوگوں نے بال ناتھ کی جگہ گورو گورکھ ناتھ لکھا ہے۔ رانجھا بھی وہاں پہنچ گیا اور گوروبال ناتھ کی خدمت میں حاضر ہو کر

عرض کی۔

"گورو جی مجھے اپنا چیلا بنا لیجئے۔!"

جواب میں گورو ناتھ نے ایک نظر رانجھے کے سراپا پر ڈالی۔اس کے سامنے ایک خوبصورت نوجوان کھڑا تھا جس کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ نازوں میں پلا ہوا ہے۔اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"چیلا بننے اور جوگ لینے کے لیے تو بڑی مشقتیں اٹھانا پڑتی ہیں۔مشکل امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے۔تم سا نرم و نازک نوجوان یہ کیسے برداشت کر سکے گا۔؟"

اس کے جواب میں رانجھے نے اپنی محبت کی دکھ بھری کہانی بیان کردی اور بتایا کہ وہ ہیر کے عشق میں کن کن مصائب سے دوچار رہا ہے۔گورو بال ناتھ نے اس کی ساری بپتا سنی تو دل میں سوچنے لگا۔

"یہ تو پہلے ہی عشق کی آگ میں تپ کر کندن بنا ہوا ہے۔فقیری حاصل کرنے کے لیے جن کٹھن راستوں سے گزرنا پڑتا ہے' ان کا سفر تو یہ پہلے ہی طے کر چکا ہے۔"

اس نے رانجھے کو قریب بلا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا' اشیرواد دی اور اسے اپنا چیلا بنا لیا۔اسی وقت اس کے کان چھید کر اسے مندرے پہنا دیے گئے اور رنگ بھبھوت رما کر جوگ دے دیا گیا۔جس جوگ کے حصول میں برسوں لگتے تھے رانجھے کو وہ تھوڑی ہی دیر میں مل گیا۔وہ کچھ روز گورو کے استھان پر رہا اور پھر گورو کی اجازت لے کر رنگ پور کی جانب چل دیا جہاں جانے کے لیے اس نے جوگ لیا تھا۔وہ سفر کرتا ہوا سیدھا رنگ پور پہنچا اور رنگ پور کے باہر ایک باغ تھا جسے کالا باغ کہتے تھے' اس نے وہاں جا کر ڈیرا ڈال دیا۔ایک چھوٹی سی کٹیا بنالی اور دھونی رما کر وہاں بیٹھ گیا۔اس وقت رانجھا ایک جوگی کے روپ میں تھا اور اسے کوئی پہچان نہ سکتا تھا۔اس نے دوسرے روز کشکول ہاتھ میں لیا اور شہر کی گلیوں میں گھوم پھر کر جائزہ لینے لگا اور شام کو واپس آ کر اپنی کٹیا میں بیٹھ کر تجویزیں سوچنے لگا کہ ہیر تک کیسے پہنچا جائے۔؟

اکا دکا لوگوں میں یہ خبر پھیلنے لگی کہ کالا باغ میں ایک انوکھے جوگی نے ڈیرا ڈال رکھا ہے جو

نوجوان ہونے کے ساتھ ساتھ بہت خوبصورت بھی ہے۔یہ خبر ہیر کی رازدار نند سہتی کے کانوں تک بھی پہنچی تو وہ اپنی چند سہیلیوں کے ساتھ کالا باغ کی سیر کرنے گئی۔وہاں اس نے رانجھے کو جوگی کے روپ میں دیکھا۔ایک خوبصورت نوجوان اپنے رنگ پر بھبھوت رمائے بیٹھا ہے اور اس کے طور طریقے عام جوگیوں سے مختلف ہیں۔وہ اس سے باتیں کر کے معلومات حاصل کرنے لگی۔یہی نہیں بلکہ وہ اس کا اصل روپ جاننے کے لیے اس سے بحث بھی کرنے لگی کیونکہ اسے اس پر شک تھا۔اپنے اسی شک کا اظہار اس نے گھر آکر اپنی بھابھی ہیر سے کیا اور بتایا کہ کہ کالے باغ میں ایک انوکھا جوگی آکر ٹھہرا ہے‘ایسے لگتا ہے جیسے اس نے یہ روپ کسی کی تلاش کے لیے بھرا ہے۔ہیر نے اس کی بات سنی تو اسے بھی شک ہونے لگا کہ ہو نہ ہو‘رانجھا جوگی بن کر میری تلاش میں آیا ہے۔ادھر رانجھے کو اجو چودھری کا گھر معلوم نہیں تھا‘پھر مشکل یہ بھی تھی کہ وہ کسی سے دریافت بھی نہیں کر سکتا تھا اور جب تک گھر کا پتہ نہ چلتا اس وقت تک ہیر کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہ ہو سکتا تھا۔اسی لیے وہ پھرتے پھراتے اور ادھر ادھر کنکھیوں سے جھانکتے تاکتے گھوم رہا تھا۔اسی طرح فقیروں کے لباس میں گھومتا گھماتا آخر کار وہ اجو چودھری کے دروازے پر پہنچ گیا جہاں اس نے الکھ کی صدا لگائی اور بلند آواز میں کہا۔

”اللہ کے نام پر فقیر کو کچھ دے دو۔۔۔۔!اللہ بھلا کرے گا۔۔۔!“

فقیر کی آواز سن کر سہتی نے دروازہ کھولا اور اپنے سامنے کالے باغ والے جوگی کو کھڑے پایا۔اس نے خیرات دینے کے لیے تھوڑا سا اناج رانجھے کے کشکول میں لا کر ڈالا لیکن رانجھے کو خیرات کی ضرورت نہیں تھی‘یہ تو ایک بہانہ تھا‘وہ تو کسی نہ کسی طرح ہیر کو دیکھنا چاہتا تھا اسی لیے اس کی نظریں صحن میں ادھر ادھر کچھ تلاش کر رہی تھیں۔شوخ اور چنچل سہتی نے اسے ڈانٹ کر کہا۔

” تمھیں خیرات دے دی ہے۔اب یہاں سے چلتے بنو۔!“

لیکن رانجھا ہیر کو دیکھے بغیر کیسے جا سکتا تھا۔؟اس نے قصداً اپنا کشکول زمین پر گرا دیا۔کشکول کا

زمین پر گرنا تھا کہ اس میں جو کچھ تھا وہ زمین پر بکھر گیا اور رانجھے نے شور کر دیا۔
"تم نے فقیر کی خیرات گرا دی ہے ۔۔ تم اپنی جوانی پر اتنی مغرور ہو کہ تمہیں خدا کا خوف بھی نہیں ۔۔ فقیروں کی بدّ دعا سے ڈرو ۔!"
آگے سے سہتی نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا اور دونوں میں تکرار ہونے لگی۔ اتنے میں دونوں کے جھگڑنے کی آواز سن کر ہیر بھی صحن میں نکل آئی ۔۔۔ رانجھا یہی تو چاہتا تھا۔ اسی لیے تو اس نے یہ ڈرامہ کھیلا تھا۔ ہیر نے جوگی کی طرف دیکھا اور جوگی نے اسے دیکھا' دونوں ایک دوسرے کو پہچان گیے۔ رانجھے کی ترکیب کامیاب ہو گئی تھی۔ وہ خوشی خوشی واپس کالا باغ اپنے ڈیرے پر آگیا اور ہیر کو جیسے نئی زندگی مل گئی۔ وہ جب سے کھیڑں کے گھر آئی تھی' اس امید پر زندہ تھی کہ ایک نہ ایک روز رانجھا ضرور آئے گا۔ اور وہ آگیا۔ اس عرصہ میں اس نے سیدے کھیڑے کو اپنے پاس تک نہ آنے دیا تھا اور اس سلسلے میں اس کی نند سہتی اس کی مددگار ثابت ہوئی تھی جسے اس نے آتے ہی اپنی رازدار بنا لیا تھا۔ اس وقت بھی اس نے سہتی کو اعتماد میں لیکر بتا دیا کہ۔
"یہ فقیر نہیں' فقیر کے بہروپ میں رانجھا تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا ہے"۔
سہتی خود مراد بلوچ کے عشق کی گھائل تھی' وہ اپنی بھابی کی رازدار اس لیے بنی تھی کہ اس طرح اسے اس کا مراد مل جائے گا چنانچہ اب وہ چوری چھپے ہیر اور رانجھے کی ملاقاتیں کرانے لگی۔ پھر ایک روز اس نے نیا ڈرامہ کیا' وہ اس طرح کہ سہیلیوں کے ساتھ ہیر کو کھیتوں میں لے گئی' وہاں ہیر کے پاوں میں کانٹا چبھ گیا جس سے تھوڑا سا خون نکل آیا۔ بس پھر کیا تھا۔؟ سہتی نے شور مچا دیا کہ ہیر کو سانپ نے کاٹ لیا ہے۔ اس نے ہیر کو بھی سکھا پڑھا دیا تھا جس نے اپنے آپ کو اس طرح بنا لیا تھا جیسے غنودگی کے عالم میں ہو۔ اس نے اپنے دانت بھینچ لیے اور اس ڈرامے کو کامیاب بنانے کے لیے سہتی نے اس کے چہرے پر تھوڑی سی ہلدی بھی مل دی تھی تاکہ اس کا چہرہ پیلا دکھائی دے۔ تمام سہیلیاں جلدی جلدی ہیر کو گھر لائیں جہاں گھر والے بھی پریشان ہو گیے۔ سانپ کا زہر نکالنے کی ترکیبیں ہونے لگیں اور جب گھر والے دوا

دارو کے لیے وید حکیم کے پاس جانے لگے تو سہتی نے نہایت چالاکی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"کالا باغ میں کہیں سے ایک جوگی آکر ٹھہرا ہوا ہے جو سانپ کاٹے کا منتر جانتا ہے۔ فوراً جاؤ اور اسے لے کر آؤ۔ وہ بڑا کراماتی مانا جاتا ہے۔"

کچھ افراد اسی وقت بھاگے بھاگے کالا باغ گئے اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد رانجھا جوگی کے روپ میں وہاں موجود تھا۔ اس نے آتے ہی بلند آواز میں الکھ کا نعرہ لگایا اور ادھر ادھر ایسے نظریں گھمائیں جیسے ماحول کا جائزہ لے رہا ہو۔ سہتی اسے اپنے ساتھ لے کر اس کمرے میں گئی جہاں ہیر ایک چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی اور گھر کے کئی لوگ اسکے ارد گرد جمع تھے۔ ہیر نے تھوڑی سی آنکھیں کھول کر پہلے رانجھے کی طرف نظر ڈالی اور پھر سہتی کو دیکھا' آگے سے سہتی نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور جوگی کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی۔

"گورو جی ہم پر کرم کرو۔۔۔ میری بھابی کی جان بچالو۔۔ اسے کسی زہریلے سانپ نے کاٹ لیا ہے!"

رانجھا منہ ہی منہ میں کچھ اس طرح بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھا جیسے کوئی منتر پڑھ رہا ہو۔ اس نے ہیر کی کلائی پکڑ کے دیکھا' چہرے کا جائزہ لیا' آنکھیں کھول کر دیکھیں' پاؤں کی ایڑی پر نظر ڈالی اور پھر ہولے سے بولا۔

"معلوم ہوتا ہے بہت ہی زہریلے سانپ نے کاٹا ہے!"

پھر اس نے گھر کے افراد سے مخاطب ہو کر کہا۔

"تمام لوگ کمرے سے باہر چلے جائیں۔ صرف ایک ایسی لڑکی یہاں رہ سکتی ہے جو کنواری ہو۔!"

ظاہر ہے وہ کنواری لڑکی صرف سہتی ہی ہو سکتی تھی لہٰذا اب کمرے میں ہیر' رانجھا اور سہتی تینوں رہ گئے تھے اور سہتی نے دروازہ بند کر لیا تھا۔ تینوں کے چہروں پر مسکراہٹ تھی کیونکہ ان کی ترکیب کامیاب ہو گئی تھی۔ گھر والوں کو سہتی نے یہ بتایا کہ جوگی سانپ کا زہر زائل کرنے کے لیے تنہائی میں منتر پڑھے گا' اس عمل میں چند روز لگیں گے اور اس دوران سہتی

کے سوا کوئی دوسرا کمرے میں آجا نہ سکے گا۔ گھر والوں کو تو ہیر کی زندگی عزیز تھی' انھوں نے جوگی کی ہدایات پر پورا پورا عمل کیا۔ ادھر ہیر' رانجھا اور سہتی کو اس سے بہتر موقع نہیں مل سکتا تھا۔ انھوں نے آپس میں مشورہ کیا اور وہاں سے فرار ہونے کی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی ترکیب سوچنے لگے۔ سہتی نے کسی نہ کسی طرح اپنے محبوب مراد بلوچ کو بھی خبر کر دی اور پھر مقررہ وقت پر انھوں نے گھر کی پچھلی دیوار میں سیندھ لگائی' مراد بھی وہاں پہنچ گیا تھا جو اونٹ پر آیا تھا چنانچہ وہ چاروں وہاں سے فرار ہو گئے۔ رات کے اندھیرے میں ہیر اور رانجھا ایک طرف کو بھاگ گئے اور مراد بلوچ سہتی کو اونٹ پر بٹھا کر کسی دوسری جانب نکل گیا۔

دوسری صبح جب روزانہ کی طرح گھر والے ان کے لیے ناشتہ لے کر آئے اور سہتی کو دروازہ کھولنے کے لیے آواز دی تو آگے سے کوئی جواب نہ پا کر بار بار پکارا۔ پھر بھی کوئی جواب نہ ملا تو انھوں نے خود دروازہ کھول کر دیکھا مگر وہاں نہ ہیر تھی' نہ سہتی تھی اور نہ ہی جوگی موجود تھا۔ گھر بھر میں شور مچ گیا۔ رانجھا کھیڑوں کی عزت لوٹ کر لے گیا تھا۔ پورے گاؤں کی ناک کٹ گئی تھی۔

"دوڑو' پکڑو۔ ابھی دور نہیں گئے ہونگے؟"

اسی وقت تیز رفتار گھوڑوں پر سوار ہو کر کھیڑے ان کے تعاقب میں چڑھ دوڑے۔ تعاقب کرنے والے دو ٹولیوں میں بٹ گئے۔ ایک ٹولی سہتی اور مراد کے پیچھے گئی اور دوسری ہیر اور رانجھے کی تلاش میں چل نکلی۔ سہتی اور مراد چونکہ اونٹ پر سوار تھے اس لیے وہ دور چلے گئے تھے تاہم جو ٹولی انکے تعاقب میں گئی تھی اس نے ان کو جالیا مگر آگے سے بلوچ قبیلے کے لوگ بھی آ گئے تھے' انھوں نے آتے ہی کھیڑوں کی ٹولی پر حملہ کر دیا اور انھیں فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ دوسری جانب جو ٹولی ہیر اور رانجھے کے تعاقب میں گئی تھی' اس نے ایک جگہ جنگل میں دیکھا تو وہ دونوں سوئے ہوئے تھے۔ رانجھے کا سر ہیر کی رانوں پر تھا اور بے خبر گہری نیند میں تھے۔ کھیڑوں نے انھیں پکڑ لیا' رانجھے کو خوب مارا پیٹا اور ہیر کو ساتھ لے کر چلے گئے۔ رانجھا روتا پیٹتا راجہ عدلی کے دربار میں پہنچ گیا اور فریاد کرنے لگا۔ راجہ نے شور سنا

تو پوچھا۔
"تم کون ہو اور آہ وزاری کیوں کر رہے ہو۔؟!"
جواب میں رانجھا ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔
"اے راجا! تمھارے عدل کی دور دور تک دھوم ہے مگر میں تمھارے راج میں بے تقصیر لٹ گیا ہوں۔ میں ایک فقیر ہوں اور کھیڑے میری عورت چھین کر لے گئے ہیں۔!"
راجے نے اسی وقت حکم دیا کہ کھیڑوں کو گرفتار کیا جائے اور پھر جب کھیڑوں کو دربار میں پیش کیا گیا تو انھوں نے بھی فریادی بنتے ہوئے کہا۔
حضور یہ جوگی فریب کار ہے۔ یہ سانپ کاٹے کا علاج کرنے کے بہانے ہماری بہو اغوا کر کے لے آیا۔ اس نے ہماری عزت لوٹی ہے، اسے سزا ملنی چاہیے۔؟"
ادھر رانجھے کا کہنا یہ تھا کہ انھوں نے میری عورت زبردستی چھین لی ہے اور کھیڑوں کا اصرار یہ تھا کہ یہ مکار جھوٹ بول رہا ہے۔ راجے کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اسے رانجھا کوئی پہنچا ہوا درویش دکھائی دے رہا تھا۔ جب وہ خود کوئی فیصلہ نہ کر سکا تو اس نے قاضی کی طرف رجوع کیا۔ قاضی نے دونوں طرف سے پوری بات سنی اور پھر فیصلہ یہ دیا کہ رانجھا دغاباز اور فریبی ہے اس لیے ہیر کھیڑوں کو ملنی چاہیے۔ اس طرح سیدے کھیڑے کو ہیر مل گئی اور رانجھا روتا چیختا رہ گیا۔
جب کھیڑے ہیر کو لے گئے تو رانجھے نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اللہ کے حضور میں فریاد کی۔
"اے اللہ! میرے ساتھ عدلی راجا نے بے انصافی کی ہے۔ تیرا نام قہار و جبار ہے، اس شہر پر کوئی ایسا عذاب نازل کر جس سے مجھ پر ہونے والی زیادتی کا ازالہ ہو جائے۔!"
اس کی بددعا کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے شہر کے چاروں طرف آگ کے شعلے بھڑکنے لگے اور شہر بھر میں کہرام مچ گیا۔ جب راجے کو اس بات کا علم ہوا کہ فقیر کی بددعا سے آگ لگ گئی ہے تو اس نے حکم دیا کہ۔
"کھیڑوں کو فوراً گرفتار کر کے لایا جائے اور ان کے ساتھ اس عورت کو بھی پیش کیا جائے جس

کی وجہ سے یہ جھگڑا ہوا ہے۔!"
حکم کی دیر تھی 'کھیڑوں کے ساتھ ہیر کو بھی راجا کے دربار میں پیش کردیا گیا۔ راجے نے ہیر کو رانجھے کے سپرد کرتے ہوئے کہا۔
"اے جوگی ہمیں معاف کردو' ہیر پر تمہارا حق ہے اور تمہاری امانت تمہارے سپرد ہے۔!"
اس طرح کھیڑے بے بس اور مایوس ہو کر واپس چلے گئے اور ہیر رانجھے کو مل گئی مگر اب ان کے لیے مسئلہ یہ تھا کہ وہ کہاں جائیں۔؟ رانجھے نے ہیر سے کہا۔
"میرے شہر تخت ہزارہ چلتے ہیں۔؟"
مگر ہیر کہنے لگی۔
"اس طرح تمہارے خاندان والے کہیں گے 'تم مجھے بھگا کر لائے ہو۔ بہتر یہ ہے پہلے ہم جھنگ سیال چلتے ہیں۔ اب تو راجا عدلی نے فیصلہ دے دیا ہے۔ میرے والدین کو بھی ہماری شادی پر کوئی اعتراض نہ ہو گا۔؟"
وہ دونوں جھنگ شہر میں پہنچ گئے جہاں واقعی ہیر کے گھر والوں نے انھیں خوش آمدید کہا اور خوب آؤ بھگت کی۔ انھوں نے رانجھے سے کہا۔
"اب ہمیں تم دونوں کی شادی کرنے میں کوئی عذر نہیں ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ تم تخت ہزارہ جاؤ اور وہاں سے باقاعدہ بارات لے کر آؤ۔ ہم ہیر کی شادی دھوم دھام سے کریں گے۔!"
رانجھا فوراً" راضی ہو گیا اور ہیر کو ماں باپ کے پاس چھوڑ کر خود تخت ہزارہ کی طرف چل دیا۔ وہ راستے میں یہ سوچ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ بھابیوں نے مجھے ہیر بیاہ لانے کا طعنہ دیا تھا' اب وہ دیکھ لیں گی' میں ہیر کو بیاہ لایا ہوں۔ اسی طرح خیالات میں کھویا ہوا وہ تخت ہزارہ پہنچ گیا۔ ایک طویل عرصہ سے اپنے بھائیوں اور بھابیوں سے بچھڑا ہوا تھا اس لیے وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے پھر جب اس نے ہیر سے شادی کی خوش خبری سنائی تو واقعی ان کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ انھوں نے پورے گاؤں میں 'گھر گھر یہ خوشخبری پہنچا دی اور رانجھے کی بارات لے جانے کی تیاریاں کرنے لگے لیکن رانجھے کو بارات لانے کے لیے بھیجنا تو

مہر چوچک اور اس کے گھر والوں کی ایک چال تھی۔ جب رانجھا جھنگ سے چلا آیا تو پیچھے ہیر کو ختم کرنے کے منصوبے بنائے جانے لگے۔ چوچک نے خاندان کے لوگوں کو جمع کیا اور کہنے لگا۔

"ہیر اور رانجھے کی بات ہر جگہ مشہور ہو چکی ہے' اگر ہم نے ان کی شادی کر کے اپنی بیٹی کو رخصت کر دیا تو سیالوں کی رہی سہی عزت بھی جاتی رہے گی۔ ہمیں اس بدنامی سے بچنے کے لیے کچھ سوچنا چاہیے۔؟"

سب نے اپنا اپنا مشورہ دیا اور آخر میں یہ طے ہوا کہ ہیر کو زہر دے کر ہلاک کر دیا جائے چنانچہ یہی کیا گیا۔ ہیر کو زہر دے کر یہ مشہور کر دیا گیا کہ شدید بیمار ہونے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے رانجھے کو ہیر کی موت کی اطلاع دینے کے لیے ایک آدمی روانہ کر دیا۔

تخت ہزارہ میں رانجھا بڑی دھوم دھام سے بارات لے کر چلنے ہی والا تھا کہ سیالوں کا بھیجا ہوا قاصد پہنچ گیا۔ جونہی اس نے ہیر کے مرنے کی خبر سنی وہ سکتے میں آگیا۔ چند لمحوں تک بے حس و حرکت کھڑا رہا اور پھر ایک لمبی آہ کھینچ کر وہیں گر پڑا۔ بھائیوں نے آگے بڑھ کر اسے اٹھانا چاہا تو وہ ہمیشہ کے لیے اپنی ہیر کے پاس پہنچ چکا تھا۔

بعض داستان نگاروں نے یہ لکھا ہے کہ جب رانجھے کے پاس ہیر کے مرنے کی خبر پہنچی تو اسے یقین نہ آیا' وہ خود جھنگ گیا اور وہاں جا کر ہیر کی قبر دیکھی اور اس پر گر کر جان دے دی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب رانجھا ہیر کی قبر پر گرا تو قبر شق ہو گئی اور وہ بھی اس میں سما گیا۔ ایک اور روایت میں ہیر اور رانجھے کا انتقال نہیں ہوتا بلکہ آخر میں وہ حج پر چلے جاتے ہیں۔

سوہنی مہینوال

پنجاب میں بہنے والے پانچ دریاؤں میں سے صرف دریائے چناب کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس کے ساتھ کئی ایک عوام میں مقبول عشقیہ داستانوں کا تعلق رہا ہے اور آج بھی بعض کہانیاں اسی کے حوالے سے سنی سنائی جاتی ہیں۔ان رومانی داستانوں کی وجہ سے دریائے چناب پنجاب کے لوک گیتوں کا حصہ بن گیا ہے اور ان لوک گیتوں میں اس کا ذکر جگہ جگہ ملتا ہے۔سوہنی مہینوال کی المیہ انجام والی عشقیہ کہانی کا تعلق بھی اسی رومان پرور دریا سے ہے۔بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس داستان کا جو گہرا تعلق اس دریا سے ہے وہ کسی اور رومانی داستان کا نہیں ہے۔یہ کہانی پنجاب کے شہر گجرات سے تعلق رکھتی ہے جس کے قریب سے چناب گزرتا ہے اور پنجابی زبان میں اس دریا کا نام جھناں ہے۔سوہنی اور مہینوال کی ساری کہانی اسی شہر اور اسی دریا کے اردگرد گھومتی ہے۔اس کا آغاز شہر گجرات میں ہوا اور انجام

دریائے چناب کی تند و تیز لہروں میں ہوا۔یہ شہر آج بھی آباد و شاد ہے'یہ دریا آج بھی رواں دواں ہے اور یہ کہانی آج بھی زندہ و پائندہ ہے۔

یہ صدیوں پہلے مغل بادشاہ شاہجہاں کے دور کی بات ہے۔اس دور میں آج کے ازبکستان کے تاریخی شہر بخارا کے مقام بلخ میں ایک بہت بڑا سوداگر رہتا تھا جس کا نام مرزا عالی تھا۔اس کا صرف نام ہی عالی نہیں تھا'وہ خود بھی عالی نسب تھا اور انتہائی نیک دل اور سخی تھا۔اس کی سوداگری کا دائرہ بہت وسیع تھا اور تجارت کا کاروبار دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔یہ طرح طرح کے سامان تجارت کی خرید و فروخت کرتا تھا جس میں کشمیری پشمینہ'ایرانی قالین'کاشانی مخمل'کمخواب'سنجاب'سمور'حریر اور دیبا کے علاوہ لونگ'الائچی'پستہ'کشمش'کھجور'سیب وغیرہ شامل تھے۔ان کے ساتھ ساتھ وہ بلور کے ظروف'جڑاؤ زیور'زمرد'ہیرے اور جواہر اور دیگر اشیا کی تجارت کرتا تھا۔اس کے کارندے ملکوں ملکوں پھیلے ہوئے تھے جو ادھر کا مال ادھر لے جاتے تھے اور ادھر کا ادھر لا کر فروخت کرتے تھے۔اس طرح مرزا عالی کا کاروبار'ہندوستان'افغانستان'ایران اور بعض دوسرے ملکوں تک پھیلا ہوا تھا۔جس طرح اس کا کاروبار وسیع تھا ویسے ہی اس کی دولت کا کوئی شمار نہ تھا۔اللہ نے اسے عزت شہرت کے ساتھ ساتھ دولت بھی خوب عطا کی تھی جس میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا لیکن اس قدر دولت اور خوشحالی کے باوجود وہ ایک چیز سے ابھی تک محروم تھا۔اور وہ تھی اولاد کی نعمت۔وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھا اور اسی غم میں دن رات گھل رہا تھا۔ہر وقت سوچتا۔

"یہ اس قدر دولت'عزت اور شہرت میرے کس کام کی۔؟کل کو جب میری آنکھیں بند ہوں گی تو اس کا وارث کون ہو گا۔؟"

وہ ہر وقت اللہ کے حضور گڑگڑا کر دعائیں مانگتا۔

"اے دنیا اور آخرت کے مالک!تم نے مجھے ہر نعمت سے نوازا ہے اور دوسروں سے بڑھ چڑھ کے نوازا ہے مگر اب تک اولاد سے محروم ہوں۔مجھ پر کرم کر اور مجھے میرا وارث عطا کر جو میرے بعد میرا نام زندہ رکھ سکے!"

وہ غریبوں اور حاجت مندوں میں دل کھول کر خیرات کرتا تھا اور پیروں فقیروں کی خدمت میں نذر نیاز بھی پیش کرتا رہتا تھا تاکہ کسی کی دعا سے اس کی امید بر آئے۔ایک بار قریبی پہاڑوں میں کوئی بزرگ آکر ٹھہرا تو اس کے دوستوں نے مشورہ دیا۔

"اس کے پاس جاؤ--- سنا ہے بہت پہنچا ہوا بزرگ ہے۔ہو سکتا ہے اس کی دعا ہی سے تمہاری مراد پوری ہو جائے۔"

مرزا عالی کو اس میں کیا عذر ہو سکتا تھا۔؟وہ تو اپنی تمنا کی تکمیل کی خاطر ہر جگہ جانے کے لیے تیار تھا۔جیسے ہی دوستوں نے مشورہ دیا وہ بغیر کسی تاخیر کے اس خدا رسیدہ بزرگ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔اس نے جا کر اسے بڑی عاجزی سے سلام کیا'نذر و نیاز پیش کی اور پھر عرض کی۔

"حضور میرے حق میں دعا کیجیے۔میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے مگر ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم ہوں!"

بزرگ نے ایک نظر اس کے سراپا پر ڈالی اور پھر آنکھیں بند کیے کوئی دعا پڑھتا رہا۔اس کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور مرزا عالی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اللہ تمہاری مراد ضرور پوری کرے گا اور تمہیں ایک بیٹا عطا ہو گا۔۔مگر۔۔!"

وہ بات کرتے کرتے لمحہ بھر کے لیے رک گیا۔

"مگر کیا۔۔؟حضور مجھے بتایئے۔؟پھر کیا ہو گا۔۔؟"

مرزا عالی نے بے صبری سے سوال کیا جس پر بزرگ اپنی بات پوری کرتے ہوئے بولا۔

"وہ جوان ہو کر عشق میں مبتلا ہو گا اور مصائب کا سامنا کرے گا۔"

مرزا عالی بزرگ کی دعا سے خوش خوش واپس آیا اور اپنے روز مرہ کے کاموں میں مصروف ہو گیا۔پہلے تو وہ صرف امید ہی پر زندہ تھا لیکن اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ اللہ اسے ضرور اولاد سے نوازے گا۔اور پھر ہوا بھی یہی۔ٹھیک نو ماہ بعد اس کے گھر ایک بیٹا پیدا ہوا جس نے امیدوں کا چاند بن کر اس کے دل کے اندھیروں میں روشنی پھیلا دی۔ایک تو اللہ نے اسے

ادھیڑ عمر میں اولاد دی تھی اور دوسرا یہ کہ بیٹا انتہائی خوبصورت تھا جسے دیکھ کر گھر بھر میں خوشیاں منائی جانے لگیں۔ مرزا عالی کی مراد ڈھلتی عمر میں طویل انتظار کے بعد پوری ہوئی تھی اس لیے دن رات خوشیوں کا سماں بندھ گیا اور اس نے فقیروں اور محتاجوں میں جی کھول کر خیرات تقسیم کی۔ پھر اس نے بڑے چاؤ سے بچے کا نام عزت بیگ رکھا جو جوان ہو کر بزرگ کے کہنے کے مطابق عشق میں مبتلا ہوا اور مہینوال کے نام سے مشہور ہوا۔

عزت بیگ کی تربیت بڑے لاڈ پیار سے ہونے لگی' مرزا عالی کے پاس دولت کی ریل پیل تھی اس لیے اس کی تربیت اور دیکھ بھال میں کسی قسم کی کمی نہ کی گئی۔ اس کے چاروں طرف خدمت گار موجود تھے جو ہر وقت خدمت کے لیے تیار رہتے تھے اور یوں اس کی پرورش بڑے چاؤ سے ہونے لگی۔ پھر جب وہ ذرا بڑا ہوا تو اس کے لیے استاد مقرر کر دیا گیا جو اسے اس وقت کے رائج علوم کی تعلیم دینے لگا۔ ایک تو عزت بیگ امیر باپ کا بیٹا تھا' دوسرا وہ بہت خوبصورت تھا اور اس پر بلا کا ذہین بھی تھا' اس لیے ہر شخص اس سے پیار کرتا تھا۔ جس کو دیکھو' اس کی ذہانت اور عقلمندی کی تعریف کرتا نظر آتا تھا۔ جب وہ نوعمری کی منزل میں داخل ہوا تو مرزا عالی نے اسے گھڑ سواری' نیزہ بازی اور سپہ گری کی تربیت دلانے کا بندوبست بھی کر دیا اور بہت جلد عزت بیگ فن سپہ گری میں اس قدر ماہر ہو گیا کہ شہر کے نوجوانوں میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ اس وقت وہ بھرپور نوجوان تھا اور اسے دنیا کے حالات معلوم کرنے کا بہت شوق تھا۔ جو لوگ اس کے باپ کا سامان تجارت لے کر ملکوں ملکوں جاتے تھے' وہ جب واپس آتے تو عزت بیگ ان سے دیس دیس کے حالات معلوم کرتا اور نئے نئے قصے کہانیاں سنتا۔ ان دیکھے ملکوں کے سفر کے واقعات سن سن کر اس کے دل میں دنیا دیکھنے کا شوق اور بڑھ جاتا۔ وہ اپنے دل میں سوچتا' مجھے بھی تجارتی قافلے کے ساتھ جانا چاہیے مگر باپ کی حد سے زیادہ محبت اس کی رکاوٹ بن جاتی۔ خاص طور پر اسے دہلی شہر دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا کیونکہ اس نے اس کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ آخر ایک روز جب وہ اپنے باپ کے پاس بیٹھا ادھر ادھر کی باتیں کر رہا تھا تو اس نے موقع دیکھ کر کہا۔

"ابا جان! میں چاہتا ہوں کہ سوداگری کے کاروبار میں حصہ لوں۔؟"
باپ نے یہ سنا تو کچھ گھبرا سا گیا کیونکہ اسے خدا رسیدہ بزرگ کا کہنا اچھی طرح یاد تھا۔ وہ بولا۔
"نہیں بیٹا۔۔ تجارت کرنے کے لیے ملازم بہتیرے ہیں۔ تمہیں سفر کی مشکلات میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔؟"
باپ کے اس جواب پر عزت بیگ نے کہا۔
"اب میں جوان ہو چکا ہوں۔۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے کاروبار میں شامل ہو کر اس کی اونچ نیچ سے واقفیت حاصل کروں۔"
اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے دل کی بات بھی کہہ دی۔
"ابا جان مجھے دہلی شہر دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ میں نے اس شہر کی بڑی تعریفیں سنی ہیں۔"
باپ اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔
"بیٹا! دہلی کوئی دو تین منزلوں کے فاصلے پر تو نہیں ہے جو تم جلدی سے دیکھ آؤ گے۔ وہ یہاں سے بہت دور ہے اور اس کے لیے تمہیں بہت لمبا سفر کرنا پڑے گا۔ تمہیں معلوم نہیں کہ سفر میں کتنی مشکلات پیش آتی ہیں۔"
مرزا عالی نہیں چاہتا تھا کہ بیٹے کو اتنے لمبے سفر پر بھیجے لیکن جب عزت بیگ نے بہت زیادہ اصرار کیا تو اپنے دل میں سوچنے لگا "آج نہیں تو کل" آخر کو یہ سارا کاروبار اسی کو سنبھالنا ہے' اس لیے بہتر ہے میرے جیتے جی اسے مکمل معلومات حاصل ہو جائیں۔ پھر یہ بھی تھا کہ عزت بیگ قافلے کے ساتھ جانے کی ضد پر اڑا ہوا تھا چنانچہ اس نے اسے سفر کی اجازت دیتے ہوئے کہا۔
"ٹھیک ہے۔۔ اس بار تم بھی مال تجارت کے ساتھ چلے جانا مگر یاد رکھو' تمہیں جلد سے جلد واپس آنا ہوگا۔؟"
اس پر عزت بیگ باپ کو یقین دلاتے ہوئے بولا۔
"آپ مطمئن رہیں۔ میں ضرورت سے زیادہ ایک دن بھی کہیں نہیں ٹھہروں گا۔"

اس طرح باپ سے سفر کی اجازت ملنے پر عزت بیگ بہت خوش تھا کہ اب وہ دہلی شہر دیکھ سکے گا جس کے بارے میں اس نے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ وہاں کی بڑی بڑی عمارتیں' بلند وبالا مینار' چوڑی سڑکیں اور طرح طرح کے لوگ۔ پھر یہ بھی تھا کہ بلخ میں دہلی کی شہرت پہلے سے تھی' مغلوں کی فوجیں ایک بار بلخ تک پہنچ گئی تھیں مگر پایہ تخت دہلی سے بہت زیادہ دور اور پہاڑیوں' ندیوں کی وجہ سے دشوار گزار راستے ہونے کے سبب مغلوں کی گرفت قائم نہ رہ سکی تھی البتہ وہاں دارالحکومت دہلی کا چرچا ابھی تک تھا۔ مرزا عالی کے جو لوگ سامان تجارت لے کر دہلی تک جاتے تھے' ان کی زبانی نئی نئی کہانیاں اور واقعات سنے سنائے جاتے تھے۔ اور یہی کہانیاں قصے سن سن کر عزت بیگ کے دل میں دہلی دیکھنے اور گھومنے کا شوق جاگا تھا۔ اب جب کہ اس کے باپ نے اسے وہاں جانے کی اجازت دے دی تھی تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ لہٰذا اس بار جب تجارتی قافلہ جانے کے لیے تیار ہوا تو عزت بیگ بھی اس کے ساتھ تھا اس نے باپ سے کہا۔ ابا جان! آپ بے فکر رہیں میں بہت جلد لوٹ آؤں گا۔
اس نے اپنی ماں کو بھی تسلی دی۔

"صرف چند روز کی بات ہے ماں۔ میں پھر آپ کے قدموں میں ہوں گا۔"

اس طرح وہ اپنے باپ اور ماں' دونوں سے اجازت لے کر تجارتی قافلے میں شامل ہو گیا جو قسم قسم کا سامان تجارت لے کر دہلی تک جا رہا تھا۔ اس قافلے میں بہت سے لوگ تھے جو اونٹوں اور گھوڑوں پر تجارتی سازوسامان لادے ہوئے تھے چونکہ راستے میں قافلہ لوٹنے والے لٹیروں اور ڈاکوؤں کا خطرہ بھی ہوتا تھا اس لیے کئی مسلح لوگ بھی ساتھ تھے جو قافلے والوں کی حفاظت پر مامور تھے۔ جن دنوں یہ قافلہ جا رہا تھا اس زمانے میں مغل بادشاہ شاہ جہاں کی سالگرہ کا جشن قریب تھا اس لیے ان کی کوشش تھی کہ جلد سے جلد دہلی پہنچ جائیں۔ اس موقع پر سامان تجارت کم سے کم وقت میں فروخت ہونے کی توقع تھی کیونکہ جشن میں شریک ہونے اور اسے دیکھنے کے لیے دور دور سے لوگ آئے تھے۔ قافلے میں بعض ایسے تجربہ کار افراد بھی شامل تھے' جو اس سے پہلے کئی بار دہلی جا چکے تھے' انھوں نے عزت بیگ کو

مشورہ دیا کہ۔

"ہمیں جاتے میں لاہور، گجرات اور دوسرے شہروں میں کہیں رکنا نہیں چاہیے تاکہ ہم یقینی طور پر جشن کے موقع پر دہلی پہنچ جائیں۔ راستے میں جو شہر دیکھنے کے ہیں وہ واپسی پر دیکھے جاسکتے ہیں"۔

اس طرح جاتے وقت ان کے قافلے نے کہیں پڑاؤ نہیں ڈالا، وہ صرف رات گزارنے اور آرام کرنے کے لیے رکتے تھے۔ یوں مسلسل سفر کرتے کرتے آخر کار دہلی پہنچ گئے۔ جب وہ دہلی پہنچے تو وہاں ہر طرف جشن کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں شہر میں ملک ملک کے لوگ جمع تھے اور عمارتوں کو خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ عزت بیگ کے لیے تو یہ سب کچھ نیا تھا اور کسی قدر عجیب بھی۔ وہ حیرانی اور دلچسپی سے ادھر ادھر کا نظارہ کر رہا تھا۔ بازاروں میں قطار در قطار دکانیں قسم قسم کے سامان سے بھری ہوئی تھیں اور ہر طرف ان گنت لوگ ادھر ادھر گھومتے دکھائی دے رہے تھے۔ دہلی کے تجارتی حلقوں میں بلخ کے مرزا عالی کا نام معروف تھا کیونکہ اس کے آدمی برسوں سے سامان تجارت فروخت کرنے آتے تھے اور جاتے میں دوسرا سامان خرید کے لے جاتے تھے۔ تاجروں کو جب یہ پتا چلا کہ اس بار قافلے کے ساتھ مرزا عالی کا بیٹا بھی آیا ہے تو وہ بہت خوش ہوئے اور اس کی بڑی آؤ بھگت کی گئی۔ عزت بیگ نے دربار میں شرف باریابی کی فرمائش کی تو انھوں نے اس کا بھی انتظام کر دیا۔ یہ اعزاز عزت بیگ کے لیے اور بھی خوشی کا باعث تھا۔ وہ بادشاہ کو پیش کرنے کے لیے بلخ سے جو تحائف ساتھ لایا تھا، انھیں لے کر شاہی دربار میں حاضر ہو گیا جہاں شاہجہاں نے اسے خوش آمدید کہا۔ عزت بیگ نے جب تحائف پیش کیے تو بادشاہ کو بہت پسند آئے اس نے خوش ہو کر اسے ایک لاکھ مہریں بخشیں، خلعت دیا اور ساتھ ایک گھوڑا بھی عطا کیا۔ جب عزت بیگ شاہی دربار سے واپس آیا تو اس نے اپنے ساتھیوں کو دربار میں ہونے والی عزت افزائی کے بارے میں بتایا جس پر وہ سارے خوش ہوئے اور کہا۔

"واپس وطن پہنچ کر مرزا عالی کو بتائیں گے کہ یہ اعزاز عزت بیگ کی وجہ سے حاصل ہوا

ہے؟"

قافلے والوں کا خیال تھا کہ ان کا سامان تجارت فروخت ہونے میں ابھی دن لگیں گے جیسے پہلے لگتے تھے لیکن اس باران کے اندازے کے برعکس سازوسامان بہت جلد فروخت ہو گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شاہی جشن کی وجہ سے دہلی میں دور دور سے لوگ آئے ہوئے تھے جن میں بہت سے تاجر بھی شامل تھے۔ سامان فروخت ہونے کے بعد قافلہ چند دن دہلی میں ٹھہرا تاکہ لوگ دہلی کی سیر بھی کرلیں اور واپسی کے لیے سامان بھی خرید لیا جائے۔ ادھر عزت بیگ تو آیا ہی اسی لیے تھا کہ دہلی شہر دیکھے۔ اور اس نے واقعی جی بھر کے دہلی کی سیر کی۔ شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں گھوما' قابل دید مقامات پر گیا' باغوں کی سیر کی۔ ان دنوں یوں بھی وہاں بہت زیادہ رونق اور چہل پہل تھی۔ پھر جب اس کا دل شہر کی سیر سے بھر گیا تو انھوں نے واپسی کی تیاری شروع کر دی۔ جو سامان وہاں سے خریدا تھا' اسے اونٹوں اور گھوڑوں پر لادا اور واپس اپنے وطن کی طرف چل دیے۔ آتے وقت تو انھیں وقت پر دہلی پہنچنے کی جلدی تھی جس کی وجہ سے وہ کسی شہر میں نہیں ٹھہرے تھے لیکن اب عزت بیگ کا ارادہ تھا کہ ایسے شہر ضرور دیکھتا ہوا جائے گا۔ جو دیکھنے والے ہیں۔ اس نے لاہور شہر کی شہرت بھی سن رکھی تھی اور اس تاریخی شہر کا تذکرہ کئی بار اس کے باپ نے بھی کیا تھا' اسی لیے جب وہ لاہور کے قریب پہنچے تو اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"دو چار دن لاہور میں رک کر یہ شہر بھی دیکھنا چاہیے۔"

وہ وہاں رک تو گئے مگر زیادہ دنوں تک ٹھہرنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا کیونکہ وہ جانتے تھے' پیچھے ان کا انتظار ہو رہا ہو گا۔ انھوں نے دو چار دن وہاں گزارے' کچھ آرام کیا' لاہور کی سیر بھی کی اور پھر وہاں سے پڑاؤ اٹھا کر دوبارہ سفر پر چل دیے جب وہ گجرات کے قریب پہنچے تو عزت بیگ نے کہا۔

"یہ شہر بھی دیکھنا چاہیے۔ ایک دو روز یہاں بھی ٹھہرتے ہیں۔"

ویسے بھی جب وہ گجرات کے قریب پہنچے تھے تو اس وقت شام ہو رہی تھی اور انھیں

رات بسر کرنے کے لیے پڑاؤ کرنا ہی تھا۔ گجرات شہر اگرچہ اس دور میں اتنا بڑا اور پھیلا ہوا نہیں تھا مگر یہ ہندوستان کے اہم شہروں میں سے ایک تھا۔ خاص طور پر ان قافلوں کے لیے اس کی بڑی اہمیت تھی جو دہلی جاتے تھے اور وہاں سے واپسی پر یہاں سے گزرتے تھے۔ انھوں نے شہر کے باہر قافلہ روکا اور وہاں پڑاؤ کر کے بیٹھ گئے۔

گجرات شہر کی دیگر خصوصیات کے علاوہ ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ یہاں انتہائی خوبصورت اور نفیس و نازک ظروف تیار ہوتے تھے جن کی شہرت دور دور تک پہنچی ہوئی تھی۔ یہاں مٹی کے برتن بنانے والے ایسے ایسے کاریگر رہتے تھے جن کے فن کی کہیں اور مثال نہیں ملتی تھی اور انھی ماہر ظروف سازوں میں ایک تلا کمہار بھی تھا جو اپنے فن اور مہارت میں یکتا مانا جاتا تھا۔ اس کا اصلی نام تو عبداللہ تھا لیکن وہ تلا کہلاتا تھا اور اپنی اسی عرفیت سے ہی جانا پہچانا جاتا تھا۔ یہ کمہار کوزہ گری کے فن میں اس قدر ماہر تھا کہ اس کے بنائے ہوئے برتن لوگ تحفوں کے طور پر لے کر جاتے تھے جن کی نفاست اور نزاکت اپنی مثال آپ ہوتی تھی۔ یوں تو اس کے برتن مٹی ہی کے ہوتے تھے لیکن وہ اس مہارت سے تیار کرتا تھا کہ برتن کاغذ کی طرح ہلکے ہوتے تھے۔ ان کے ڈیزائن اور ان پر بنے ہوئے بیل بوٹے دیکھنے والوں کا دل موہ لیتے تھے۔ یہ اس کی مہارت اور ہنرمندی تھی جو اسے اس فن میں اتنی شہرت اور ناموری حاصل تھی۔ اس کے برتن بہت بکتے تھے' اس طرح تلا غریب کمہار نہ تھا بلکہ کھاتا پیتا خوشحال شخص تھا۔ اسی تلے کمہار کے گھر میں لیلتہ القدر کو ایک بیٹی پیدا ہوئی تھی جس کا چہرہ چاند کی طرح روشن تھا۔ اس کی اسی خوبصورتی کو دیکھتے ہوئے ماں باپ نے اس کا نام ''سوہنی'' رکھا تھا' اس لیے کہ وہ واقعی سوہنی تھی۔ وہ جوں جوں بڑی ہوتی گئی اس کا رنگ اور حسن نکھرتا چلا گیا۔ اور پھر جب اس پر جوانی کے شوخ و شنگ رنگوں کی دھنگ بکھری تو اس کی طرف نظر بھر کے دیکھا نہ جاتا تھا۔ جو بھی اسے ایک نظر دیکھ لیتا' مسحور ہو کر رہ جاتا۔ شاعر نے اس کے حسن کی لفظوں میں تصویر کشی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سوہنی مچلتے ہوئے شباب کی ایک تصویر جمیل تھی۔ اس کا ماتھا اتنا روشن تھا کہ چاند ستارے اور

سورج بھی اس پر فدا ہوں۔ اس کے رخسار سرخ انار کی طرح خوبصورت تھے اور اس کے دلکش چہرے پر ایک تل تھا۔ اس کی ناک ایسے تھی جیسے تلوار کی دھار ہو' اس کی آنکھوں میں نیم خوابی کی کیفیت رہتی تھی اور ہونٹوں کی سرخی دیکھ کر لعل و جواہر بھی شرماتے تھے۔ اس کا سینہ صاف بلور کی طرح تھا جس کی رکھوالی کے لیے سیاہ زلفوں کے ناگ تھے۔ اس کے پاؤں نرم و نازک تھے' باتوں میں بلا کی شیرینی تھی اور اس کی چال کے سامنے مور اور ہنس شرمسار ہو جاتے تھے۔ یہ تھی سوہنی جو اس وقت بھرپور شباب میں تھی اور پورے گجرات شہر میں اس جیسی حسین کوئی اور لڑکی نہ تھی۔ پورے شہر کے لوگ اس کی تعریفیں کرتے تھے' صرف گجرات شہر ہی کے نہیں جو بھی اسے ایک بار دیکھ لیتا تھا اس کی تعریف کیے بغیر نہ رہتا تھا۔ اور وہ تھی بھی تعریف کے قابل۔ اللہ نے اسے بے حساب حسن عطا کیا تھا۔ وہ اپنے باپ تلے کے بنائے ہوئے نفیس و نازک اور خوبصورت برتنوں سے بھی کہیں زیادہ حسن سے مالا مال تھی۔

عزت بیگ کے قافلے نے گجرات شہر کے باہر پڑاؤ کیا اور سب لوگ سفر کی تکان اتارنے کی خاطر ستانے لگے۔ رات کو جب سب بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ ایک آدمی نے عزت بیگ سے کہا۔

"حضور! گجرات کے ظروف ملکوں ملکوں مشہور ہیں۔ یہاں ایک کمہار تلا نام کا ہے جس کے بنائے ہوئے برتن اس قدر حسین ہیں کہ لوگ تحائف کے طور پر لے جاتے ہیں۔"

"اگر یہ بات ہے تو کل ہمیں بھی چند ظروف لا کر دو' ہم بھی تحفے کے طور پر اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

عزت بیگ نے جواب میں کہا جس پر وہ آدمی بولا۔

"میں صبح ہی آپ کو چند برتن لا کر پیش کروں گا۔ آپ دیکھیں گے تو تعجب کریں گے کہ ایک انسان کو اللہ تعالیٰ نے کس قدر ہنر مندی اور اس ہنر مندی میں کمال دیا ہے۔"

اس بات کی بعض دوسرے لوگوں نے بھی تصدیق کی اور تلے کے فن کی تعریفیں کرنے

لگے۔ اب تو واقعی عزت بیگ کو بہت اشتیاق ہوا کہ وہ بھی تلے کمہار کے بنائے ہوئے برتن دیکھے جن کی ہر شخص تعریف کر رہا ہے۔ وہ رات بھر دل ہی دل میں اس کے بارے میں سوچتا رہا اور صبح کا انتظار کرتا رہا تاکہ دن نکلے تو وہ تلے کی کوزہ گری کا کمال دیکھے۔ اور پھر جب صبح ہوئی تو اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اس آدمی کو بلا کر کہا۔

"تم نے رات جس کمہار کا ذکر کیا تھا' جاؤ اس سے چند اچھے سے برتن خرید کر لاؤ!"

وہ آدمی تلے کمہار کی دکان جانتا تھا۔ اسی وقت شہر گیا اور کچھ ہی دیر بعد دو چار برتن لے کر آ گیا۔ عزت بیگ نے برتن دیکھے تو حیران رہ گیا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ مٹی میں اس قدر حسن ہو سکتا ہے۔ وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔

"رات جتنی تعریف سنی تھی' یہ برتن اپنی نفاست و نزاکت اور خوبصورتی میں اس سے بھی کہیں زیادہ حسین ہیں۔"

وہ برتن دیکھ کر اس قدر خوش ہوا تھا کہ اپنے ساتھیوں سے ان کی تعریف کیے جا رہا تھا۔ جو آدمی برتن لینے گیا تھا' وہ اتفاق سے تلے کمہار کی سوہنی کو بھی ایک نظر دیکھ آیا تھا' جب عزت بیگ برتنوں کی تعریف کر رہا تھا تو وہ قریب آ کر آہستہ سے کہنے لگا۔

"حضور! یہ تو مٹی کے برتن ہیں' میں نے وہاں ایک لڑکی دیکھی ہے جس کے حسن کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ ایسی خوبصورت لڑکی تو پورے بلخ میں نہیں ہو گی"۔

"اچھا۔ یہ بات ہے۔ کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟"

عزت بیگ نے اشتیاق سے دیکھتے ہوئے کہا' جس پر وہ آدمی بولا۔

"جی ہاں' میں سچ کہہ رہا ہوں۔ اس کے حسن کو دیکھ کر سورج بھی شرماتا ہے۔ اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح ہے۔ اس کی پلکیں تیر کی مانند اور زلفیں ناگ کی طرح ہیں۔ کون ہے جو اسے دیکھ کر اپنے ہوش و حواس نہ کھو دے۔ اس کا نام سوہنی ہے اور وہ تلے کمہار کی بیٹی ہے۔"

اس وقت عزت بیگ کا یہ عالم تھا کہ وہ سوہنی کو دیکھے بغیر ہی اس کا گرویدہ ہوا جا رہا تھا۔

اس نے آہستہ سے ملازم سے کہا۔

"اگر یہ بات ہے تو مجھے بھی وہاں لے چلو۔ میں بھی تو دیکھوں، تم جس کی اتنی تعریف کر رہے ہو۔ کیا واقعی وہ اتنی حسین ہے۔؟"

بھلا ملازم کو کیا انکار ہو سکتا تھا۔؟ وہ تو جو کچھ دیکھ کر آیا تھا' اسی کے بارے میں بتا رہا تھا بلکہ اس کے پاس تو وہ الفاظ ہی نہیں تھے جن سے وہ سوہنی کا حسن بیان کر سکتا۔ اس نے عزت بیگ کو ساتھ لیا اور شہر میں گھوما گھماتا اسے تلے کمہار کی دکان پر لے گیا جہاں تلے نے اسے ایک غیر ملکی گاہک دیکھ کر خوش آمدید کہا اور مختلف برتن دکھاتے ہوئے بولا۔

"یہ دیکھیے، حضور ادھر دیکھیں۔۔۔ ان میں سے کچھ پسند کریں۔؟"

اس وقت منظر یہ تھا کہ تلا اسے قسم قسم کے برتن دکھا رہا تھا اور عزت بیگ برتنوں کی طرف کم اور ادھر ادھر زیادہ دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں دکان میں کچھ اور تلاش کر رہی تھیں۔ دراصل برتن دیکھنا اور خریدنا تو ایک بہانہ تھا' وہ تو سوہنی کو دیکھنے آیا تھا اور اسی کے لیے ادھر ادھر نظریں دوڑا رہا تھا۔ بہر صورت اس کے لیے اسے زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑا کیونکہ اندر سے سوہنی بھی نکل آئی تھی۔ جونہی عزت بیگ نے اسے دیکھا وہ ہکا بکا ہو کر اسے اس طرح دیکھنے لگا جیسے پتھر کا ہو گیا ہو۔ اس نے سوہنی کے حسن کے بارے میں جو کچھ سنا تھا اور جس قدر سنا تھا' وہ اس سے ہزار گنا زیادہ حسین تھی۔ عزت بیگ نے آج تک ایسی حسین و جمیل لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ اس کا ایک ایک نقش اس کے دل میں کھبتا جا رہا تھا اور وہ اس کی طرف ٹکٹکی لگائے اس طرح تکے جا رہا تھا جیسے کسی نے اس پر سحر کر دیا ہو۔ اتنے میں تلے کمہار نے سوہنی سے کہا۔

"بیٹی تم ذرا گاہک کو برتن دکھاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر تلا کسی کام کے لیے دکان کے اندر چلا گیا' ادھر عزت بیگ کو یہ موقع مل گیا کہ وہ جی بھر کے سوہنی کو دیکھ سکے۔ اب عالم یہ تھا کہ سوہنی اسے برتن پر برتن دکھا رہی تھی اور اسے کوئی برتن پسند ہی نہیں آ رہا تھا۔ برتن پسند کرنا تو اس کا مقصد ہی نہیں تھا' وہ تو وہاں زیادہ

سے زیادہ دیر تک ٹھہرنا چاہتا تھا اور اسی لیے سوہنی اسے جو بھی برتن دکھاتی وہ اسے ناپسند کر دیتا۔ یہاں تک کہ وہ برتن دکھاتے دکھاتے تنگ آگئی اور قدرے تنک کر بولی۔

"اگر آپ کو کوئی برتن پسند نہیں آتا تو کسی اور دکان سے خرید لیں۔ ہمارے پاس تو یہی ہیں جو آپ کے سامنے ہیں۔"

اب عزت بیگ کو بھی یہ احساس ہوا کہ وہ کچھ زیادہ ہی دیر وہاں ٹھہر گیا ہے۔ اس کے ساتھ جو ملازم تھا' اس نے بھی اشارے سے اسے یہی سمجھانے کی کوشش کی کہ اب یہاں سے چلنا چاہیے۔ لہٰذا عزت بیگ نے دوچار برتن لے لیے اور سوہنی نے جو قیمت طلب کی ادا کر دی۔ اس طرح وہ تلے کی دکان سے دوچار برتن تو لے آیا تھا لیکن اپنا دل وہیں چھوڑ آیا تھا۔ ایک دل ہی کی کیا بات' وہ تو اپنی جان اور اپنی رُوح بھی وہیں چھوڑ آیا تھا۔ سوہنی اس کے دل و دماغ پر چھا چکی تھی۔ اس نے وہ رات بھی اسی انتظار میں بسر کی کہ صبح ہو تو پھر تلے کی دکان پر جائے اور سوہنی کو دیکھے۔ پھر جیسے ہی دوسرا دن نکلا اس نے اپنے ملازم کو ساتھ لیا اور تلے کمہار کی دکان پر پہنچ گیا۔ حیلوں بہانوں سے کچھ دیر وہاں رکا تاکہ سوہنی کو دیکھ سکے اور پھر گزرے کل کی طرح دو تین برتن خرید کر واپس چلا آیا۔ اس کے بعد اس کا یہ روز کا معمول ہو گیا تھا کہ برتن خریدنے کے بہانے سوہنی کو دیکھنے جاتا اور چند ظروف خرید کر آجاتا۔ مگر وہاں قافلہ کب تک ٹھہر سکتا تھا۔؟ پانچ چھ روز کے بعد جب قافلے والوں نے واپسی کا قصد کیا تو عزت بیگ نے ان سے کہا کہ۔

"تم لوگ چلو میں کسی دوسرے قافلے کے ساتھ آجاؤں گا۔"

انھوں نے بہت اصرار کیا مگر عزت بیگ تو سوہنی کی زلفوں کی زنجیروں میں جکڑا جا چکا تھا۔ اب وہ کہاں جاتا۔؟ قافلے میں شامل عمر رسیدہ لوگوں نے اسے بہت سمجھایا بجھایا اور جب وہ کسی طور واپس بلخ چلنے پر راضی نہ ہوا تو انھوں نے دو تین آدمی اس کی دیکھ بھال کے لیے چھوڑے اور خود گجرات سے آگے اپنے وطن کو روانہ ہو گئے۔ اب عزت بیگ اور اس کے دو تین ملازم رہ گئے تھے اور اس کا معمول وہی تھا کہ روزانہ تلے کمہار کی دکان پر جاتا

سوہنی کو دیکھتا اور دو تین برتن خرید کر واپس چلا آتا اس طرح ان کے پاس اتنے برتن جمع ہو گئے تھے کہ رکھنے کے لیے مزید جگہ نہیں رہی تھی۔ اس نے اپنے ملازموں سے کہا۔

"ان برتنوں کا کیا کریں۔؟ اب تو اور برتن رکھنے کی جگہ بھی نہیں رہی۔؟"

اس پر ملازموں نے مشورہ دیا کہ ہم شہر میں کسی اور جگہ دکان کھول لیں اور خریدے ہوئے برتن وہاں فروخت کر دیا کریں۔ یہ تجویز عزت بیگ کو پسند آئی اور انھوں نے برتنوں کی دکان کھول لی۔ اب یہ ہوتا کہ ادھر عزت بیگ تلے کمہار کی دکان سے مہنگے داموں برتن خرید لاتا اور ادھر اس کے ملازم کوڑیوں کے دام فروخت کر دیتے۔ اس طرح ان کے پاس جو جمع پونجی تھی وہ آہستہ آہستہ ختم ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ایک وقت وہ آیا جب عزت بیگ بالکل کنگال ہو گیا اور اس کی یہ حالت دیکھ کر ایک ایک کر کے ملازم بھی ساتھ چھوڑ گئے۔ اس طرح اب عزت بیگ اس اجنبی شہر میں اکیلا تھا اور مفلس بھی ہو چکا تھا۔ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔؟ سوہنی کو دیکھنے کا بہانہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ آخر جب وہ بہت لاچار ہو گیا' تو ایک روز تلے کمہار کے پاس گیا اور اس سے کہا۔

"میری چوری ہو گئی ہے اور چور سب کچھ لوٹ کر لے گئے ہیں۔ میرے پاس کھانے تک کو کچھ نہیں بچا۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ مجھے اپنے پاس ملازم رکھ لیں۔ مجھے تنخواہ کی ضرورت نہیں' صرف کھانا دے دیا کریں۔ مجھے جو کام دیا جائے گا کروں گا!"

تلے نے اس کی یہ حالت دیکھی تو واقعی اسے اس پر ترس آگیا۔ وہ جانتا تھا کہ عزت بیگ امیر آدمی تھا اور اس نے ایک عرصہ تک مجھ سے ہزاروں لاکھوں کے برتن خریدے ہیں' اب یہ مصیبت میں ہے تو اس کی مدد کرنی چاہیے۔ پھر یہ بھی ہے کہ یہ بغیر تنخواہ کے ملازمت کر رہا ہے' صرف کھانے پر ملازم رکھنا کیا برا ہے---؟ چنانچہ اس نے اسے ملازم رکھ لیا۔ عزت بیگ اسے بھی اپنی خوش قسمتی سمجھتا تھا کہ اسے تلے کے ہاں ملازمت مل گئی ہے اور اس طرح سوہنی کو دیکھنے کا موقع ملتا رہے گا۔ تلے نے چند روز تک اسے صفائی وغیرہ کے کام پر لگایا اور پھر اپنی بھینسوں کی رکھوالی پر لگا دیا۔ پنجابی میں بھینس کو مہیں بولتے ہیں اس لیے

رکھوالے یا چرواہے کو مہینوال کہا جاتا ہے اس طرح بلخ کا سوداگر عزت بیگ اب سوہنی کے عشق میں مہینوال بن گیا تھا۔

مہینوال کی سب سے بڑی تمنا یہی تھی کہ وہ جس طرح بھی ہو سوہنی کے قریب رہے اور یہ موقع اسے مل گیا تھا۔ اب وہ اسے روزانہ دیکھ سکتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ کبھی کبھار اس سے بات بھی ہو جاتی تھی۔ مگر عجیب بات یہ تھی کہ وہ سوہنی کے اس قدر قریب رہ کر بھی اسے اپنے دل کا حال نہیں بتا سکتا تھا۔ اگرچہ اس عرصہ میں سوہنی اس کی نظروں سے بہت کچھ جان گئی تھی اور اس کا دل بھی اسے دیکھ کر دھڑکنے لگتا تھا۔ اس کے باوجود دونوں نے کھل کے اپنے اپنے دل کا حال ایک دوسرے کو نہیں بتایا تھا۔ آخر ایک روز مہینوال نے سوہنی کو اکیلا پا کر اپنے دل کا حال بتا ہی دیا۔ اس نے اپنے سارے حالات بیان کیے کہ وہ بلخ کے بہت بڑے سوداگر کا بیٹا ہے اور محض اس کے عشق میں گرفتار ہو کر اس کے باپ کا نوکر بنا ہے۔ سوہنی کو یہ اندازہ تو تھا کہ مہینوال اس کی محبت کا گھائل ہے مگر یہ بات اس کے گمان میں بھی نہیں تھی، وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کے عشق میں اس قدر دیوانہ ہو چکا ہے۔۔۔۔ اپنے دل میں سوچنے لگی۔

"اس نے محض میرے لیے اپنے آپ کو تباہ کر لیا ہے۔ اس کا عشق سچا ہے!"

سوہنی کے دل میں جو ہلکی سی چنگاری سلگ رہی تھی وہ یک دم شعلہ بن کے بھڑک اٹھی اور اب وہ دونوں ایک دوسرے کے عشق کی آگ میں جلنے لگے تھے۔ انھیں جب بھی موقع ملتا، ایک دوسرے سے دو باتیں کر لیتے اور اپنی پیاس بجھا لیتے لیکن یہی سب کچھ کافی نہیں تھا۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کی بے قراری اور بے تابی حد سے زیادہ بڑھ چکی تھی جو چھپی نہ رہ سکی۔ آس پاس کے لوگ بھی باتیں کرنے لگے تھے اور تلے کے ساتھ اس کی بیوی کو بھی پتا چل گیا تھا۔ ماں نے بیٹی کو ڈانٹا۔

"تمھیں شرم نہیں آتی تم ماں باپ کی عزت خاک میں ملا رہی ہو۔"

مگر اب سوہنی اس منزل پر پہنچ چکی تھی جہاں سمجھنا سمجھانا بے سود تھا۔ جہاں شرم وحیا

کے الفاظ بے معنی ہو گئے تھے۔ اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ یہ دیکھ کر تلے اور اس کی بیوی نے آپس میں مشورہ کیا اور اسی روز جب مہینوال شام کو بھینسیں لے کر گھر آیا تو تلا اس پر برس پڑا۔

"میں نے تم پر رحم کھا کر رکھ لیا اور تم نے ہمارے ساتھ نمک حرامی کی۔؟"

اور پھر اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"تمہاری خیر اسی میں ہے کہ ابھی اپنا بوریا بستر سمیٹو اور یہاں سے چلے جاؤ۔ اس کے بعد کبھی ادھر کا رخ نہ کرنا۔!"

مہینوال کو اتنا تو اندازہ تھا کہ ان کے عشق کا راز کھل گیا ہے اور اس کے بارے میں باتیں ہونے لگی ہیں لیکن اسے یہ یقین نہیں تھا کہ اسے اتنی جلدی گھر سے نکال دیا جائے گا۔ اس وقت سوہنی بھی ایک طرف کھڑی یہ سب کچھ سن رہی تھی مگر وہ اپنی جگہ مجبور تھی، کچھ نہ کر سکتی تھی۔ اس طرح تلے نے مہینوال کو گھر سے نکال دیا اور سوہنی بے بسی میں آنسو بہاتی رہ گئی۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ تلے اور اس کی بیوی نے کمہاروں کا ایک لڑکا پسند کر کے جلدی جلدی سوہنی کی منگنی کر دی اور دو چار روز ہی میں شادی کر کے اسے رخصت کر دیا۔ سوہنی بہتیری چیخی چلائی مگر اس کی کون سنتا تھا۔؟ زبردستی اسے ڈولی میں ڈال دیا گیا اور باجوں گاجوں کے شور میں اس کی ساری چیخیں دب کر رہ گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ شب عروسی میں اس نے اللہ کے آگے دعا کی۔

"اے اللہ! میں مہینوال کی امانت ہوں، تو ہی مجھے محفوظ رکھنے والا ہے۔"

اس کی یہ دعا اس طرح قبول ہوئی کہ اسی رات اس کا شوہر کسی ایسی خطرناک بیماری میں مبتلا ہو گیا جس کا کوئی علاج نہ تھا۔ پھر وہ مردانہ قوت سے محروم ہونے کے ساتھ ساتھ چند ہی روز میں سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔

ادھر مہینوال کا یہ ہوا کہ جب اسے گھر سے نکال دیا گیا تو وہ ادھر ادھر بے مقصد مارا مارا پھرنے لگا۔ پھر جونہی اسے سوہنی کی شادی کی خبر ملی تو وہ اور بھی پریشان ہو گیا۔ اس کی حالت

پہلے ہی قابل رحم ہو رہی تھی' اب اور بھی ابتر ہو گئی۔ سوہنی سے ملنے کی کوئی سبیل نظر نہیں آ رہی تھی۔ اتفاق سے ایک روز اسے سوہنی کی ایک سہیلی مل گئی تو اس نے اس سے اتا پتا پوچھا اور ایک خط بھی دیا کہ اسے سوہنی تک پہنچا دو۔ خط میں اس نے سوہنی سے گلے شکوے کرتے ہوئے اسے بے وفا کہا تھا لیکن دو چار روز بعد جب سوہنی کا جواب ملا تو اس کے دل کی ڈھارس بندھی سوہنی نے لکھا تھا۔

"میں اپنے قول کی سچی ہوں۔ تمھاری تھی اور ہمیشہ تمھاری رہوں گی۔"

مہینوال کو اس کی سچی محبت کا یقین آ گیا تھا۔ اس نے سوہنی کی سہیلی سے اس کے سسرال کا پتا تو معلوم کر ہی لیا تھا چنانچہ ایک روز فقیر کا بہروپ بھر کے اس کے دروازے پر جا پہنچا اور فقیروں کی طرح آواز لگا دی۔

"اللہ کے نام پر بابا۔۔۔۔ کچھ فقیر کو دو!"

اتفاق سے سوہنی کی ساس کسی کام میں مصروف تھی' اس لیے اس نے کہا' فقیر کو خیرات دے دو۔ اور پھر جونہی سوہنی نے خیرات دینے کے لیے دروازہ کھولا تو آگے مہینوال کو کھڑے پایا۔ وہ گھبرا گئی کہ کہیں کسی کو پتا نہ چل جائے۔ انھوں نے جلدی جلدی دو چار باتیں کیں اور سوہنی نے اسے مشورہ دیا کہ۔

"تم دریا کے دوسرے کنارے پر گھاٹ کے قریب ڈیرا جما لو۔ میں رات کو دریا تک پہنچ جاؤں گی تم ادھر سے تیر کے آ جانا۔ مہینوال نے ایسا ہی کیا۔ اس نے دریا کے دوسری جانب ایک جھونپڑی بنا لی اور دھونی رما کر بیٹھ گیا۔ سوہنی بھی رات کے انتظار میں تھی' جیسے ہی رات ہو گئی اور گھر کے تمام لوگ گہری نیند میں چلے گئے تو وہ دبے پاؤں اٹھی اور گھر سے نکل کر دریا پر پہنچ گئی۔ دوسری طرف سے مہینوال تیر کر وہاں پہلے ہی آ چکا تھا' دونوں نے تنہائی میں ایک دوسرے کو دیکھا تو دیوانہ وار ملے اور جی بھر کے باتیں کیں۔ اس کے بعد ان کا یہ روز کا معمول بن گیا تھا کہ رات کو سوہنی دریا پر پہنچ جاتی' دوسری طرف سے مہینوال آ جاتا اور دونوں بیٹھ کر آپس میں باتیں کرتے۔ مہینوال روز اس کے لیے بھنی ہوئی مچھلی لاتا تھا۔

اتفاق سے ایک روز وہ مچھلی نہ پکڑ سکا مگر محبوب کے پاس خالی ہاتھ نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے چاقو سے اپنی ران کا گوشت کاٹا اور اسے بھون کر لے آیا۔ سوہنی نے روز کی طرح مچھلی کھائی تو اسے ذائقہ مختلف محسوس ہوا۔ کہنے لگی۔

"یہ آج تم کیسی مچھلی لائے ہو--- بڑی بدذائقہ ہے۔؟"

یہ سن کر مہینوال نے اپنی ران پر بندھی ہوئی پٹی کھول دی اور بتایا کہ مچھلی پکڑ نہیں سکا تھا اس لیے اپنا ہی گوشت بھون لایا ہوں۔ یہ دیکھ کر سوہنی بہت گھبرائی اور اسے پیار کرتے ہوئے بولی۔

"یہ تم نے کیا کیا؟ مجھے تو تمہارے سچے عشق کا پہلے سے یقین ہے۔"

پھر اس نے کہا۔

"اب کل سے تم دریا پار کر کے نہیں آؤ گے میں خود تمہارے پاس پہنچوں گی۔"

دوسرے روز سوہنی نے یہ کیا کہ بازار سے مٹی کا ایک پکا گھڑا خرید کے لائی اور اسے گھر میں ایک طرف چھپا کے رکھ دیا۔ پھر جب رات کو اس کے جانے کا وقت ہوا تو بڑی احتیاط سے اٹھی، چھپایا ہوا گھڑا اٹھایا اور چھپتی چھپاتی دریا پر پہنچ گئی۔ وہاں پہنچ کر اس نے گھڑا اپنی چھاتی سے لگایا اور اللہ کا نام لے کر دریا میں اتر گئی۔ اس طرح گھڑے کے سہارے تیرتی ہوئی دریا کی دوسری جانب چلی گئی جہاں مہینوال پہلے ہی سے اس کا منتظر تھا۔ اس کے بعد سوہنی کا یہ معمول بن گیا کہ روز رات کو جب گھر والے گہری نیند سو جاتے تو وہ چپکے سے نکلتی اور دریا کے کنارے کے پاس جہاں اپنا گھڑا چھپاتی تھی وہاں سے گھڑا نکالتی اور اسے چھاتی سے لگا کر دریا پار چلی جاتی اور ہر رات دونوں کی ملاقات ہونے لگی۔ اسی طرح ایک رات وہ گھر سے نکلی تو اس کی نند جاگ رہی تھی، اس نے دیکھا تو دبے پاؤں اس کے پیچھے پیچھے چلی کہ دیکھوں یہ کہاں جا رہی ہے۔؟ سوہنی اس سے بالکل بے خبر تھی کہ کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ روز کی طرح گئی، جھاڑیوں میں سے چھپایا ہوا گھڑا نکالا اور چھاتی سے لگا کر دریا میں تیر گئی۔ نند وہیں چھپ کر اس کا انتظار کرتی رہی۔ یہاں تک کہ سوہنی مہینوال سے ملاقات کر کے

واپس آگئی۔ اس کی نند نے دیکھا کہ اس نے جن جھاڑیوں سے گھڑا نکالا تھا' وہیں چھپا دیا اور گھر کی طرف چل دی۔ نند یہ سب کچھ دیکھ کر سوہنی کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی اپنے بستر پر جا کر لیٹ گئی اور سوہنی کو اس بات کی خبر تک نہ ہوئی کہ کسی نے اسے دریا پر جاتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔ دیکھا ہی نہیں بلکہ پورا پورا کھوج بھی لگا لیا ہے۔ اس کی نند دوسرے روز بازار گئی۔ مٹی کا ایک کچا گھڑا لیا اور دریا کے کنارے اس جگہ پہنچ گئی جہاں سوہنی نے اپنا پکا گھڑا چھپایا تھا۔ اس نے پکا گھڑا نکال کے اس کی جگہ کچا رکھ دیا اور گھر چلی آئی۔

اگلی رات' قہر و غضب کی تاریک اور بھیانک رات تھی۔ ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ آسمان سیاہ بادلوں میں چھپا ہوا تھا اور رہ رہ کہ بجلی چمک رہی تھی۔ تیز ہوا کے جھکڑ اس طرح چل رہے تھے' معلوم ہوتا تھا درخت جڑ سے اکھڑ کر گر پڑیں گے۔ دریا میں ایسا جوار بھاٹا تھا کہ لہریں اچھل اچھل کر کناروں سے ہر آ رہی تھیں۔ سوہنی اپنے عشق میں سچی اور ارادے کی پکی تھی مگر آج تو اس کا دل بھی دہل رہا تھا۔ اسے اپنے چاروں طرف موت کھڑی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اس قیامت کے اندھیرے میں چلتی چلتی اس جگہ پہنچی جہاں اس نے گھڑا چھپایا تھا۔ جھاڑیوں میں سے گھڑا نکالا تو دھک سے رہ گئی۔ اندھیرے کے باوجود وہ ہاتھوں سے یہ محسوس کر سکتی تھی کہ یہ گھڑا وہ نہیں تھا جس کے سہارے وہ روز دریا پار کرتی تھی۔ اسے شک ہوا کہ کسی نے اس سے دھوکا کیا ہے لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔؟ موت سے ڈر جانا سچے عاشقوں کا شیوہ نہیں ہے۔ آج کی رات اس کی محبت کا امتحان تھا۔ اس نے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اوپر دیکھا اور کہا۔

"اے خدا! میری مدد کر تاکہ میں اپنے عشق میں پورا اتر سکوں۔"

اور اس کے ساتھ ہی اس نے کچا گھڑا چھاتی سے لگا کر دریا میں چھلانگ لگا دی۔ غضب ناک خونی لہریں اچھلتی ہوئی اس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ پانی کا تیز بہاؤ اسے بے دم کیے جا رہا تھا لیکن وہ مہینوال مہینوال پکارتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ مگر کب تک؟ موت کا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ بھلا کچا گھڑا کہاں تک ساتھ دے سکتا تھا۔؟ وہ ابھی دریا کے درمیان ہی میں تھی

کہ مٹی کا کچا گھڑا گھل کے ختم ہو گیا اور سوہنی کو چناب کی غضب ناک طوفانی لہروں نے نگل لیا۔ ڈوبتے ہوئے بھی وہ مہینوال کو پکار رہی تھی اور ادھر دوسرے کنارے پر کھڑے مہینوال نے بھی اس کی آوازیں سن لی تھیں۔ جب اچانک اس کی آواز آنا بند ہو گئی تو وہ بے تاب ہو کر سوہنی سوہنی پکارتے ہوئے دیوانہ وار دریا میں کود گیا۔ اس نے دیکھا سوہنی کی لاش تیرتی ہوئی اس کے قریب آ رہی تھی۔ وہ پوری طاقت صرف کر کے تیرتا ہوا اس کی طرف بڑھا اور لاش کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ اس کے ساتھ ہی دونوں کو دریا کی بپھرتی ہوئی لہروں نے موت کی وادی میں پہنچا دیا۔ اس طرح سوہنی اور مہینوال دونوں ہمیشہ کے لیے موت کی آغوش میں چلے گئے لیکن دریائے چناب کی جن لہروں نے ان دو پیار کرنے والوں کو نگلا تھا، وہ آج بھی ان کی محبت کے گیت گا رہی ہیں۔

مرزا صاحباں

پنجاب کی عوامی داستانوں میں ہیر رانجھا کے بعد مرزا صاحباں کی داستان کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہے۔ یہ کہانی رزمیہ ہے اور اس میں پنجاب کی تہذیب و ثقافت' وہاں کے رسم و رواج اور طور طریقوں کے علاوہ لوگوں کے مزاج کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس المیہ اور رزمیہ کہانی کی مقبولیت صرف دیہات تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ شہروں کے پڑھے لکھے اور جدید تہذیب سے آشنا لوگوں میں بھی اسی طرح معروف ہے۔ اس کہانی کے ڈانڈے بھی کسی نہ کسی طرح ہیر اور رانجھا کی کہانی سے جا ملتے ہیں کیونکہ اس داستان کی ہیروئن صاحباں کا تعلق بھی ہیر کی طرح سیالوں سے تھا اور یہ عشقیہ عوامی کہانی بھی علاقہ بار سے متعلق ہے۔ یہی نہیں بلکہ مرزا اور صاحباں کے عشق کا واقعہ بھی جھنگ ہی کے قریب واقع ہوا تھا۔

یہ مغل شہنشاہ شاہجہاں کا عہد تھا جب جھنگ سے شمال کی طرف تقریباً بارہ تیرہ میل کی دوری پر ایک قصبہ کھیوا آباد تھا۔ یہاں مانی سیال اور چندھڑ سیال رہتے تھے جن کا سربراہ یا سردار ایک بڑا زمیندار کھیوا خان تھا اور اسی کے نام سے یہ قصبہ مشہور تھا۔ اسی کھیوا خان کی ایک

بیٹی تھی جس کا نام صاحباں تھا جو اس قدر حسین تھی کہ صرف قصبے ہی میں نہیں دور دور تک اس کے حسن کی شہرت تھی۔ صاحباں کے دو بھائی تھے جن میں ایک کا نام شمیر خان تھا اور دوسرے کا نام میر تھا اور یہ دونوں اپنے علاقے کے جوانوں میں دلیری اور بہادری میں مشہور تھے۔ صاحباں اپنے بھائیوں سے چھوٹی تھی اور جس روز وہ پیدا ہوئی تھی وہ منگل کا دن تھا۔ اس کی پیدائش پر پورے قصبے میں بڑی خوشی منائی گئی تھی کیونکہ یہ سیالوں کے سردار کھیوا خان کے گھر پیدا ہوئی تھی اس لیے تمام لوگ اپنے سردار کی خوشیوں میں برابر کے شریک تھے۔

قصبہ کھیوا سے تقریباً چالیس کوس یعنی ساٹھ باسٹھ میل کے فاصلے پر ایک اور قصبہ دانا آباد واقع تھا جو دریائے راوی کے کنارے آباد تھا۔ دانا آباد میں کھرل جاٹوں کے لوگ بس رہے تھے، جن کا سردار ونجھل نام کا ایک کھرل جاٹ تھا، جس کا نام بعض تذکروں میں بنجل بھی لکھا ملتا ہے۔ اسی ونجھل کا بیٹا مرزا خان تھا جو اپنے بھائیوں میں چھوٹا تھا۔ مرزا خان کی خوبصورتی تو اپنی مثال آپ تھی لیکن جب وہ بڑا ہوا تو اس کی بہادری کے چرچے بھی قریب و دور تک پھیل گئے تھے۔ اسی سردار ونجھل کے ساتھ سیالوں کے سردار کھیوا خان کی بہن بیاہی ہوئی تھی۔ اس طرح کھیوا خان رشتے میں مرزے کا ماموں لگتا تھا اور صاحباں اس کی ماموں زاد تھی۔ یہی دونوں کردار اس عشقیہ رزمیہ اور المیہ عوامی کہانی کے مرکزی کردار ہیں۔

مرزا خان چونکہ اپنے بھائیوں سے چھوٹا تھا پھر غیر معمولی طور پر خوبصورت تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کھرلوں کے سردار کا بیٹا تھا اس لیے وہ نہ صرف اپنے گھر بھر کا چہیتا تھا بلکہ پورے قصبے میں ہر شخص اس سے پیار کرتا تھا۔ وہ ابھی بہت چھوٹا تھا کہ ایک روز سردار ونجھل نے اپنی بیوی سے مشورہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہ مرزے خان کو کچھ عرصہ کے لیے اس کے ماموں کے پاس بھیج دیں۔ وہ وہاں رہ کے تھوڑا بہت پڑھ لکھ بھی لے گا۔"

بھلا بیوی کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا، وہ بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بولی۔

"اچھا ہے۔ وہاں صاحباں بھی ہے او دونوں اکٹھے تعلیم حاصل کر لیں گے یہاں تو یہ ہمارے لاڈ پیار کی وجہ سے پڑھ نہیں سکے گا۔"

اس طرح مرزا خان ابھی بہت چھوٹا تھا جب اسے سردار کھیوا خان کے ہاں بھیج دیا گیا۔ اسی قصبے میں مرزے کی ایک خالہ بیبو بھی رہتی تھی جب کہ ماموں کے گھر کے دروازے تو اس کے لیے کھلے تھے جو اپنے قبیلے کا سردار ہونے کے علاوہ ایک بہت بڑا زمیندار تھا جس کو دور و نزدیک علاقے میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مرزا خان اپنے ماں باپ کے فیصلے کے مطابق دانا آباد سے کھیوا میں اپنے ماموں کے گھر پہنچ گیا اور وہاں پلنے بڑھنے لگا۔ اس وقت کے رواج کے مطابق مرزا خان اور صاحباں' دونوں کو پڑھنے کے لیے مسجد میں ڈال دیا گیا' جہاں وہ دوسرے بچوں کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے لگے' دونوں چونکہ بہت خوبصورت تھے' جب پڑھنے کے لیے مسجد جاتے تو جو بھی انھیں دیکھتا حیران رہ جاتا۔ اللہ نے دونوں کو بے مثال حسن عطا کیا تھا۔

دونوں ایک ساتھ پڑھ رہے تھے اور ایک ساتھ بڑھ رہے تھے۔ جوں جوں وہ عمر کی منزلوں میں آگے بڑھنے لگے اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کی خوبصورتی بھی دوچند ہونے لگی۔ اب ان کی معصومیت آہستہ آہستہ محبت کا روپ دھارتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ یہ محبت ایک دوسرے کو اپنانے کی حد تک پہنچ گئی تھی اور اب وہ ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہ رہ سکتے تھے۔ دونوں جوانی کے قریب پہنچ چکے تھے اور ان کا پیار عشق کی راہوں پر چل نکلا تھا۔ ادھر تو یہ آپس میں ہمیشہ ساتھ نبھانے کے قول و قرار کر رہے تھے اور ادھر ان کی محبت زیادہ عرصہ تک چھپی نہ رہ سکی۔ ایک تو ان دونوں کی خوبصورتی' پھر اس پر نوجوانی کی آمد کا نیا نیا رنگ' اس کے علاوہ دونوں کی چاہت میں ڈوبی ہوئی نظریں' نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی محبت کے چرچے ہونے لگے۔ صاحباں کے حسن کا عالم تو یہ تھا کہ بقول شاعر ایک روز صاحباں پنساری کی دکان پر جب تیل لینے گئی تو پنساری اس کا حسن دیکھ کر ترازو پکڑنا بھول گیا اور اسے باٹوں کا شمار یاد نہ رہا۔ بنیا ایسا مسحور ہوا کہ اس نے برتن میں تیل ڈالنے کی بجائے شہد ڈال دیا۔ جب قصبے

میں ان کی محبت کے چرچے ہونے لگے تو ان کے گھر والے بھی چونکے۔ کھیوا خان کی بیوی نے ایک روز کہا۔

"تمہیں معلوم ہے' لوگ مرزا اور صاحباں کے بارے میں کیا کیا باتیں کر رہے ہیں۔؟"

"ہاں مجھے بھی کچھ پتا چلا ہے۔"

کھیوا خان کے اس جواب پر بیوی کہنے لگی

"ابھی بات زیادہ نہیں پھیلی۔ میری مانو تو مرزے کو اس کے ماں باپ کے پاس دانا آباد واپس بھیج دو!"

"میں بھی سوچ رہا ہوں۔ بہتر یہی ہے کہ اسے اب دانا آباد بھیج دیا جائے۔"

چنانچہ مرزے کو واپس دانا آباد میں اس کے والدین کے پاس بھیج دیا گیا اور اس قصے کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی خاطر صاحباں کی شادی کا سوچا جانے لگا۔ اگرچہ مرزا اور صاحباں کی بچپن میں منگنی کر دی گئی تھی۔ اس لیے مرزے کے گھر والے مطمئن تھے۔ اس دوران میں جب بھی مرزا اپنے گھر ملنے جلنے کے لیے جاتا تھا تو وہ یہی سوچتے تھے کہ وہ اپنے ہونے والے سسرال میں رہ رہا ہے جو اس کا ننھیال بھی ہے' لیکن اب مرزے کو واپس بھیجنے کے بعد کھیوا خان کی نیت بدل گئی اور اس نے اپنے قبیلے کے ایک نوجوان طاہر خان سے صاحباں کی سگائی کر دی۔ اب کھیوا خان اور اس کی بیوی کی یہ کوشش تھی کہ جتنی جلدی ہو سکے' بیٹی کی شادی کر کے اسے رخصت کر دیا جائے۔

مرزا خان اب بھرپور جوان ہو چکا تھا۔ جس طرح اس کی خوبصورتی کی دور دور تک شہرت تھی اسی طرح اس کی بہادری اور دلیری بھی اپنی مثال آپ تھی۔ گھڑسواری اور نیزہ بازی میں تو وہ اس قدر ماہر تھا کہ دوسرے نوجوان اس پر رشک کرتے تھے۔ اس کی گھوڑی کا نام بکی تھا جسے بعض داستان نگار شاعروں نے نیلی بھی لکھا ہے' یہ اپنی برق رفتاری میں ثانی نہیں رکھتی تھی۔ مرزا ایک تو کھرلوں کے سردار ونجھل کا بیٹا تھا جس کی زمینیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور دوسرا اسے اپنی خوبصورتی و جوانی پر بڑا گھمنڈ تھا۔ وہ اپنی بکی پر سوار ہو کے

گھومتا رہتا تھا اور جہاں کہیں نیزہ بازی اور تیر اندازی کے مقابلے ہوتے یا نوجوان گھڑسواری کے مظاہرے کے لیے جمع ہوتے وہاں سب سے آگے نظر آتا۔ اگرچہ اسے کھیوا سے دانا آباد آئے ہوئے کافی عرصہ گزر چکا تھا مگر وہ اس دوران صاحباں کو بھولا نہیں تھا بلکہ اس کی محبت پہلے سے بھی کہیں زیادہ ہو گئی تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے کہ صاحباں ایک لمحے کے لیے بھی اس کے دل و دماغ سے محو نہ ہوئی تھی۔ اس عرصے میں وہ کسی نہ کسی طرح صاحباں کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہتا تھا' اس طرح اس سے بے خبر نہیں تھا۔ پھر یہ بھی تھا کہ اب وہ اپنے باپ کی سرداری کے معاملات میں بھی ہاتھ بٹانے لگا تھا' اس میں اسے تھوڑی بہت مصروفیت بھی ہو گئی تھی مگر پھر بھی صاحباں ہر وقت اس کے دل میں زندہ رہتی تھی۔

دوسری طرف صاحباں کے والدین نے اس کی شادی کی تاریخ طے کر دی تھی اور شادی کا دن قریب آ رہا تھا۔ گھر بھر میں شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں اور صاحباں اس فکر میں گھلی جا رہی تھی کہ وہ دن آنے والا ہے جب طاہر خان آ کر اسے بیاہ لے جائے گا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کسی طرح مرزے تک یہ خبر پہنچا دے۔ کوئی ایسا وسیلہ ہاتھ آئے کہ وہ اپنی شادی کے متعلق مرزے کو باخبر کر دے۔ یہی کچھ سوچ سوچ کر دل ہی دل میں غم زدہ ہو رہی تھی اور چھپ چھپ کر آنسو بہاتی رہتی تھی اسے اچھی طرح یاد تھا کہ مرزے نے جاتے وقت کہا تھا' میری آس کبھی نہ چھوڑنا۔ میں جب تک زندہ ہوں تمہارا ہوں اور ایک نہ ایک روز ضرور تمہارے پاس آؤں گا۔ اس بات کا تو اسے بھی یقین تھا کہ مرزا یقیناً اس کو بھولا نہیں ہو گا لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی' اسے شادی کے بارے میں بتانا ضروری ہے۔ ادھر شادی کی تاریخ قریب سے قریب تر آتی جا رہی تھی۔ اور پھر جب شادی سر پر آ گئی تو وہ واقعی بہت پریشان ہو گئی۔ دوسرے روز طاہر خان کی بارات آنے والی تھی۔ اس نے خاموشی سے قصبے کے کرموں برہمن کو بلایا جسے بعض لوگوں نے کمّوں بھی تحریر کیا ہے۔ اس نے اسے کہا۔

"اے کرموں برہمن! تم کبھی میرے کام نہیں آئے۔ اب میرا ایک کام کر دو' میں

زندگی بھر تمہارا احسان نہ بھولوں گی۔"
"مگر مجھے یہ تو بتاؤ کام کیا ہے؟"
برہمن کرموں کے اتنا کہنے پر صاحباں نے اسے بتایا۔

"کسی طرح مرزے خان تک یہ خبر پہنچا دو کہ کل مجھے چندھڑ بیاہنے آ رہے ہیں' وہ مجھے لے جائیں گے۔ اگر تم بعد میں آئے تو تمہارا آنا کس کام کا۔؟"
پھر وہ اسے لالچ دیتے ہوئے بولی۔
"تمہیں بھی کاٹھی اور لگام سمیت ایک گھوڑی دوں گی۔ تمہیں سونا بھی دوں گی اور دودھ پینے کے لیے ایک بھینس اور اس کے ساتھ ایک ہل انعام میں دوں گی۔ اگر تم نے میرا یہ کام کر دیا تو میں ساری عمر تمہارا یہ احسان نہ بھولوں گی۔؟"

کرموں یہ بات اچھی طرح جانتا اور سمجھتا تھا کہ صاحباں کوئی عام لڑکی نہیں ہے' وہ سردار کھیوا خان کی چہیتی بیٹی ہے اور میں صرف ایک غریب برہمن ہوں.جس کی عمر اس کے باپ سے بھی زیادہ ہے' اس کے باوجود وہ اپنے آپ میں نہیں رہا تھا۔ صرف ایک کرموں کی بات نہ تھی جو بھی اس کا حسن اور جوانی دیکھتا اپنے حواس میں نہیں رہتا تھا' اسی لیے جب صاحباں نے یہ کہا تو وہ بولا۔
"سچی بات یہ ہے کہ یہاں سے دانا آباد کا فاصلہ چالیس کوس کا ہے۔ اتنی دور کون آ جا سکتا ہے۔!"
اس کے ساتھ ہی اس نے کہا۔
"میں نے سنا ہے مرزا خان کے گھر میں پہلے ہی ایک بیوی ہے۔ اگر تم اس سے شادی کرو گی تو تمہارے حصے میں اس کی آدھی جائیداد آئے گی۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اس جاٹ کی دوستی بھول جاؤ اور مجھ سے دوستی کر لو۔!"
صاحباں' کرموں کی بات سن کر چمک کر بولی۔
"تمہارے منہ میں خاک۔ تمہاری یہ جرأت۔ جی چاہتا ہے تمہارے منہ پر ایسا تھپڑ رسید

کروں کہ تمھاری عقل ٹھکانے آجائے۔ میں تمھاری پوتی کی عمر کی ہوں اور تم مجھے اپنی محبوبہ بنانے بیٹھ گئے ہو۔!"

اس نے غصے میں اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"اگر میرے باپ سردار کھیوا خان کو پتا چل جائے تو وہ تمھیں قصبے سے نکلوا دے گا اور میرے بھائی خان شمیر کو معلوم ہو گیا تو وہ تمھیں جان سے مار ڈالے گا۔ میرے باپ کی کچہری لگنے دے میں تمھیں زنجیروں میں جکڑ کے پیش کراؤں گی۔ پھر تمھیں پتا چلے گا مجھ سے عشق کرنے کا۔"

اب تو کرموں برہمن بہت گھبرایا۔ صاحباں کو غصے میں دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگا۔ وہ خوفزدہ ہو گیا کہ کہیں واقعی صاحباں اپنے باپ یا بھائی کو نہ بتا دے۔ اگر انھیں پتا چل گیا کہ میں نے ایسی بات کہی ہے تو وہ میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔ وہ کانپتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔

"صاحباں! خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں تم سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہوں۔ دراصل افیم کے نشے میں میری عقل ٹھکانے نہیں رہی تھی۔ مجھ غریب کے سفید بالوں پر ترس کھاؤ اور مجھے معاف کر دو۔!"

وہ بڑی عاجزی سے منت سماجت کرتے ہوئے کہہ رہا تھا'

"تم مجھے جہاں بھیجو گی' جاؤں گا۔ جو بھی حکم دو گی' بجالاؤں گا!"

صاحباں کو اس پر رحم آگیا۔ یوں بھی وہ اس وقت مجبور تھی' اسے کرموں سے کام لینا تھا اس لیے اس نے کرموں کو معاف کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا' اب تم جاؤ۔ اور جس قدر جلد ہو سکے دانا آباد پہنچ کر مرزے کو میری شادی کی خبر پہنچاؤ۔"

چنانچہ کرموں برہمن اسی وقت خاموشی سے سیالوں کے قصبے سے نکل کھڑا ہوا اور دانا آباد کی طرف چل دیا تاکہ مرزے کو صاحباں کا پیغام پہنچائے۔ جیسے ہی وہ دوسرے روز دانا آباد پہنچا اس نے پہلا کام یہ کیا کہ سیدھا مرزے کے پاس گیا اور اسے بتایا۔

وہاںساندل بار والے صاحباں کو بیاہ لے جانے والے ہیں اور تم یہاں بے خبر بیٹھے ہو۔ مجھے تمھارے پاس صاحباں نے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ اگر تم میری شادی کے بعد آئے تو تمھارے آنے کا کیا فائدہ ہو گا۔؟"

مرزے نے جب کرموں سے صاحباں کی شادی کی خبر سنی تو دھک سے رہ گیا۔ اسے یہ گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ اس کی بچپن کی منگنی کو نظرانداز کر کے صاحباں کی کہیں شادی کر دی جائے گی۔ وہ دل میں سوچنے لگا' واقعی میں صاحباں کی طرف سے بے خبر ہو گیا ہوں۔ وہ دل میں کیا سوچتی ہو گی۔ اس نے کھیوا جانے کی تیاری کرنا شروع کر دی۔ جب اس کے پاس کرموں برہمن پہنچا تھا' اس روز اس کی اپنی بہن چھتی کی شادی ہو رہی تھی اور گھر میں مہمانوں کا ہجوم تھا۔ یہ شادی ساندل بار کے بھٹیوں میں ہو رہی تھی اور بارات آنے والی تھی۔ مرزا خان جو تھوڑی دیر پہلے اپنی بہن کی شادی کے کاموں میں مصروف تھا' وہ فوراً سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اپنی گھوڑی کی طرف بڑھا اور اس پر زین کسنے لگا۔ اس کی بہن چھتی نے دیکھا تو پوچھا۔

"مرزا تم کہاں جانے کی تیاری کرنے لگے۔؟"

جواب میں مرزے نے بتایا کہ "کھیوا میں صاحباں کی شادی ہو رہی ہے' اس نے پیغام بھیجا ہے اور میں وہاں جا رہا ہوں۔"

اس پر اس نے آگے بڑھ کے روکا اور کہا۔

"بھائی مت جاؤ۔ اور یہاں میری شادی کا انتظام کرو تم اپنی بہن کی شادی چھوڑ کر جا رہے ہو۔۔ ایسا مت کرو اور آج کا دن رک جاؤ۔۔ میرا نکاح پڑھوا کے کل چلے جانا۔"

جواب میں مرزا بولا۔

"نہیں بہن میرا جانا بہت ضروری ہے۔ مجھے صاحباں نے بلایا ہے اور اگر میں نہ گیا تو بے وفا کہلاؤں گا۔ لوگ سارى عمر کھرلوں کو طعنے دیں گے۔"

ماں نے اس کے جانے کا سنا تو اسے روکتے ہوئے کہنے لگی۔

"بیٹا! سیالوں کی راہ پر مت جا۔ اس راہ میں تو کانٹے ہی کانٹے ہیں' یاد رکھ' سیالوں کی عورتیں جادوگرنیاں ہوتی ہیں۔ وہ تمہارا کلیجہ نکال کے کھا جائیں گی۔ دیکھو بیٹا! اس بڑھاپے میں مجھے مصیبت میں مت ڈال۔ اپنی ماں کا کہا مان اور اپنی بہن کا کاج سنوار۔ کھیوا جا کر اپنی جان مت گنوا!"

مرزے کے باپ کو خبر ہوئی تو وہ بھی بھاگا بھاگا آیا اور مرزے سے کہنے لگا۔

"اے بیٹے باز آ جا۔ عورتوں کی دوستی بری چیز ہے یہ پہلے تو ہنس ہنس کر دوستی کر لیتی ہیں اور پھر رو کر ساری بات بتا دیتی ہیں۔ یاد رکھو۔ جس گھر میں دوستی ہو' اس گھر میں کبھی قدم نہیں رکھنا چاہیے۔ دانشمندوں کی عزت بڑی چیز ہے' اگر ایک بار چلی جائے تو پھر کبھی ہاتھ نہیں آتی۔ راجے چھنی ہوئی سلطنتوں پر' چور خود کی گرفتاری پر' عورتیں اپنے لٹے ہوئے روپ پر اور مور اپنے پاؤں کی بدصورتی پر ہمیشہ آنسو بہاتے ہیں!"

ماں نے اسے سمجھاتے ہوئے ایک بار پھر کہا۔

"بیٹا! سانپوں اور شیروں سے دوستی مت کرو۔۔۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ کڑھاؤ میں تیل ابل رہا ہے اور آگ کے شعلے ہمارے سر کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ اپنے ارادے سے باز آ جاؤ۔!"

لیکن مرزے نے سب کے جواب میں یہی کہا۔

"اگر صاحباں مجھ سے بیاہی ہوتی تو میں اسے چھوڑ دیتا لیکن وہ میری منگیتر ہے اس لیے میں اسے ہرگز نہیں چھوڑ سکتا۔ اگر میری منگیتر کو کوئی اور بیاہ کے لے گیا تو کھرلوں کی عزت کو بٹا لگ جائے گا اور میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ میں غیرت مند سردار ونجھل کا بیٹا ہوں' میں اپنے خاندان کی عزت پر حرف نہیں آنے دوں گا۔ مجھے سیالوں کی بیٹی صاحباں نے بلا بھیجا ہے' میں ضرور جاؤں گا۔۔۔ مجھے مت روکو!"

اس نے اپنی ماں' باپ اور بہن کو الوداعی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کھیوے خان کی بیٹی نے میرا دل چھین لیا ہے۔ وہ بہت حسین ہے۔ اس کی زلفیں گز گز

بھر لمبی ہیں۔ وہ اگر مجھے زہر کا پیالہ بھی دے تو میں خوشی سے پی لوں گا۔ وہ اگر میرے سینے میں برچھی بھی مار دے تو میں منہ سے اف تک نہیں کروں گا۔ تم لوگ مجھے مت روکو۔ مجھے اس نے بلایا ہے جو میری منگیتر ہے۔"

سب زور لگا بیٹھے مگر مرزا رکنے پر راضی نہ ہوا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ وہ اپنی ضد پر اڑا ہوا ہے اور اسے روکنا ممکن نہیں ہے تو اس کا باپ آگے بڑھا۔ اس نے اپنے لاکھوں میں ایک جوان بیٹے کے کندھے پر تھپکی دی اور کہا۔

"بیٹے! اگر تم جا ہی رہے ہو تو یاد رکھنا کھرلوں کی لاج تمھارے ہاتھ میں ہے۔ اب صاحباں کے بغیر دانا آباد واپس نہ آنا۔ ہم اس وقت کا انتظار کریں گے جب تم صاحباں کے ساتھ اپنے دروازے میں قدم رکھو گے۔ تمھارے باپ کی عزت تمھارے ہاتھ میں ہے' مجھے امید ہے تم اس پر داغ نہیں لگنے دو گے۔"

آگے سے مرزے نے چھاتی تان کر جواب دیا۔

"میں سردار ونجھل کا بیٹا ہوں۔ سچ کہتا ہوں کہ میں اپنے قبیلے اور خاندان کی روایات کو ہمیشہ کے لیے زندہ کر دوں گا۔ اے میرے باپ اور کھرلوں کے سردار' تمھارے بیٹے مرزا خان اور اس کی بیوی صاحباں کی کہانی دنیا کے چاروں کونوں میں پھیل جائے گی۔"

اس نے اتنا کہا' ایک بار الوداعی نظروں سے سب کی طرف دیکھا اور اپنی برق رفتار گھوڑی بکی پر سوار ہو گیا۔ اس نے بلند آواز میں خدا حافظ کہا اور بکی کو ایڑ لگا دی۔ گھوڑی کو ایڑ لگانے کی دیر تھی کہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ پھر چند ہی لمحوں کے بعد دانا آباد اس سے اس قدر دور پیچھے رہ چکا تھا کہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

مرزا سفر میں نہ کہیں رکا اور نہ سستایا' وہ بکی کو سرپٹ دوڑاتا ہوا سیدھا کھیوا پہنچ گیا۔ ایک شیر جوان کی طرح وہ قصبے میں داخل ہوا اس کے کاندھے پر سبز کمان تھی' ترکش میں تیر تھے اور اس کی نظروں میں عقاب کی سی چمک تھی' وہ بستی میں دائیں جانب سے داخل ہوا اور سیدھا اپنی خالہ بیبو کے گھر پہنچ گیا جو اس وقت چرخہ کات رہی تھی۔ اس نے جاتے ہی

بیبو کو چرخہ کاتنے سے روک دیا اور اسے چار مہریں دے کر کہا۔
"اگر تم واقعی میری اچھی خالہ ہو تو ابھی جاؤ اور صاحباں کو بتادو کہ میں آگیا ہوں۔"

بیبو اسی وقت بھاگی بھاگی گئی اور صاحباں کے گھر پہنچ گئی۔ اس وقت صاحباں سہیلیوں میں گھری ہوئی تھی اور گھر میں شادی کی چہل پہل کا سماں تھا۔ اس نے اسے اشارے سے الگ بلا کر آہستگی سے کہا۔

"صاحباں! تمہیں معلوم ہے۔ اس وقت بیبو کے گھر کون آیا ہے۔ وہ ایک پگڑی والا خوبصورت نوجوان ہے۔ جاؤ' جلدی سے اسے اپنا چہرہ دکھاؤ۔"

جونہی صاحباں نے بیبو سے یہ بات سنی تو اس کا مرجھایا ہوا چہرہ کھل اٹھا۔ اسے تو پہلے ہی یقین تھا کہ مرزا اس کا پیغام سنتے ہی ضرور آئے گا۔ اور وہ آگیا تھا۔ اس نے اپنی ایک دو رازدار سہیلیوں کی مدد سے بھیس بدلا اور چھپتی چھپاتی بیبو کے ساتھ اس کے گھر آگئی اور اس طرح دونوں برسوں کے بچھڑے ہوئے مل گئے' آپس میں باتیں کیں' دکھ سکھ بیان کیے' گلے شکوے کرتے رہے' اور جب کچھ دیر باتیں کر چکے تو صاحباں نے مرزے سے کہا۔

"تم نے یہ کیا بیوقوفی کی ہے جو اس چھوٹی سی گلی میں اس تنگ گھر میں آ ٹھہرے ہو۔ اگر میرے بھائی یا باپ کو پتا چل جائے تو تم یہاں سے بھاگ بھی نہ سکو گے۔ وہ تمہاری جان کے دشمن ہیں۔"

پھر وہ اس سے کہنے لگی۔

"اگر تمہارے سر پر پگڑی ہے تو مجھے دانا آباد لے چلو' ورنہ وہ تمہیں مار ڈالیں گے اور مجھے کل چندھڑ بیاہ کر لے جائیں گی جو میری موت ہوگی۔"

صاحباں وہاں زیادہ دیر تک رک نہیں سکتی تھی کیونکہ گھر میں اگر کسی کو پتا چل جاتا تو طوفان اٹھ کھڑا ہوتا۔ اس نے مرزے کے ساتھ کوئی رازدارانہ بات کی اور جس طرح چھپ چھپا کے آئی تھی اسی طرح خاموشی سے بیبو اسے واپس گھر چھوڑ آئی اور کسی کو کانوں کان یہ خبر نہ ہوئی کہ وہ مرزے سے مل آئی ہے۔ اس کے جانے کے بعد مرزا کچھ دیر تک خیالات میں

کھویا کوئی تجویز سوچتا رہا اور پھر اپنی خالہ کے گھر سے سیدھا ایک لوہار کے پاس گیا اور اس سے کہا۔

"تم جتنے پیسے مانگو کے میں دوں گا' مجھے جلدی سے لوہے کی ایک ہزار کھونٹیاں تیار کر دو۔ میں تمہیں خوش کر دوں گا مگر یہ کھونٹیاں مجھے آدھی رات تک تیار مل جانی چاہئیں۔"

اور پھر جیسے ہی رات کا اندھیرا گہرا ہوا تو وہ پہلے لوہار کے پاس گیا جہاں لوہے کی کھونٹیاں تیار تھیں۔ اس نے وہ کھونٹیاں لیں اور کھیوا خان کے گھر کی پچھلی طرف پہنچ گیا۔ اس نے مکان کی پچھلی طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دیوار میں کھونٹیاں گاڑ دیں تاکہ صاحباں ان کے سہارے چھت سے نیچے آسکے اس کے ساتھ ہی وہ واپس بیبو کے پاس آیا اور اپنی گھوڑی لے کر دوبارہ وہاں پہنچ گیا جہاں اس نے کھیوا خان کے مکان کے پچھواڑ دیوار میں کھونٹیاں گاڑی تھیں۔ وہ بکی کو لے کر وہاں صاحباں کا انتظار کرنے لگا ادھر مقررہ وقت پر صاحباں سب سے چھپ کر کسی نہ کسی طرح اپنے مکان کی چھت پر جا پہنچی۔ اس نے دیکھا تو مکان کی پچھلی طرف مرزا اپنی تیز رفتار گھوڑی پر سوار موجود تھا۔ وہ خاموشی سے دیوار میں گڑھی ہوئی کھونٹیوں پر سنبھل سنبھل کے پاؤں جماتی ہوئی آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگی۔ جب بڑی احتیاط سے اتر رہی تھی تو اتفاق سے ایک کھونٹی سے اس کی چادر اٹک کر پھٹ گئی جس پر وہ بولی۔

"ذرا رک جاؤ' میری چادر کھونٹی میں الجھ کر پھٹ گئی ہے۔"

اس پر مرزے نے کہا۔

"یہ وقت چادر پھٹنے پر افسوس کا نہیں ہے۔ فکر مت کرو' میں دانا آباد پہنچتے ہی تمہیں کئی چادریں لے دوں گا۔ جلدی سے بکی پر سوار ہو جاؤ اور میری جان کی خیر مناؤ۔"

جب صاحباں مرزے کے ساتھ گھوڑی پر بیٹھ گئی تو کہنے لگی۔

"مرزے! تمہاری گھوڑی تو بڑی دبلی پتلی ہے۔ اس کی تو ہڈیاں نظر آ رہی ہیں۔ اس کی کھال اس قدر خشک ہے کہ ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے اس کی پیٹھ کو کوؤں نے نوچا ہو۔ اگر تمہارے

پاس کوئی صحت مند اور طاقتور گھوڑا نہیں تھا تو کسی اور سے مانگ لاتے؟ میرے باپ کھیوا خان کے گھوڑے بڑے پلے ہوئے ہیں' وہ عورت کو اغوا کر کے لے جانے والے کو چھوڑیں گے نہیں اور تمھیں جنگل میں موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔"

مرزا اپنی پیاری اور پسندیدہ گھوڑی کی برائی نہ سن سکا' اس نے جواب میں کہا۔

"صاحباں! میری بکی کی برائی مت کرو۔ اس کے کان لمبے' سم پتلے اور دم کالی ہے۔ تم اسے دبلی پتلی دیکھ کر فکر نہ کرو' یہ بڑی طاقتور ہے۔ یہ میرے باپ کے ہرے بھرے کھیتوں میں آزادانہ چرتی رہتی ہے۔ میں اپنی بکی کو دس بھینسوں کا گھی کھلا چکا ہوں۔ تمھیں اس کی طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔ یہ پاتال میں جا سکتی ہے اور آسمان پر چڑھ سکتی ہے۔ اس کی برائی مت کرو اور سنبھل کے بیٹھ جاؤ تاکہ میں تمھیں اس کی برق رفتاری دکھا سکوں۔"

اس طرح جب مرزا کے ساتھ صاحباں سنبھل کر گھوڑی پر بیٹھ گئی تو وہ آہستہ آہستہ قصبے سے باہر آئے اور جونہی باہر کھلے راستے پر پہنچے' اس نے بکی کو ایڑ لگائی اور وہ بجلی کی سی تیزی سے دوڑنے لگی اس طرح مرزا صاحباں کو لے کر دانا آباد کی طرف چل دیا۔

ادھر تو یہ ہوا اور دوسری طرف کا منظر یہ تھا کہ اس وقت کھیوا خان کے دروازوں کے باہر خوشیوں کے ڈھول بج رہے تھے اور شادی کی رسمیں ریتیں ادا کی جا رہی تھیں۔ گھر کے اندر ننھیال والے بیٹھے تھے اور گھر سے باہر قریب دور سے آنے والے مہمان تھے جب مرزا' صاحباں کو نکال کے لے گیا تو ساری مٹھائیاں تھالیوں میں چنی رہ گئیں اور عطر کی شیشیاں بھری کی بھری رہ گئیں۔ زیورات پٹاریوں میں جوں کے توں رہ گئے اور چوڑیوں کے ساتھ ہار سنگار کا سارا سامان صندوقوں میں دھرا رہ گیا۔ تھالی میں اُبٹن پڑا تھا اور دروازے کے باہر بارات بیٹھی تھی۔ اس وقت تک صاحباں کے بھاگ جانے کا کسی کو علم نہ تھا کہ اتنے میں صاحباں کے ماموں فیروز ڈوگر نے آ کر بلند آواز میں کھیوا خان کو پکارا اور جب کھیوا خان اس کے پاس آیا تو اس نے اپنے سر پر دو ہتڑ مارتے ہوئے کہا۔

"مرزا خان' صاحباں کو بھگا کر لے گیا ہے۔ وہ تمام سیالوں کی عزت مٹی میں ملا گیا ہے

اور انھیں زندگی بھر کے لیے بدنامی کا داغ دے گیا ہے"۔

جیسے ہی فیروز ڈوگر نے یہ بری خبر دی اس کے ساتھ ہی سارے گھر میں ہلچل مچ گئی' کھیوا خان اور صاحباں کے بھائیوں نے چیخ کر اپنے آدمیوں سے کہا۔

فوراً مرزا کا پیچھا کرو اور اسے دانا آباد پہنچنے سے پہلے ہی پکڑ کے موت کی نیند سلا دو!"

بس اب کیا تھا؟ کسی نے تلوار پکڑی' کسی نے نیزہ سنبھالا' کسی نے برچھی لی' کوئی لاٹھی لے آیا اور کوئی تیر کمان لے کر دوڑا۔ اس طرح دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے لوگ مسلح ہو کر گھوڑوں پر سوار ہوئے اور للکارتے ہوئے مرزا صاحباں کے تعاقب میں چڑھ دوڑے۔

بڑے بوڑھے کہتے ہیں' عشق انسان کو اس طرح تباہ کر دیتا ہے جیسے برف درختوں کو تباہ کرتی ہے۔ چور کو کبھی گہری نیند نہیں آتی اور عاشق کی بھوک اڑ جاتی ہے۔ مرزا عاشق بھی تھا اور عورت کو چرا کے بھی لے جا رہا تھا لیکن یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ اس پر نیند کا غلبہ ہو گیا۔ دراصل ایک تو وہ دو راتوں سے مسلسل جاگ رہا تھا اور دن میں بھی اسے سونے کا موقع نہیں ملا تھا' پھر وہ لمبا سفر طے کر کے آیا تھا اور اس وقت بھی بغیر ستائے صاحباں کو لے کر سفر پر رواں تھا۔ عالم یہ تھا کہ آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی وہ بار بار اونگھ جاتا تھا۔ اس نے ایک جگہ اپنی گھوڑی کو روکا' اس کی پیٹھ پر سے اترا اور ایک جنڈ کے درخت کے نیچے لیٹتے ہوئے بولا"۔

"مجھے سخت نیند آ رہی ہے میں چند گھڑیاں سولوں تو پھر آگے چلتے ہیں۔

لیکن صاحباں نے اسے روکا اور کہا

"مرزے یہاں مت رکو۔ سیال یقیناً ہمارا پیچھا کر رہے ہوں گے۔ پہلے مجھے دانا آباد لے چلو اور وہاں جا کے جس قدر چاہے سو لینا۔ اس طرح راستے میں سونا اپنی موت کو دعوت دینا ہے۔ اگر تمھیں راستے ہی میں سونا ہے تو دانا آباد کی سرحد میں داخل ہو کر سونا"۔

مگر مرزے کو اپنی بہادری اور شہہ زوری پر گھمنڈ تھا۔ اس نے کروٹ بدل کر جواب دیا۔

"صاحباں! گھبراؤ نہیں۔ دنیا کا بڑے سے بڑا بہادر بھی آ جائے تو میرا بال بیکا نہ کر سکے گا۔ مجھے

صرف چند گھڑیاں سو لینے دو۔۔۔ صرف چند گھڑیاں۔"

اس وقت صاحباں خوفزدہ ہو رہی تھی اور اس کا خوف بجا تھا کیونکہ یہ بات یقینی تھی کہ سیال ان کا پیچھا کرتے ہوئے آ رہے ہوں گے۔ وہ دل ہی دل میں ڈرتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اگر انھوں نے ہمیں پکڑ لیا تو ہمارا زندہ بچنا مشکل ہے مگر مرزا اس کی بات پر توجہ نہیں دے رہا تھا اتنے میں اسے بہت دور کئی لوگ گھوڑوں پر سوار آتے دکھائی دیے۔ اس نے مرزے کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"مرزے ہوش میں آؤ اور جاگ جاؤ۔ دیکھو' موت کا فرشتہ تیر تانے کھڑا ہے۔ اپنی موت کو دعوت مت دو' وہ دیکھو! کئی شہسوار ہمارے تعاقب میں تلواریں اور نیزے گھماتے ہوئے ہماری طرف آ رہے ہیں۔"

پھر وہ اسے اپنی محبت کا واسطہ دیتے ہوئے بولی۔

"میں ہاتھ جوڑ کے کہتی ہوں۔ خدا کے لیے جاگ جاؤ۔ اگر تمھیں آخر تک نباہ نہیں کرنا تھا تو مجھے کیوں لائے تھے؟ اب بھی موقع ہے' اٹھو اور یہاں سے نکل چلو۔"

"اس طرح وہ بار بار اسے اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر منتیں کر رہی تھی لیکن مرزا ہر بار کروٹ بدل کر پھر سو جاتا اور یہی کہتا۔"

"تم بے فکر رہو۔ کوئی سورما مرزے کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میں سیالوں کے سر کاٹ کاٹ کے رکھ دوں گا۔ میرے تیر کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا۔ میں سب کو خاک میں روند ڈالوں گا۔ بس' مجھے چند گھڑیاں سو لینے دو۔"

اس وقت صاحباں کی منت زاری بھی کام نہیں آ رہی تھی اور دوسری جانب سیالوں کے لوگ سرپٹ گھوڑے دوڑاتے ان کی طرف بھاگے چلے آ رہے تھے اور اب وہ اتنے فاصلے پر پہنچ چکے تھے کہ صاحباں انھیں صاف دیکھ سکتی تھی اس نے دیکھا تو سب سے آگے اس کا بھائی خان شمیر تھا اور وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ مرزے کے تیر کا نشانہ کبھی نہیں چوکتا' اگر اس نے اپنا ترکش اور کمان سنبھالی تو سب سے پہلے میرا بھائی اس کی زد میں آئے گا۔ اس

وقت مرزے کے ترکش میں تین سو ساٹھ تیر تھے' بعض شاعروں کے مطابق تیروں کی تعداد تین سو تھی' اور یہ بات طے تھی کہ سیالوں سے مقابلہ کے لیے مرزے کو یہ تیر کافی تھے یہی سوچ کر صاحباں کو فکر ہوئی کہ اگر یہ سارے تیر موجود رہے تو میرے بھائی خان شمیر کا بچنا محال ہے۔ اس وقت وہ مرزا خان کی محبوبہ کی بجائے خان شمیر کی بہن بن گئی تھی۔ اس کی محبت بہن بھائی کے رشتے سے شکست کھا گئی تھی۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور پھر جلدی سے اٹھ کر مرزے کا ترکش جنڈ کے درخت پر بہت اوپر ٹانک دیا جہاں مرزے کا ہاتھ نہ جا سکے' اس کی کمان کے ساتھ صرف تین تیر رہ گئے تھے۔ بعض داستان لکھنے والے شاعروں نے لکھا ہے کہ صاحباں نے ترکش کے تیر توڑ دیے تھے۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد اس نے ایک بار پھر کوشش کی کہ کسی طرح مرزا جاگ جائے کیونکہ ابھی اتنا وقت تھا کہ وہ برق رفتار بکی پر سوار ہو کر وہاں سے بچ کر نکل سکتے تھے۔ اس نے مرزے کو جھنجھوڑا اور کہا۔

"مرزے! اٹھ جاؤ۔ اب بھی وقت ہے۔ دیکھو سیال تلواریں اور نیزے لیے موت کی صورت میں آ پہنچے ہیں"!

مگر اس کی یہ آخری کوشش بھی بیکار گئی۔ اور اگر یہ کوشش کامیاب بھی ہو جاتی تو وقت نکل چکا تھا کیونکہ سیال بہت قریب آ چکے تھے اور للکارتے ہوئے ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ شور سن کر مرزا ہڑبڑا کر اٹھا' دیکھا تو سامنے سیال آ رہے تھے' وہ تیزی سے اپنی کمان کی جانب لپکا مگر جب یہ دیکھا کہ وہاں صرف تین تیر پڑے تھے اور باقی ترکش میں تھے جو جنڈ کے بہت اوپر ٹنگا ہوا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ سب کچھ صاحباں کا کیا کرایا ہے جس کی محبت پر بھائی کا پیار غالب آ گیا ہے اس نے بجلی کی سی تیزی سے اپنی کمان اٹھائی اور صاحباں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"اے صاحباں! تم نے مجھ پر ظلم کیا ہے جو میرا ترکش جنڈ پر ٹانگ دیا ہے۔ تم سیالوں سے مل گئی ہو اور میرے ساتھ اپنی موت کو بھی دعوت دی ہے۔"

اس نے ایک تیر چلے پر چڑھایا اور کہا۔

"میں پہلا تیر تیرے بھائی کو ماروں گا' دوسرا اس کے گھوڑے کی کاٹھی پر اور تیسرا تیر اس کو ماروں گا جس سے تیری منگنی ہوئی ہے۔"

اتنا کہنے کے ساتھ ہی اس نے پوری طاقت سے کمان کھینچ کر تیر چھوڑا جو سیدھا جا کر صاحباں کے بھائی خان شمیر کے گھوڑے کو لگا اور خان شمیر اپنے گھوڑے سمیت نیچے گر پڑا پیشتر اس کے کہ وہ دوسرے تیر چلاتا' اس پر تیروں کی بارش ہو گئی۔ تمام حملہ آور سیالوں کا نشانہ صرف وہی تھا ایک تیر آکر اس کو اس طرح لگا کہ وہ نیچے گر پڑا۔ اگرچہ ابھی وہ زندہ تھا مگر تیر اپنا کام کر چکا تھا۔ وہ زخمی حالت میں اٹھا اس کے جسم سے خون کا فوارہ چھوڑ رہا تھا اس نے دونوں ہاتھ اس جگہ رکھ لیے جہاں سے خون نکل رہا تھا اور جنڈ کے درخت کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ڈوبتی ہوئی نظروں سے صاحباں کو دیکھا اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"صاحباں! تم نے مجھے دھوکے سے مروا دیا۔ کاش! تم میرا ترکش ٹانگ کر مجھے بے بس نہ کرتیں۔ تم نے صرف مجھے ہی نہیں مروایا' اپنی جان بھی گنوائی ہے۔"

اور پھر ہوا بھی یہی 'تیروں کی بوچھاڑ میں مرزے نے جان دے دی اور اس کے ساتھ صاحباں کو بھی ہلاک کر دیا گیا۔ اس طرح مرزا اور صاحباں کا یہ المناک رزمیہ اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

کہا جاتا ہے کہ جب مرزے کی موت کی خبر دانا آباد پہنچی تو اس کے چچا ابراہیم نے انتقام لینے کے لیے کھرلوں کو جمع کیا اور چندھڑوں اور ماہنی سیالوں پر پوری قوت سے حملہ کر دیا یہ حملہ اس قدر شدید تھا کہ انھوں نے کھیوا اور جھنگ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ بعد میں مرزا خان اور صاحباں کی لاشیں لا کر کھرلوں کے علاقے میں دفن کر دی گئیں۔

پورن بھگت

اس داستان کا عہد گیارہویں صدی عیسوی بتایا جاتا ہے مگر رچرڈ ٹمپل نے ساتویں صدی عیسوی تحریر کیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب چمبہ اور سیالکوٹ پر ایک راجا سالباہن یا سالوان کی حکومت تھی۔ یہ راجا جب گدی پر بیٹھا تھا تو ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ انھی دنوں شہر سے باہر واقع ایک باغ میں ایک جوگی آ کر ٹھہرا جس کے ساتھ اس کے بہت سے چیلے بھی تھے۔ جیسے ہی اس جوگی نے باغ میں ڈیرے جمائے اس کے ساتھ ہی باغ میں جیسے بہار آ گئی۔ جو درخت مرجھائے ہوئے تھے وہ ہرے بھرے ہو گئے' سوکھی گھاس سرسبز ہو گئی اور باغ کے تالاب پانی سے بھر گئے۔ اس کے ساتھ ہی تمام شہر میں یہ بات پھیل گئی کہ باغ میں کوئی پہنچا ہوا جوگی آ کر ٹھہرا ہے جس کی آمد کے ساتھ ہی ہر طرف بہار کا سا سماں ہو گیا ہے۔ جونہی یہ خبر شہر میں پھیلی لوگ اپنی آرزوؤں اور مرادوں کی تکمیل کے لیے جوگی کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ یہ خبر راجا سالباہن تک بھی پہنچی' اس نے سوچا' اگر جوگی واقعی پہنچا ہوا ہے تو مجھے بھی اس کی خدمت میں حاضری دینی چاہیے' نیک اور خدا رسیدہ بزرگوں سے ملنے سے برکت ہوتی ہے۔ یہی کچھ سوچ کر ایک روز وہ بھی اپنے چند خاص مصاحبوں کو

ساتھ لے کر جوگی کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اس نے دیکھا' اس وقت جوگی آنکھیں بند کیے گیان دھیان میں لو لگائے بیٹھا تھا اور اس کے کئی ایک چیلے بھی ادھر ادھر بیٹھے تپسیا میں مصروف تھے۔ راجا نے اس کے پاس جا کر بڑی عاجزی سے سلام کیا اور جب جوگی نے آنکھیں کھول کر ایک نظر اس پر ڈالی تو راجا دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"گورو جی! میرے حق میں دعا کیجیے۔ مجھے کوئی نصیحت کیجیے۔؟"

"کچھ دیر تک جوگی خاموش بیٹھا رہا اور پھر کہا"۔

" تمھارے لیے بہتر یہ ہے کہ اودے نگر کے راجا چوڑھال کی بیٹی اچھراں کو بیاہ لاؤ۔ اللہ تمھیں اس سے ایک بیٹا عطا کرے گا جو نیک ہو گا اور تمھارا نام روشن کرے گا۔"

"راجا جوگی کو نذر نیاز پیش کر کے واپس آ گیا اور اودے نگر کے راجا کی بیٹی اچھراں سے شادی کرنے کے منصوبے بنانے لگا۔ راجکماری اچھراں بڑی حسین تھی اور اس کی خوبصورتی کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ کئی راجے مہاراجے اس سے شادی کرنے کے آرزومند تھے اور بہت سے راجکمار اسی خواہش کی تکمیل میں اپنی جانیں گنوا بیٹھے تھے۔ کیونکہ اچھراں نے شادی کے لیے بعض ایسی شرطیں لگا رکھی تھیں جن کا پورا کرنا بہت مشکل تھا۔ جو بھی یہ شرائط پورا کرنے کی کوشش کرتا' وہ کسی نہ کسی مرحلے پر اپنی جان گنوا بیٹھتا تھا۔ اسی لیے راجا سالباہن کے مصاحبوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اچھراں سے شادی کا خیال چھوڑ دے مگر وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ اس نے کہا۔

"مجھے جوگی نے کہا ہے' اس میں ضرور کوئی بھلائی ہے۔ میں اچھراں سے ضرور شادی کروں گا۔"

اور پھر ہوا بھی یہی کہ راجا سالباہن اودے نگر گیا اور اچھراں نے شادی کے لیے جو شرطیں مقرر کی تھیں اس نے سب پوری کر دیں اور اس طرح راجکماری کو بیاہ لایا۔ جب وہ واپس اپنے شہر سیالکوٹ آیا تو اس نے اپنی کامیابی کی خوشی میں جشن منانے کا اعلان کر دیا۔ اور ہر طرف لوگ اپنے راجا کی خوشیوں میں شریک ہو کر جشن منانے لگے۔ کچھ عرصہ بعد

اچھراں امید سے ہو گئی اور پھر جب بچے کی پیدائش کے دن قریب آئے تو راجا نے پنڈتوں اور جوشیوں کو طلب کر کے پوچھا۔ ”اللہ نے میری آس پوری کر دی ہے۔ اپنے علم سے حساب لگا کر بتاؤ‘ میرے ہاں لڑکا پیدا ہو گا یا لڑکی۔؟

یہ سنتے ہی پنڈتوں نے اپنی پوتھیاں کھول لیں اور جوتشی زائچے بنانے لگے۔ وہ کچھ دیر تک اپنے اپنے علم کے مطابق حساب لگاتے رہے اور اسکے بعد سارے ایک زبان ہو کر بولے۔

”مہاراج! آپ کے ہاں بیٹا پیدا ہو گا جو ہمیشہ دھرم اور ایمان کو قائم رکھے گا۔ مگر آپ کو اس کے لیے ایک احتیاط برتنا ہو گی۔!“

”وہ کیا۔؟ کیسی احتیاط۔؟؟“

راجا نے قدرے بے صبری سے سوال کیا۔ اس پر پنڈتوں اور جوتشیوں نے کہا۔

”بیٹا پیدا ہوتے ہی آپ کو اسے دیکھے بغیر کسی تہہ خانے میں بند کر دینا ہو گا‘ ورنہ وہ مرجائے گا اور ماں باپ کی موت کا سبب بھی بنے گا۔“

راجے نے یہ بات سنی تو حیران ہو کر سوچ میں پڑ گیا جس پر پنڈت اور جوتشی بولے۔

”کم از کم بارہ برس تک اسے تہہ خانے میں رہنا ہو گا۔ اس عرصہ میں نہ آپ اسے دیکھ سکیں گے اور نہ ہی اس کی ماں اسے دیکھے گی۔ بچے کی قسمت میں یہی لکھا ہے‘ اس میں کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔“

راجا یہ جان کر بہت غمگین ہو گیا مگر کیا کر سکتا تھا۔ اس نے اسی وقت ایک ایسا تہہ خانہ بنانے کا حکم دے دیا جس میں زندگی کی ہر سہولت موجود ہو تاکہ بچے کو کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ پھر جیسے ہی بچے کی پیدائش کا دن آیا تو اسے راجا اور رانی کو دکھائے بغیر اس تہہ خانے میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ باندیاں اور کنیزیں بھی تہہ خانے میں مقرر کر دی گئیں جو ہر طرح سے اس کی دیکھ بھال کرتی رہیں۔ اس طرح راجا سالباہن کا بیٹا تہہ خانے میں پرورش پانے لگا اور اس کے ماں باپ اس کو دیکھنے کے لیے ترستے رہے۔ انھوں نے اپنے ان دیکھے

بیٹے کا نام پورن رکھا جو بعد میں پورن بھگت کے نام سے مشہور ہوا۔
بارہ برس کا عرصہ کم نہیں تھا' پھر یہ کہ راجا اور اس کی بیوی اچھراں نے اپنے بیٹے کا چہرہ تک نہ دیکھا تھا' اس لیے ان کی جدائی اور انتظار کا کوئی اندازہ نہ کر سکتا تھا۔ انھیں تو بارہ برس بارہ صدیاں محسوس ہو رہے تھے۔ وہ ایک ایک پل گن گن کر گزار رہے تھے۔ کبھی کبھی تو وہ مایوس ہو جاتے اور ایک دوسرے سے کہتے۔

"ایسے لگتا ہے جیسے ہم جیتے جی اپنے بیٹے کو نہ دیکھ سکیں گے۔۔۔!"

ادھر راجا روز بروز بڑھاپے کی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس دوران میں ان کے ہاں دوسری اولاد بھی نہ ہوئی تھی۔ اس کے بعض مصاحبوں نے اسے دوسری شادی کا مشورہ بھی دیا تھا۔ وہ پہلے تو انکار کرتا رہا لیکن ایک وقت ایسا آیا جب وہ بھی سنجیدگی سے دوسری شادی کے بارے میں سوچنے لگا۔ اتفاق کی بات کہ ایک روز راجا اپنے باغ کی سیر کو گیا تو اس کی نظر ایک لڑکی پر پڑی جو حسین بھی تھی اور جوان بھی تھی۔ اگرچہ وہ اس سے عمر میں بہت چھوٹی تھی مگر سالباہن اس کو دیکھ کر اپنے دل پر قابو نہ رکھ سکا۔ اسے وہ لڑکی کوئی پری معلوم ہو رہی تھی جس کا حسن طلوع ہوتے ہوئے سورج کی طرح کرنیں بکھیر رہا تھا۔ اس لڑکی کا نام لوناں تھا اور یہ چمارن تھی لیکن راجا کو اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی کہ وہ کون ہے اور کیا ہے؟ اس کے سامنے تو ایک حسین نو عمر لڑکی کھڑی تھی جو اس کی نس نس میں اتر رہی تھی۔ لوناں خوبصورت اور جوان تو تھی ہی' اس کے ساتھ ساتھ وہ بڑی چنچل اور شوخ بھی تھی۔ یہی کچھ دیکھ دیکھ کر راجا اپنے آپ میں نہ رہا تھا۔ اس وقت نہ تو اسے اپنے بیٹے پورن کا خیال آیا جو تہہ خانے میں پل رہا تھا اور نہ ہی اس نے اچھراں کے بارے میں سوچا جس کو حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنی جان کی بازی کھیلی تھی۔ لوناں کو جب اس نے دیکھا' اس وقت وہ باغ کے کنوئیں سے پانی بھرنے آئی تھی۔ راجا اس کے پاس گیا اور بولا۔

"ہم پیاسے ہیں۔۔ ہمیں ایک کٹورا پانی پلا دو۔۔!"

لڑکی نے پلٹ کر دیکھا تو کوئی عام آدمی اس سے بات نہیں کر رہا تھا بلکہ خود راجا تھا۔ اس نے

جواب میں کہا۔

"اے نیلے گھوڑے کے سوار' تمھارے ترکش پر موتی ٹکے ہوئے ہیں اور تمھاری کمان میں ہیرے جڑے ہیں۔ میں چماروں کی لڑکی ہوں' ہم نیچ ذات کے لوگ ہیں۔ میرے ہاتھ سے پانی پی کر اپنا دھرم خراب مت کرو!"

اس پر دل کے ہاتھوں ہارا ہوا راجا بولا۔

"اے حسینہ! شاید تمھیں معلوم نہیں کہ مٹی میں سے سونا مل جاتا ہے' زہر امرت بن جاتا ہے اور نیچ ذات کی عورت میں عقل مل جاتی ہے۔ یہ تینوں باتیں ممکن ہیں"۔

اس پر لڑکی نے شوخی سے جواب دیا۔

"تم نے کپاس کے سرخ پھول کو پسند کیا ہے اور اپنی سمجھ گنوا دی ہے۔ تم صرف پھول کو دیکھ کر فریفتہ ہو گئے ہو اور پھل کے بارے میں کچھ نہیں سوچا۔"

راجا نے کہا۔

"پھل تو مقدروں کی بات ہوتی ہے۔۔ یہ بعد کی بات ہے۔۔۔ میں راجا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم میری رانی بن جاؤ۔۔۔ تم محلوں میں راج کرو گی۔"

لوناں لاکھ چمارن سہی لیکن وہ انتہائی حسین تھی۔ جب ہار سنگھار کر کے بیٹھتی تو اڑتے پنچھی اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے رک جاتے۔ راجا نے اپنے خاص مصاحبوں سے مشورہ کیا اور فوراً لوناں کو اپنی رانی بنا لیا۔ اس کے لیے ایک الگ محل تعمیر کرا دیا گیا جس میں وہ باندیوں اور نوکروں چاکروں کے ساتھ رہنے لگی جو ہر وقت اس کی خدمت کے لیے تیار ہوتے تھے۔

پورن جب تھوڑا بڑا ہوا تو تہہ خانے میں ہی اس کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کر دیا گیا۔ اسے مختلف علوم کے استاد اور پنڈت پڑھانے پر مامور کر دیے گئے تھے اور وہ مروجہ علوم سے واقف ہو رہا تھا۔ اس طرح اسے تہہ خانے میں پلتے بڑھتے بارہ برس کا عرصہ ہو چکا تھا۔ دوسری طرف اس کی ماں اچھراں جو گھڑیاں گن گن کر زندگی گزار رہی تھی' اس کی

خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ خود سالباہن بھی بہت خوش تھا کہ بارہ برس کا عرصہ پورا ہو رہا تھا اور اب وہ اپنے بیٹے کو دیکھ سکے گا۔ اس نے لوناں سے شادی تو کر لی تھی مگر اس سے کوئی اولاد نہ ہوئی تھی۔ اس طرح اس کا ایک ہی بیٹا تھا اور وہ پورن تھا' اس لیے جب اسے بتایا گیا کہ پورن کو تہہ خانے میں بند ہوئے بارہ برس کا عرصہ پورا ہو چکا ہے تو وہ بہت خوش ہوا اس نے جشن منانے کا اعلان کر دیا اور ہر طرف خوشیوں کے شادیانے بجنے لگے۔ پھر مقررہ دن راجا سالباہن خود گیا اور بیٹے کو تہہ خانے سے باہر نکالا۔ جیسے ہی اس نے اپنے بیٹے کو دیکھا وہ دنگ رہ گیا۔ یہ تو اس کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ پورن اس قدر خوبصورت ہو گا۔ اس نے دیوانہ وار اپنے بیٹے کو گلے سے لپٹا لیا۔

"میرے بیٹے! ہم تمھیں تہہ خانے میں رکھنے پر مجبور تھے۔ تمھاری قسمت میں یہی لکھا تھا جسے ہر حالت میں پورا ہونا تھا۔"

وہ بار بار پورن کو گلے لگا رہا تھا اور چوم رہا تھا۔ پھر وہ خوشی خوشی اسے لے کر محل میں آیا۔ ادھر اچھراں بڑی بے تابی سے بیٹے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے بارہ سال اپنے بیٹے کی جدائی میں جس طرح گزارے تھے اس کا دکھ تو اس کی ممتا ہی جانتی تھی۔ جب اس کو یہ پتا چلا کہ پورن محل میں آ گیا ہے تو اس کی بے صبری اور بے تابی اور بھی بڑھ گئی تھی اور پھر جیسے ہی پورن اُسے ملنے کے لیے آیا تو وہ پاگلوں کی طرح اس کی جانب لپکی اور اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ وہ اس کی بلائیں لیتے ہوئے تھک نہیں رہی تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کو پہلی بار دیکھا تھا اور نو عمری میں دیکھا تھا۔ وہ اُسے دیکھ دیکھ کر نہال ہوئی جا رہی تھی۔ کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ پورن اس قدر خوبصورت ہو گا۔ آتے ہی اس کی خوبصورتی کے چرچے ہونے لگے تھے۔ جو بھی اسے ایک نظر دیکھتا اس کے حسن کی تعریف کرنے لگتا۔ وہ اپنے شہر ہی میں نہیں' پورے ملک میں حسین ترین تھا اور اب اس کی آمد کی خوشی میں ہر طرف جشن منایا جا رہا تھا جس میں امیر اور غریب سب شریک تھے۔ یہ جشن کئی روز تک منایا جاتا رہا اور اس دوران راجا سالباہن کو وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا۔

ایک روز رانی لوناں اپنے محل میں بیٹھی تھی کہ اس کی خاص باندی ہیرا آئی اور کہنے لگی۔
"رانی، آج میں نے ایک ایسا نوجوان دیکھا ہے جو تم سے بھی کئی گنا خوبصورت ہے۔ وہ اس قدر حسین ہے کہ اس کی طرف نظر بھر کے دیکھنا مشکل ہے۔۔!"
"اچھا۔ مجھ سے بھی خوبصورت۔۔؟ مگر وہ ہے کون اور کہاں ہے۔۔؟"
"رانی نے تعجب سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا جس پر ہیرا نے کہا۔"
"اس کا نام پورن ہے اور اس کا چہرہ چاند سے بھی زیادہ روشن ہے۔ مگر وہ تمھاری سوت کا بیٹا ہے۔۔!"

لوناں نے یہ سنا تو وہ اپنے دل ہی دل میں تجویزیں سوچنے لگی کہ کس طرح پورن کو محل میں بلایا جا سکے۔ ایک دن جب اسے پتا چلا کہ آج رات راجا اس کے پاس آ رہا ہے تو اس نے سر شام ہی سے محل میں اندھیرا کر دیا اور اپنے بال کھول کر لیٹ گئی۔ راجا کئی دنوں کے بعد اس کے پاس آیا تھا' اس کا خیال تھا کہ لوناں اس کی آمد کی خبر سن کر خوب ہار سنگھار کرے گی اور بن ٹھن کر بڑے چاؤ سے اس کا استقبال کرے گی لیکن جب وہ محل میں پہنچا تو وہاں منظر ہی کچھ اور تھا محل میں اندھیرا پھیل رہا تھا اور لوناں ایک طرف بال کھولے پڑی تھی' حیران ہو کر پوچھنے لگا۔
"یہ تمھیں کیا ہوا ہے۔؟ کیا کسی نے تمھیں کچھ کہا ہے یا تم نے کوئی بری خبر سنی ہے۔؟"
جواب میں لوناں نے ناراضی کے لہجے میں کہا۔
"میں بھی آپ کی بیوی ہوں۔ یہ ٹھیک ہے' میں اچھراں کی طرح پورن کی سگی ماں نہیں ہوں لیکن اس کی سوتیلی ماں تو ہوں۔ وہ آج تک مجھے ملنے تک نہیں آیا۔!"
راجا اسے مناتے ہوئے بولا۔ "اچھا تم اپنی حالت ٹھیک کرو میں اسے تمھارے پاس بھیجوں گا۔"

دوسرے روز راجے نے پورن کو طلب کیا اور اسے کہا کہ وہ اپنی دھرم کی ماں کو سلام کر کے آئے۔ بھلا پورن کو اس میں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔؟ لیکن جب اچھراں کو اس بات کا

علم ہوا کہ پورن لوناں کو ملنے جا رہا ہے تو وہ پریشان ہو گئی۔ وہ جانتی تھی‘ لوناں اس سے جلتی ہے اور چونکہ اس کے ہاں اولاد نہیں ہے اس لیے وہ میرے پورن سے بھی جلے گی۔ اور اس کا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا‘ جب پورن اپنی سوتیلی ماں لوناں کو ملنے اس کے محل میں گیا تو اس نے مسکراتے ہوئے اس کو خوش آمدید کہا۔ پورن دونوں ہاتھ باندھ کر دھرم کی ماں کی تعظیم بجالایا لیکن لوناں تو اسے دیکھ کے جیسے پتھر کی ہو گئی تھی۔ جیسے اس پر کسی نے جادو کر دیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں اتنا حسین نوجوان نہیں دیکھا تھا۔ واقعی اس کی باندی نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی یہ بھول گئی تھی کہ اس کی دھرم کی ماں ہے‘ اس کا سارا جسم ہوس کی آگ میں تپنے لگا۔ وہ اس پر دل و جان سے فریفتہ ہو گئی۔۔ جب پورن نے دونوں ہاتھ باندھ کر کہا۔

”ماتا! میں تعظیم بجالاتا ہوں!“

اس کا خیال تھا‘ آگے سے لوناں ایک ماں کی طرح اسے اشیرباد دے گی مگر وہ اس کی بات سن کر سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ وہ اسے ہوس بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”راجکمار‘ میں تمھاری ماتا نہیں ہوں۔ مجھے ماتا مت پکارو۔ آؤ ادھر میری سیج پر میرے ساتھ بیٹھو۔!“

اس پر پورن نے جواب دیا۔

”ماتا! ایسی باتیں مت کرو۔ تم سگی نہ سہی میری سوتیلی ماں تو ہو۔ مجھے ماں کی طرح اشیرباد دو!“

مگر لوناں تو جیسے جذبات میں ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔ اس نے کہا۔

”میں نے کب تمھیں اپنی کھوکھ سے جنم دیا ہے اور کب اپنا دودھ پلا کر اپنی گود میں کھلایا ہے۔ پھر تم مجھے ماں کیوں کہتے ہو۔؟“

پھر وہ بڑے پیار بھر لہجے میں بولی۔

”میری اور تمھاری عمر میں کوئی فرق نہیں ہے۔ تم میرے راجا ہو اور میں تمھاری رانی ہوں۔ اپنی محبت میری جھولی میں ڈال دو اور آؤ میری سیج پر میرے ساتھ بیٹھو۔“

پورن کی حالت یہ تھی کہ وہ پاپ کے تصور ہی سے کانپ رہا تھا۔ اس نے لوناں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ماتا! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔؟ تم میرے باپ کی بیوی ہو۔ میں ہاتھ باندھ کر درخواست کرتا ہوں کی میری نیک زندگی میں پاپ مت ملاؤ۔ نیکوں کو نیک رہنے دو۔ اگر ایسی باتیں ہونے لگیں تو یہ دنیا ختم ہو جائے گی۔"

لوناں نے جب اپنا ہر حربہ استعمال کرلیا اور اسے ہر حربے میں ناکامی ہوئی تو وہ غصے میں تلملا گئی۔ اس نے پورن کے انکار کو اپنی توہین سمجھا اور اس سے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ اس نے دھمکی دیتے ہوئے پورن سے کہا۔

"یا تو تم میری سیج پر آنا قبول کرو ورنہ میں تمھیں جان سے مروا دوں گی۔ تم مجھ سے بھاگ کر نہیں جاسکتے، میں تمھیں باندھ کر منگوالوں گی۔"

اس پر پورن نے ایک بار پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر منت کرتے ہوئے کہا۔

"اے ماتا! میں تمھارے آگے ہاتھ جوڑ کر عرض کرتا ہوں میری نیکی اور دھرم کو قائم رہنے دو!"

پھر جب اس نے دیکھا کہ لوناں پر اس کی کسی بات کا اثر نہیں ہو رہا تو وہ وہاں سے جان چھڑا کے بھاگ نکلا۔ اس کے دوسرے روز جب راجا لوناں کے محل میں آیا تو اس نے وہاں کا عجیب نقشہ دیکھا۔ محل میں ہر طرف ویرانی اور اندھیرا تھا اور لوناں اپنے کپڑے پھاڑے اور بال بکھیرے پڑی تھی۔ سالباہن بڑا پریشان ہوا۔ اس نے جب اس کا سبب دریافت کیا تو وہ کہنے لگی۔

"یہ بات اپنے لاڈلے بیٹے سے پوچھیں۔ اس نے یہ خیال نہیں کیا کہ میں اس کی دھرم کی ماں ہوں۔ میں اسے بیٹا بیٹا کہتی رہی اور اس نے میری عزت پر ہاتھ ڈال دیا۔"

اس کے ساتھ ہی وہ اپنی کلائی سامنے کرتے ہوئے بولی۔

"یہ دیکھیں میری کلائی جس میں ابھی تک درد ہو رہا ہے۔ اس نے میری کلائی اس طرح

مروڑی کہ ساری چوڑیاں ٹوٹ گئیں اور پھر محل سے بھاگ گیا۔"

راجا نے جب یہ سب کچھ سنا تو غصے میں آگ بگولا ہو گیا اور پیچ و تاب کھاتا ہوا واپس آیا۔ اس نے وہ رات بڑی بے چینی سے کروٹیں بدل بدل کر کاٹی کبھی اٹھتا، کبھی بیٹھتا اور کبھی پھر لیٹ کر کروٹیں بدلنے لگتا۔ پھر جب دوسری صبح وہ دربار میں پہنچا تو اس نے اسی وقت پورن کو طلب کیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد جب پورن اس کے سامنے آیا تو سالباہن نے غضبناک ہو کر کہا۔

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تمھارے ایسے کرتوت ہوں گے تو تمھیں پیدا ہوتے ہی موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ کل تم نے اپنی دھرم کی ماں کے ساتھ جو کچھ کیا ہے، اس کی نشانیاں میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔"

"تمھیں اپنی ماں کی عزت پر حملہ کرتے ہوئے شرم نہیں آئی"۔؟

جواب میں پورن حیران و پریشان ہو کر اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔

"پتا جی! میں بالکل بے گناہ ہوں۔ یہ مجھ پر سراسر تہمت ہے۔ میں ایسے پاپ کا سوچ بھی نہیں سکتا!"

لیکن اس کا باپ تو جیسے غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔ وہ اس کی کوئی بات سننے کے لیے تیار ہی نہ تھا۔ اس نے بہتیرا سمجھانے اور اصل بات بتانے کی کوشش کی لیکن اس کا باپ صرف اپنی کہے چلا جا رہا تھا۔ آخر پورن نے کہا۔

"پتا جی! میری سچائی اور بے گناہی ثابت کرنے کے لیے تیل کا کڑھاؤ گرم کیجیے اور جب تیل گرم ہو کر جلنے لگے تو اس میں میرا ہاتھ ڈال دیجیے۔ اگر میرے ہاتھ کی انگلی پر داغ بھی پڑ جائے تو جو سزا چاہیں مجھے دیں۔ میں بالکل بے گناہ ہوں۔"

اس نے راجا کے سامنے بہتیری صفائی پیش کرنے کی کوشش کی مگر سب بے سود۔ راجا نے اس کی ایک نہ سنی اور اسی وقت جلادوں کو طلب کیا۔ دربار میں ہر شخص کانپنے لگا اور

جب خبر اچھراں تک پہنچی تو اس کی تو جیسے جان ہی نکل گئی۔ اس نے اپنی چوڑیاں توڑ دیں' سر میں خاک ڈال لی اور آہ و زاری کرتے ہوئے راجا سے فریاد کی لیکن راجا کو اس پر بھی رحم نہ آیا اور کہنے لگا۔

"جس اولاد میں شرم و حیا نہیں' اس کا زندہ رہنا بیکار ہے"۔

اچھراں بہت روئی پیٹی' پورن نے لاکھ اپنے آپ کو بے دوس ثابت کرنا چاہا' راجا کے قریبی مصاحبوں نے بھی اسے بہت سمجھایا مگر وہ اپنی ضد پر اڑا رہا اور اس نے جلادوں کو حکم دیا کہ پورن کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر اسے شہر سے دور کسی اندھے کنوئیں میں پھینک دیا جائے یہ راجا کا حکم تھا اور اس حکم پر عمل کیا گیا۔ پورن کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر اسے شہر سے دور ایک ویرانے کے اندھے کنوئیں میں پھینک دیا گیا اور اس طرح راجا سالباہن اور رانی لوناں دونوں مطمئن ہو گئے کہ پورن کو ہلاک کر دیا گیا ہے۔

اس واقعہ کو بارہ برس کا عرصہ بیت گیا۔ اس دوران کئی بہاریں آئیں اور کئی خزائیں بیت گئیں۔ ان گنت سورج طلوع ہو کر غروب ہو گئے اور ہزاروں دن اور راتیں آ کر چلے گئے۔ راجا اور لوناں تو اپنی جگہ مطمئن ہو چکے تھے کہ پورن کو ختم کر دیا گیا تھا بلکہ وہ اس طویل عرصہ میں اسے بھول بھی چکے تھے لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ پورن ہلاک نہیں ہوا تھا بلکہ اب تک زندہ تھا اور اسی کنوئیں میں تھا۔ ایک روز اتفاق سے گورو گورکھ ناتھ کا ادھر سے گزر ہوا۔ اس کے ساتھ اس کے بہت سے چیلے اور بالکے بھی تھے۔ وہ ٹیلا گورکھ ناتھ سے سفر کرتے آ رہے تھے اور تھکے ہوئے تھے' اس لیے گورو نے اپنے چیلوں سے کہا۔

"یہاں کنوئیں کے قریب کچھ عرصہ رک کر آرام کر لیا جائے تو بہتر ہے۔"

گورو کے حکم کی دیر تھی' اسی وقت وہیں پڑاؤ ہو گیا اور چیلوں نے ڈیرے جما لیے۔ کھانے پینے کا انتظام کیا جانے لگا تو گورو کا ایک چیلا پانی لانے کے لیے کنوئیں پر گیا اور جب اس نے پانی نکالنے کی خاطر کنوئیں میں ڈول لٹکایا تو اسے اندر سے کسی آدمی کی آواز آئی۔

چیلے نے اس ویران کنوئیں میں سے کسی کی آواز سنی تو وہ ڈر گیا۔ اس نے سوچا' یقیناً یہ کوئی جن بھوت ہے۔ لہٰذا وہ بھاگا بھاگا اپنے گورو کے پاس آیا اور ہانپتے کانپتے کہنے لگا۔

"گورو جی! اس کنوئیں میں کوئی جن بھوت ہے۔۔ آپ خود چل کر دیکھیں۔"

گورو گورکھ ناتھ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"تمہیں یقیناً دھوکا ہوا ہو گا۔ اس ویران کنوئیں میں آدمی یا بھوت کہاں سے آ گیا۔؟"

مگر چیلے کو اپنی بات پر اصرار تھا' یہی دیکھ کر گورو دو تین چیلوں کو ساتھ لے کر خود گیا اور کنوئیں میں جھانک کر دیکھا تو نیچے ایک آدمی نظر آیا جو لیٹا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ گورو نے بلند آواز میں پوچھا۔

"تم کون ہو؟۔ تمہارا نام کیا ہے۔۔؟ اور تم اس ویران کنوئیں میں کیا کر رہے ہو۔؟"

جواب میں کنوئیں میں سے آواز آئی۔

"مجھے بارہ برس بعد کسی آدمی کی آواز سنائی دی ہے۔ پہلے مجھے باہر نکالیے۔ میں اپنا سارا حال بتاؤں گا۔"

گورو نے اسی وقت اپنے چیلوں کو حکم دیا کہ اس آدمی کو کنوئیں سے باہر نکالا جائے۔ چیلے اسی وقت کوشش کر کے کنوئیں میں اترے اور پورن کو باہر نکال لائے۔ دیکھا تو اس کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے تھے۔ سب حیران تھے کہ یہ سب کچھ کیا ہے؟

گورو نے اس سے دریافت کیا۔

"تم کون ہو اور تمہاری یہ حالت کیسے ہوئی۔؟"

جواب میں پورن نے سر جھکا کر گورو گورکھ ناتھ کو سلام کیا اور پھر اپنی روداد بتاتے ہوئے عرض کیا۔

"گورو جی! میرے آباؤ اجداد کا وطن اجین تھا' جہاں کبھی راجا بکرماجیت کی حکومت تھی۔ میرے باپ دادا وہاں سے آئے اور سیالکوٹ پر قبضہ کر کے یہاں راج کرنے لگے۔ میرا نام پورن ہے اور میں راجا سالباہن کا بیٹا ہوں۔ میری سوتیلی ماں نے مجھ پر تہمت لگا کر میرے

باپ کو میرے خلاف کر دیا جس نے میرے ہاتھ پاؤں کٹوا کے اس کنوئیں میں پھنکوا دیا۔ مجھے اس کنوئیں میں پڑے ہوئے بارہ سال بیت گئے ہیں جہاں سے آپ لوگوں نے مجھے نکالا ہے۔ اور اب میں آپ کے سامنے ہوں۔

گورو گورکھ ناتھ نے اس کی کہانی سنی تو اسے پورن پر بہت ترس آیا۔ اس نے اللہ کے حضور اس کے لیے دعا کی اور اس کے ساتھ ہی پورن کے ہاتھ پاؤں اس طرح صحیح سلامت ہو گئے جیسے کبھی کٹے ہی نہ تھے۔ یہ دیکھ کر پورن گورو گورکھ ناتھ کے قدموں میں گر پڑا اور جب وہ اسے ساتھ لے کر اپنے ڈیرے پر پہنچے تو اس نے دونوں ہاتھ باندھ کر گورو سے عرض کی۔

"گورو جی! مجھے بھی جوگ عطا کر دیجیے۔ میں آپ کے سائے میں زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔"؟

اس پر گورو نے اسے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! جوگ کی راہ بہت مشکل ہے کرودھ کو چھوڑ دینا اور حرص و ہوس کو دل سے نکالنا بہت کٹھن ہے۔ تم اس راہ پر چلنے کی کوشش مت کرو اور اپنے ماں باپ کے پاس جا کر ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاؤ اور خود بھی سکھ سے رہو۔"

لیکن پورن نہ مانا۔ اس نے گورو کے قدم پکڑ لیے اور عاجزی سے بولا۔

"میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ آپ نے مجھے دوبارہ زندگی دی ہے۔ مجھ پر دیا کریں میرے کانوں میں مندریں ڈال کر جوگ دے دیں۔ میں اس راہ میں ثابت قدم رہوں گا۔"

گورو نے اسے بتیرا سمجھایا مگر وہ جوں جوں سمجھاتا' توں توں پورن کا اصرار اور بڑھتا جاتا۔ گورو یہ بھی جانتا تھا کہ اس نے بارہ برس جس طرح کنوئیں میں گزارے ہیں' وہ تپیا جوگ کے لیے کافی ہے' اس لیے آخر مجبور ہو کر اس نے پورن کے سر کے بال کاٹے' اس کے کان چھید کر ان میں مندریں ڈالیں اور جوگیوں کا لباس پہنا کر اسے اپنے چیلوں میں شامل کر لیا۔ اس طرح پورن کو جوگ مل گیا اور اب وہ پورن سے پورن بھگت بن گیا تھا۔

گورو نے پورن بھگت کو پہلی گدائی کے لیے بھیجا تو وہ رانی سندراں کے شہر میں پہنچ گیا۔ وہاں جا کر اس نے محل کے باہر الکھ کا نعرہ لگایا اور بلند آواز میں بھکشا مانگی۔ رانی نے

جوگی کی آواز سنی تو ایک باندی کے ہاتھ خیرات بھیجی مگر پورن بھگت نے خیرات لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا۔

''ہم رانی کے ہاتھ سے خیرات لیں گے۔ ہم باندیوں کے پاس نہیں آئے۔''

یہ سن کر باندی الٹے پاؤں رانی سندراں کے پاس گئی اور اسے بتایا کہ جوگی صرف آپ کے ہاتھ سے خیرات پر اصرار کر رہا ہے۔ پھر وہ آہستہ سے بولی۔

''رانی جی! عجیب جوگی ہے۔ وہ اس قدر حسین و جوان ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔''

باندی کی باتیں سن کر رانی سندراں نے محل کے جھروکے سے جھانک کر دیکھا تو واقعی یہ جوگی انوکھا تھا۔ باندی نے اس کے حسن اور جوانی کی جو تعریف کی تھی' اس سے بھی کہیں زیادہ تھا۔ اس نے باندی سے کہا کہ جوگی کو محل کے اندر لے آؤ مگر پورن بھگت نے محل کے اندر جانے سے انکار کرتے ہوئے کہا۔

''محلوں میں جانا فقیروں کا کام نہیں ہے۔ رانی خود باہر آ کر بھکشا دے۔''

جب باندی نے رانی سندراں کو جوگی کا یہ پیغام دیا تو وہ محل کے کمرے میں گئی اور ایک تھالی میں ہیرے' موتی اور جواہر لے کر محل کے دروازے پر آئی اور جوگی کے قدموں میں رکھ کر عرض کی۔

''میری خوش قسمتی ہو گی' اگر آپ پھر بھی یہاں آئیں!''

پورن بھگت نے رانی کو دعا دی اور ہیرے موتی لے کر گورو کے پاس آ گیا۔ اس نے وہ موتی جواہر لا کر گورو کے آگے رکھ دیے اور مؤدب ہو کر بیٹھ گیا۔ گورو نے قیمتی ہیرے دیکھے تو کہنے لگا۔

''یہ کہاں سے لائے ہو۔؟''

''یہ رانی سندراں نے خیرات میں دیے ہیں۔''

اس نے گورو کو بتایا جس پر اس نے کہا۔

''بیٹا! یہ دولت' یہ ہیرے موتی ہمارے کس کام کے۔ فقیر دولت نہیں لیا کرتے' ان کی دولت

توفقیری ہوتی ہے۔ جاؤ یہ واپس رانی کو دے آؤ‘ اس سے خیرات میں پکا ہوا بھوجن لاؤ“
پورن بھگت نے وہ ہیرے موتی اٹھائے اور واپس رانی سندراں کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے وہ زروجواہر واپس کرتے ہوئے کہا۔

”میرا گورو ناراض ہوا ہے۔ ہمیں صرف پکا ہوا بھوجن خیرات میں دیا جائے۔“

سندراں تو اسے پہلی نظر دیکھتے ہی گھائل ہو چکی تھی‘ اس لیے وہ دوبارہ جوگی کو اپنے محل کے دروازے پر دیکھ کر بہت خوش تھی۔ اس نے اسی وقت اچھے اچھے کئی کھانے تیار کرائے اور اپنی باندیوں اور نوکروں کے سروں پر اٹھوا کے کہنے لگی۔

”میں بھی آپ کے گورو کو سلام کرنے کے لیے ساتھ چلتی ہوں“۔

اس طرح رانی سندراں طرح طرح کے بھوجن لے کر پورن بھگت کے ساتھ گورو ناتھ کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے جاتے ہی ہاتھ باندھ کر سلام کیا اور پکے ہوئے کھانوں کے تھال آگے رکھ دیے۔ گورو‘ رانی کی اس خدمت سے بہت خوش ہوا اور اس سے پوچھنے لگا۔

”رانی! ہم تم پر بہت خوش ہوئے ہیں۔ مانگو کیا مانگتی ہو۔؟“

”اس پر رانی نے بدستور ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔“

”آپ کی دعا سے میرے پاس سب کچھ ہے۔ مجھے مال و دولت کی حاجت نہیں۔ اللہ نے مجھے سب کچھ دیا ہے۔“

گورو نے پھر اس سے پوچھا اور اس نے پھر وہی جواب دیا۔ جب گورو نے تیسری اور آخری بار اس سے دریافت کیا تو رانی نے ڈرتے ڈرتے عرض کی۔

”گورو جی! اگر آپ کو کچھ دینا ہی ہے تو مجھے اپنا چیلا پورن بھگت عنایت کر دیں!“

”گورو گورکھ ناتھ چونکہ رانی کو اپنا بچن دے چکا تھا اس لیے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے پورن بھگت کو حکم دیا کہ وہ رانی سندراں کے ساتھ چلا جائے۔ پورن بھگت بھی اپنے گورو کے حکم کے خلاف نہیں جا سکتا تھا۔ چنانچہ وہ گورو کو سلام کر کے خاموشی سے رانی سندراں کے ساتھ چل دیا جو اس وقت خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی۔ اس کے دل کی مراد پوری ہو

رہی تھی‘ وہ اپنے دل میں خود سے کہہ رہی تھی۔ میں تو آج رانی بنی ہوں‘ ایک نہ ایک دن پورن کو اپنے دام میں لے ہی آوٴں گی۔ اس کے برعکس پورن بھگت کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ پریشان تھا کہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ وہ پہلے ہی اپنی سوتیلی ماں رانی لوناں کی وجہ سے کیا کیا مصائب جھیل چکا تھا اور اب یہ نئی مصیبت آ رہی تھی۔ اس کا حسن اس کے لیے عذاب بن رہا تھا۔ وہ رانی سندراں کے ساتھ اس کے محل میں تو آگیا لیکن اس محل میں رہنا اس کے لیے ایسے تھا جیسے پھر سے اندھے کنوئیں میں آگیا ہو۔ کنوئیں میں تو زندہ رہا تھا مگر اس محل میں زندہ رہنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ پاپ سے بھاگ رہا تھا لیکن رانی سندراں پاپ کا جال بچھا کر اسے پھنسانے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہی کچھ دیکھ کر پورن بھگت باندیوں اور نوکروں چاکروں کی نظریں بچا کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ جیسے ہی سندراں کو اس کے چلے جانے کا علم ہوا وہ پاگل سی ہو گئی۔ کہاں تو تھوڑی دیر پہلے اپنی قسمت پر ناز کر رہی تھی اور کہاں دیکھتے ہی دیکھتے اسے محرومیوں نے آگھیرا تھا۔ اس نے اسی وقت نوکر چاکر اس کے پیچھے دوڑائے مگر پورن بھگت کہیں نہ مل سکا۔ رانی سندراں اس قدر دل برداشتہ ہوئی کہ اس نے اپنے محل سے کود کر جان دے دی۔

”ادھر پورن بھگت سیدھا اپنے گورو کے پاس پہنچا اور اسے بتایا کہ رانی نے اس کے لیے پاپ کا جال بچھایا تھا جہاں سے وہ اپنا دھرم اور شریر بچا لایا ہے۔ گورو نے اس کا حال سنا تو اصل صورت حال سے آگاہ ہوا‘ اس نے پورن بھگت کو رانی کے ساتھ بھیج کر اپنا بچن تو پورا کر ہی دیا تھا‘ اس لیے اس نے پورن کو معاف کر دیا اور کہا ”بیٹا! اب تم اپنے ماں باپ سے مل کے آوٴ تاکہ ان کے دل کو ٹھنڈک پہنچے۔“

پورن بھگت نے گورو کا حکم تسلیم کیا‘ اس سے اجازت لی اور سیالکوٹ کی طرف چل دیا۔ جب وہ سیالکوٹ کے باہر اپنے باغ میں پہنچا تو دیکھا‘ وہ ویران نظر آ رہا تھا۔ درخت سوکھ گئے تھے اور پھولوں کا نام و نشان نہ تھا۔ باغ کی حالت اس قدر ابتر دیکھ کر اس نے پانی کا ایک برتن لیا اور اپنے ہاتھ سے پودوں اور درختوں پر پانی چھڑکا۔ پانی چھڑکنے کی دیر تھی کہ سوکھا

باغ دیکھتے ہی دیکھتے ہرا بھرا ہو گیا۔ خشک تالاب پانی سے بھر گئے اور پھلوں والے درخت پھلوں سے لد گئے۔ ہر طرف سرسبز گھاس کا فرش بچھ گیا اور پودوں پر پھول لہرانے لگے۔ جیسے ہی شہر کے لوگوں کو اس بات کی خبر ہوئی کہ شہر سے باہر باغ میں ایک کرنی والا جوگی آ کر ٹھہرا ہے جس کے آتے ہی سوکھا ہوا باغ ہرا بھرا ہو گیا' درخت پھلوں سے بھر گئے اور پودوں پر پھول کھل گئے ہیں تو وہ اپنی مرادیں پوری کرنے کے لیے اس کے پاس آنا شروع ہو گئے۔ کرنا خدا کا ایسا ہوتا کہ پورن بھگت جس کے حق میں اللہ سے دعا کرتا اس کی تمنا پوری ہو جاتی۔ بیماروں کو شفا ملنے لگی اور حاجت مندوں کی حاجتیں پوری ہونے لگیں۔ ہوتے ہوتے اس جوگی کی خبر راجا سالباہن تک بھی پہنچی اور وہ رانی لوناں کو ساتھ لے کر پورن بھگت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پورن بھگت نے ایک نظر لوناں کی طرف دیکھا اور پھر راجا سالباہن کا جائزہ لیا۔ وہ دونوں کو دیکھتے ہی پہچان گیا تھا مگر وہ اسے پہچان نہیں سکے تھے۔ دونوں نے جھک کر جوگی کو سلام کیا تو اس نے پوچھا۔

"اے راجا! تم ایک دیس کے والی ہو۔ تمھیں اللہ نے راج پاٹ دیا ہے' پھر مجھ فقیر کے استھان پر آنے کا کیا مقصد ہے۔؟" راجا نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔

"گورو جی! میرے گھر میں اولاد نہیں ہے جس کی وجہ سے میرے محل ویرانی کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ میرے حق میں دعا کریں تاکہ میرے گھر بچہ ہو۔!"

جواب میں پورن نے کہا۔

"جہاں تک مجھ فقیر کے علم میں آتا ہے' تمھارے ہاں ایک بیٹا ہوا تھا مگر تم لوگوں نے اسے ہلاک کر کے شہر سے باہر اندھے کنوئیں میں پھینک دیا تھا۔ مجھے کچھ اس کا حال سناؤ۔؟"

جونہی پورن بھگت نے یہ کہا' انھیں اپنا بیٹا یاد آ گیا جس کے ہاتھ پاؤں کٹوا کے اسے ہلاک کر دیا گیا تھا' وہ دونوں اس وقت ندامت کی تصویر بنے کھڑے تھے۔ راجا نے آہستہ سے کہا۔

"جی ہاں! میری دوسری رانی اچھراں سے ایک بچہ پیدا ہوا تھا مگر جب وہ بڑا ہوا تو اپنی سوتیلی ماں

کو دیکھ کر اس کی نیت خراب ہو گئی اور اس نے پاپ کرنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے اس کا یہ حشر ہوا۔"

راجا کی یہ بات سن کر پورن بھگت نے سامنے کھڑی لوناں پر نظر ڈالی جس کی نگاہیں زمین پر گڑی ہوئی تھیں اور پھر بولا

"اے راجا! تمھارے بیٹے کا کوئی دوش نہیں تھا۔ تمھاری رانی کی نیت خراب ہوئی تھی۔ جب وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی تو اس نے انتقام لینے کی خاطر اس پر تہمت لگا دی تھی۔"

پھر وہ لوناں کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"اے ماتا! اگر تم سچ سچ ساری بات بتا دو تو اللہ تمھارا گناہ معاف کر کے تمھاری گود ہری کر دے گا۔"

اب لوناں کے لیے جھوٹ بولنا ممکن نہ تھا۔ اس نے سارا بھید کھول دیا اور اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے بولی۔

"واقعی پورن کا کوئی قصور نہ تھا۔ مجھے جسمانی ہوس نے اندھا کر دیا تھا۔ میں نے اس پر تہمت لگا کے بہت بڑا پاپ کیا تھا۔"

جونہی اس نے یہ کہا، راجا سالباہن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور غصے میں کہا۔

"اے مکار اور ظالم عورت۔ تم نے میرے بیٹے پر تہمت لگا کر مجھے بھی پاپی بنا دیا۔ اگر مجھے اس وقت پتا چل جاتا تو میں پورن کی جگہ تجھے مروا دیتا۔"

پورن نے جب اپنے باپ راجا کو غصے میں دیکھا تو بولا۔

"اے راجا! اب افسوس سے کیا فائدہ۔؟ پورن کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ اس کے مقدر کا لکھا تھا۔ لیکن کیا کوئی باپ اپنے بیٹے سے ایسا سلوک کرتا ہے جو تم نے اپنے بیٹے کے ساتھ کیا۔؟ جس طرح تمھاری بیوی مجرم ہے اسی طرح تم بھی اس پاپ میں برابر کے شریک ہو۔"

پورن کی یہ بات سن کر راجا شرمندگی اور جرم کے احساس سے پانی پانی ہوا جا رہا تھا۔

اس وقت ان دونوں کی یہ حالت تھی کہ اگر زمین پھٹ جاتی تو وہ اس میں سما جاتے۔ ان کی یہی کیفیت دیکھتے ہوئے پورن نے رانی لوناں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ماتا! پریشان نہ ہو۔ گزری باتوں کو بھول جاؤ۔ میں نے بھی سب کچھ بھلا دیا ہے۔"

پھر اس نے اسے چاولوں کا ایک دانہ دیا اور کہا۔

"یہ چاول کا دانہ کھالینا۔ اللہ تمھیں ایک بیٹا دے گا۔"

دوسری طرف رانی اچھراں کو خبر ہو گئی تھی کہ ایک پہنچا ہوا جوگی آیا ہے جس کی آمد سے سوکھا باغ ہرا بھرا ہو گیا ہے اور اس کی دعا سے لوگوں کی مرادیں پوری ہو جاتی ہیں۔ وہ بچاری بھی گرتی پڑتی باغ میں پہنچ گئی تھی۔ بیٹے کی طویل جدائی کے دوران رو رو کر اس کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہی تھی اور پھر نئی بیوی کی وجہ سے راجا نے بھی اس کی خبر گیری نہیں کی تھی، اس لیے اس کی حالت قابلِ رحم ہو گئی تھی۔ جونہی پورن نے اسے دیکھا، وہ اٹھ کر اس کے پاس گیا اور اسے سہارا دے کر بٹھایا اور اس کا حال دریافت کیا، جس پر اس نے کہا۔

"گورو جی! بیٹے کے غم نے میری دنیا اندھیر کر دی ہے۔ اس کی جدائی میں روتے روتے بینائی بھی چلی گئی ہے"۔ پورن نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ماتا جی! مرنے والے کبھی واپس نہیں آتے۔ رونے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ تم صبر کرو، صبر کے سوا بندے کے لیے کوئی چارہ نہیں ہے۔"

جیسے ہی پورن نے یہ باتیں کیں اچھراں جیسے چونک پڑی۔ وہ پوچھنے لگی۔

"بیٹا! سچ سچ بتاؤ تم کہاں سے آئے ہو۔۔۔؟ تمھارا ملک کونسا ہے۔؟ تم کس باپ کے بیٹے ہو۔؟ اور تمھیں کس ماں نے جنم دیا ہے۔؟ میں نے تمھاری آواز پہچانی ہے، اگر میری بینائی ہوتی تو میں تمھارا چہرہ دیکھ کر تمھیں بھی پہچان لیتی!۔"

اس پر پورن بھگت نے جواب دیا۔

"ماتا! اگر تم جاننا ہی چاہتی ہو تو سنو۔ میں اجین کے راجا بکرماجیت کے خاندان میں سے ہوں۔ تم میری ماں ہو، میں راجا سالباہن کا بیٹا ہوں اور پورن میرا نام ہے۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے ایک کپڑا اپنی ماں کی آنکھوں پر لگایا اور یکایک اس کی بینائی واپس آ گئی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو پورن بھگت کے روپ میں اس کا بیٹا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح اس سے لپٹ گئی اور اس کے باپ نے بھی آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ اس وقت لوناں کھڑی اپنے کیے پر پچھتا رہی تھی۔ وہ سب اتنے برسوں کے بعد ملے تھے' ان کی خوشیوں کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اچھراں تو خوشی میں دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔ اس کو اللہ نے وہ بیٹا ملا دیا تھا جو اس کے خیال سے مر چکا تھا۔ باپ نے پورن سے کہا۔

''بیٹا تم نے ہمارے قصور معاف کر دیے ہیں۔ اب محلوں میں چل کے راجا کی پگڑی سر پر باندھو اور راج پاٹ سنبھالو۔ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔''

اس کی ماں اچھراں بھی اس کی منتیں کر رہی تھی۔

''بیٹا! اتنے برسوں کے بعد ملے ہو۔ میں نے تمھاری جدائی میں بڑے دکھ جھیلے ہیں۔ میری تو زندگی روتے روتے بیت گئی ہے۔ اب چلو اور ہمارے ساتھ رہو۔؟''

مگر پورن نے کہا۔

''ماتا! اس میں کسی کا دوش نہیں ہے۔ جو میری قسمت میں لکھا تھا وہی ہوا ہے۔ جوگ میرا مقدر تھا جو گورو نے مجھے دے دیا ہے۔ اب میں جوگی بن چکا ہوں۔ تم لوگ میرا خیال چھوڑ دو۔ میرا ڈیرا بہت جلد یہاں سے اٹھ جائے گا اور میں کوچ کر کے پھر اپنے گورو کے پاس چلا جاؤں گا۔''

سب نے بہت منت سماجت کی' ماں نے بہت آہ و زاری کی' باپ نے اپنے بڑھاپے کے واسطے دیے اور اسے محلوں میں چلنے کے لیے کہا لیکن پورن بھگت نہ مانا۔ اس نے کہا۔

''میں اپنے گورو کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اس نے مجھے دوبارہ زندگی دی۔ مگر میں تم لوگوں سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ پھر کبھی ضرور آؤں گا۔ اب میں تم لوگوں سے رخصت ہوتا ہوں۔ خدا حافظ!''

اس طرح پورن بھگت اپنے ماں باپ اور دوسرے لوگوں کو روتا چھوڑ کر وہاں سے الوداع ہو گیا اور اپنے گورو کی طرف روانہ ہو گیا۔

سندھ

سسی پنوں

صوبہ سندھ کی عوامی داستانوں میں سسی پنوں کی داستان سب سے زیادہ مشہور و مقبول ہے اور غالباً یہ سندھ کی واحد ایسی کہانی ہے جو سندھی اور فارسی کے علاوہ ہماری دوسری زبانوں میں بھی لکھی گئی ہے۔ اس کا تعلق ماضی کے اس زمانے سے ہے جب سندھ پر خلفائے بنوامیہ کے گورنر حکومت کرتے تھے اور ان کے تحت بعض راجے بھی اپنے اپنے علاقے میں حکمرانی کر رہے تھے۔ انھی راجوں میں ایک راجا دلورائے بھی تھا جس کا عہد آٹھویں صدی عیسوی کے نصف اول میں آتا ہے۔ اسی زمانے میں برہمن آباد میں ایک برہمن رہتا تھا جس کا نام تانیہ تھا اور جو نابینا تھا۔ وہ اور اس کی بیوی مندھر بھانبر نہر کے کنارے کے پاس رہتے تھے اور ان کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ دونوں میاں بیوی کو اولاد کی بڑی تمنا تھی اور اپنی اس تمنا کی تکمیل کے لیے وہ سادھوؤں جوگیوں کے پاس جاتے، فقیروں سے دعا کراتے اور مندروں میں جا کر پوجا پاٹ کرتے تاکہ اللہ انھیں بچہ عطا کر دے لیکن ایک عرصہ تک مندھر کی گود ہری نہ ہو سکی۔ جب وہ بہت مایوس اور اداس ہو جاتی تو تانیہ اسے سمجھاتا۔

"بیگی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ ایک نہ ایک روز اللہ ہماری ضرور سنے گا اور ہمیں اولاد کی دولت نصیب ہو جائے گی۔ اس کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں۔"

اس طرح کافی عمر گزرنے کے بعد ان کے ہاں اولاد ہوئی اور یہ ایک بیٹی تھی۔ یوں تو بیٹی بڑی حسین اور پیاری تھی لیکن لڑکی تھی اور اس وقت کے ہندو سماج میں لڑکی کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا اس لیے ہر شخص کی خواہش ہوتی تھی کہ اس کے ہاں بیٹا پیدا ہو۔ تانیہ اور اس کی بیوی بھی یہی چاہتے تھے کہ ان کے ہاں بیٹا ہو مگر قدرت کو جو منظور تھا' وہی ہونا تھا۔ تانیہ اور مندھر بھی اللہ کی رضا پر راضی تھے۔ وہ برہمن تھے اور اپنے اعتقادات کے مطابق انھوں نے نجومی سے پوچھا۔

"ہمارے ہاں بیٹی پیدا ہوئی ہے۔ مہربانی کر کے بتائیں کہ اس کی قسمت کیسی ہو گی۔؟"

نجومی نے اسی وقت بچی کی جنم پتری کھولی اور حساب لگا کے بتایا۔

"جب یہ لڑکی بڑی ہو گی تو اس کا جیون ساتھی کوئی مسلمان ہو گا۔"

یہ سنتے ہی میاں بیوی چونک گئے اور تعجب سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

"تو کیا ہماری برہمن بیٹی کی شادی مسلمان سے ہو گی۔؟"

ظاہر ہے' یہ انھیں کسی صورت گوارا نہ ہو سکتا تھا۔ یہ تو ان کی بدنامی تھی کہ برہمنوں کی بیٹی کی شادی مسلمان سے ہو چنانچہ وہ دونوں بدنامی سے بچنے کی ترکیبیں سوچنے لگے بہت سوچ بچار کے بعد انھوں نے آپس میں طے کیا کہ۔

"بچی کو دریا میں بہا دیا جائے۔ آنے والی بدنامی سے اسی طرح بچا جا سکتا ہے۔"

اگرچہ ایسا کرنا ان کے لیے بہت مشکل تھا کیونکہ برسوں کی دعاؤں اور تمناؤں کے بعد ان کے ہاں اولاد ہوئی تھی اور اب اسے دریا کے سپرد کر دینا آسان نہ تھا لیکن دوسری طرف وہ اپنی بدنامی سے بھی ڈر رہے تھے' اسی لیے انھوں نے اپنے دل پر پتھر رکھ کے اپنے اس فیصلے پر عمل کرنے کی ٹھان لی۔ انھوں نے ایک صندوق بنوایا اور اپنے آپ پر جبر کر کے اس میں

نومولود بچی کو بند کر کے دریا میں بہا دیا۔

صندوق دریا میں بہنے لگا اور پانی کے بہاؤ پر تیرتا تیرتا • ھمبنھور شہر کے قریب ایک گھاٹ پر پہنچ گیا۔ • ھمبنھور اس زمانے میں مشہور شہر تھا اور وہاں ایک محمد نام کا دھوبی رہتا تھا جس کا کام تو لوگوں کے کپڑے دھونا تھا مگر اس کا یہ کاروبار بہت پھیلا ہوا تھا۔ کیونکہ شہر کے سبھی امیر اور متمول لوگ اسی سے کپڑے دھلواتے تھے۔ اس کے کاروبار کا یہ عالم تھا کہ اس نے لوگوں کے کپڑے لانے لے جانے اور دھونے سکھانے کے لیے بہت سے دھوبی ملازم رکھے ہوئے تھے جن کی تعداد پانچ سو تھی۔ اتفاق کی بات کہ محمد دھوبی بھی اولاد سے محروم تھا اور اسی محرومی کے غم میں دن رات گھلا جا رہا تھا اس نے اپنی اس محرومی کو دور کرنے کے لیے بڑی دعائیں مانگیں' پیروں فقیروں کے در پر بھی گیا اور بزرگوں کے مزاروں پر بھی حاضری دی' پیسے والا تھا اس لیے نذر نیاز میں پیچھے نہ رہا' غریبوں اور مسکینوں میں بھی کھل کے خیرات کی لیکن ابھی تک اس کی یہ مراد پوری نہ ہو سکی تھی تاہم وہ امیدوں کا دامن تھامے ہوئے تھا۔ جن دنوں تانیہ برہمن نے اپنی بچی کو صندوق میں بند کر کے دریا میں بہایا تھا اور جب وہ بہتا بہتا • ھمبنھور کے ایک گھاٹ پر پہنچا تھا تو اس وقت محمد دھوبی کے ملازم گھاٹ پر کپڑے دھو رہے تھے ان میں سے کسی ایک کی نظر دور سے بہتے ہوئے آنے والے صندوق پر پڑی تو اس نے اپنے ساتھیوں کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو دیکھو۔ وہ کیا چیز آ رہی ہے۔؟!"

سب کپڑے دھوتے دھوتے رک گئے اور دور سے بہتے ہوئے آنے والے صندوق کی طرف دیکھنے لگے جو ابھی واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ کیا چیز ہے۔؟ جب وہ تھوڑا قریب آیا تو سب حیران ہو کر ایک دوسرے سے کہنے لگے۔

"ارے یہ صندوق ہے۔؟ اس میں کیا ہو سکتا ہے۔؟"

وہ سب آپس میں قیاس آرائیاں کرنے لگے اور پھر جب صندوق انکے بہت قریب آ گیا تو ان میں سے دو ایک یہ کہتے ہوئے دریا میں کود گئے۔

"ہم اسے کنارے پر لاتے ہیں۔"

پھر چند لمحوں بعد وہ صندوق کو کھینچتے ہوئے کنارے پر لے آئے۔ انھوں نے جب صندوق کو کنارے پر لا کر پانی سے باہر نکالا اور اس کا ڈھکنا کھول کر دیکھا تو سب دنگ رہ گئے۔

"یہ کیا؟ اس کے اندر تو ایک بچی ہے۔؟"

"صندوق میں ایک نہایت خوبصورت' پھول کی طرح نرم و نازک نومولود بچی لیٹی ہوئی انگوٹھا چوس رہی تھی۔ ایک ذو اسی وقت بھاگے بھاگے اپنے مالک محمد دھوبی کے پاس گئے اور اسے اس بات کی خبر کی۔ محمد کو ملازموں کی بات پر یقین نہ آیا' کہنے لگا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ صندوق میں بچی۔؟ اور وہ بھی دریا میں۔؟"

اتنے میں دوسرے ملازم وہ صندوق لے کر اس کے پاس آ گئے۔ واقعی صندوق میں ایک پھول سی نومولود بچی موجود تھی جسے دیکھ کر وہ خوش ہو گیا۔ اس نے اسے جی بھر کے پیار کیا اور دل میں سوچنے لگا' اللہ نے اس طرح اس کی اولاد کی برسوں پرانی خواہش پوری کر دی ہے۔ وہ بچی کو گود میں لے کر جلدی سے اپنی بیوی کے پاس گیا اور خوش ہوتے ہوئے کہنے لگا "دیکھو! اللہ نے ہمیں چاند سی بچی دی ہے"

بچی واقعی چاند کی طرح خوبصورت تھی اسی لیے انھوں نے اس کا نام سسی رکھا جس کے معنی بھی چاند کے ہیں۔ اس طرح نومولود سسی محمد دھوبی کی بیٹی بن گئی اور بڑے ناز و نعم میں پلنے لگی۔ محمد کے پاس دولت کی کمی نہ تھی' اس نے بچی کی دیکھ بھال کے لیے نوکر نوکرانیاں مقرر کر دیں اور خود میاں بیوی بھی ہر وقت اسے پیار کرنے میں لگے رہتے۔ اس طرح سسی کی پرورش میں اس نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

وقت گزرتا گیا اور سسی جوں جوں بڑی ہو رہی تھی توں توں اس کی خوبصورتی بھی دوچند ہوتی جا رہی تھی اس طرح جب وہ شعور کی عمر کو پہنچی تو اس کا حسن اور بھی نکھر گیا۔ جو بھی اسے ایک نظر دیکھتا' دیکھتا ہی رہ جاتا۔ محمد دھوبی چونکہ اسے بہت زیادہ چاہتا تھا لہٰذا جب وہ جوان ہو گئی تو اس نے بے انتہا دولت صرف کر کے اس کے لیے ایک نہایت خوبصورت

اور عالیشان محل تعمیر کرایا جس میں نقش و نگار بنوانے کی غرض سے ماہر کاریگر مقرر کیے اور جب یہ محل تیار ہو گیا تو اس کے چاروں طرف باغ لگوایا اس باغ میں قسم قسم کے درخت لگائے گئے اور پھلوں پھولوں کے پودوں سے اسے سجایا گیا۔ سسی روزانہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ اس پر فضا اور خوش منظر باغ میں سیر کرنے جاتی اور اس طرح اس کی زندگی مسرتوں اور مسکراہٹوں میں بسر ہو رہی تھی۔

اس زمانے میں • بھنبھور بڑا مشہور شہر تھا ٹھٹھہ کے علاوہ دوسرے شہروں میں مال تجارت لانے والے کارواں زیادہ تر یہیں سے گزر کر آگے جاتے تھے کیونکہ یہ ایک بندرگاہ بھی تھی اس لیے یہاں تجارتی مال کی آر جار لگی رہتی تھی۔ خاص طور پر کیچ اور مکران سے اکثر قافلوں کا آنا جانا رہتا تھا۔ وہاں سے جو قافلے آتے تھے وہ آگے جانے سے پہلے یہاں پڑاؤ کرتے تھے اور کچھ روز یہاں ستا کے پھر آگے جاتے تھے۔ اس طرح جاتے میں بھی یہاں رکتے تھے اور آتے میں بھی ان کا یہاں پڑاؤ ہوتا تھا۔ کچھ سامان فروخت کرتے تھے‘ کچھ خریدتے تھے اور اس طرح یہاں تجارت کا سلسلہ چل رہا تھا۔ محمد دھوبی اس شہر کی ممتاز اور سرکردہ شخصیت تھی اور اکثر کارواں اس کے باغ میں پڑاؤ کرتے تھے اور اس کی مہمانداری سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔ جو لوگ وہاں قیام کرتے تھے وہ سسی کے حسن کا چرچا بھی سنتے تھے کیونکہ اس کی خوبصورتی کا شہرہ قریب و دُور تک پھیل چکا تھا اور لوگ آپس میں باتیں کرتے تو کسی نہ کسی طور سسی کے حسن کا ذکر ضرور آجاتا تھا۔ نہ جانے وہ اب تک کتنے لوگوں کے خوابوں کی ملکہ بن چکی تھی جن میں کئی ایسے بھی شامل تھے جو تجارت کے سلسلے میں دوسرے ملکوں اور شہروں سے • بھنبھور میں آتے تھے۔ جو کارواں باہر سے آتے تھے‘ وہ سسی کے حسن کے قصے سنتے اور واپس اپنے شہروں میں جا کر یاروں دوستوں سے اس کا ذکر کرتے۔ اگر اتفاق سے سسی کو کوئی دیکھ لیتا تو اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت انسان تصور کرنے لگتا اور واپس جا کر اس کے حسن و جوانی کی ایسی ایسی تعریفیں کرتا کہ سننے والے سنتے ہی رہ جاتے۔ اسی طرح ایک بار ایک کارواں کیچ مکران سے آیا اور حسب معمول کچھ دن • بھنبھور میں ٹھہر کے

واپس چلا گیا۔ کارواں کے لوگوں نے بھی • بھنبھور کے قیام کے دوران سسی کے حسن کا چرچا سنا تھا۔ جب یہ کارواں واپس کیچ مکران پہنچا تو کسی نے وہاں کے حکمران آری جام کے بیٹے پنوں سے سسی کے حسن کا ذکر کیا اور بتایا۔

"وہ اس قدر حسین و جمیل ہے کہ پورے • بھنبھور میں اس کی مثال نہیں ہے۔"

بتانے والوں نے پنوں سے یہاں تک کہا۔

"شہزادے! ایک " • بھنبھور " ہی کی کیا بات ہے سسی جیسی حسین لڑکی تو کیچ مکران میں بھی ملنی مشکل ہے۔ جو بھی اسے ایک بار دیکھ لیتا ہے' اسی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔!"

نوجوان شہزادے پنوں نے جب سسی کی اس قدر تعریف سنی تو اس کے دل میں اشتیاق پیدا ہوا کہ کسی طرح وہ بھی سسی کو دیکھے۔ وہ خود بھی حسین و جوان تھا لیکن لوگوں سے سسی کے حسن کی تعریف سن سن کر دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ وہ جوں جوں اس کی تعریف سنتا' لوگ اس کے بارے میں باتیں بتاتے' تو اس کا اشتیاق اور بڑھ جاتا' اس نے اپنے دل میں تہیہ کر لیا کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے' وہ سسی کو ضرور دیکھے گا۔ اس نے اپنے خاص مصاحبوں سے مشورہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"کوئی ایسی ترکیب کرو میں بھی • بھنبھور کی سسی دیکھ سکوں۔؟"

مصاحبوں نے رائے دی۔

"ایک قافلہ تیار کیا جائے جو مشک و عنبر لے کر • بھنبھور جائے اور آپ ایک بیوپاری کی حیثیت سے اس قافلے میں شامل ہو جائیں۔!"

پنوں کو یہ تجویز پسند آئی۔ واقعی اس طرح وہ سسی تک پہنچ سکے گا۔ چنانچہ اس نے اپنے باپ سے اجازت لی اور ایک کارواں تیار کرنے کا حکم دیا۔ اس کارواں میں تجارت کے لیے مشک و عنبر اور دیگر خوشبویات کا سامان تھا اور شہزادہ پنوں ایک بیوپاری کی حیثیت سے اس میں شامل تھا۔ جب یہ کارواں • بھنبھور پہنچا اور اس نے وہاں جا کر پڑاؤ کیا تو سارا شہر خوشبوؤں میں نہا گیا۔ ہر طرف خوشبو ہی خوشبو مہکنے لگی اور شہر بھر میں یہ خبر پھیل گئی کہ۔

"کیچ مکران سے ایک تاجر پنوں خوشبوؤں کی تجارت کرنے آیا ہے۔"

یہ خبر سنتے ہی لوگ مشک و عنبر اور دیگر خوشبوؤں کی خریداری کے لیے اس طرف جانے لگے جہاں کارواں ٹھہرا تھا۔ ادھر یہ خبر سسی تک بھی پہنچی اور وہ بھی اپنی سہیلیوں کو ساتھ لے کر وہاں گئی۔ آگے پنوں تو اسی لمحے کے انتظار میں تھا' اس نے جب سسی کو دیکھا تو واقعی دیکھتا رہ گیا۔ اس نے اس کی خوبصورتی کے بارے میں جو کچھ سنا تھا وہ تو اس سے بھی کہیں زیادہ حسین تھی۔ شہزادہ پنوں بھی اپنی جگہ اپنی مثال آپ تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا' نظریں چار ہوئیں تو دونوں ہی پہلی نظر میں گھائل ہو گئے۔ پنوں جو مشک و عنبر کی تجارت کرنے آیا تھا دل کی تجارت کر بیٹھا اور سسی جو خوشبو خریدنے گئی تھی وہ اپنا آپ فروخت کر بیٹھی تھی۔ وہ بھی بغیر کسی قیمت کے۔

سسی واپس گھر آ گئی مگر اس کی رگ رگ میں پنوں بس گیا تھا۔ وہ جس طرف دیکھتی اسے پنوں ہی کا چہرہ نظر آتا تھا۔ نہ کھانا اچھا لگ رہا تھا نہ پینا۔ نہ بیٹھے میں چین تھا نہ لیٹنے میں سکون تھا۔ وہ بے قرار اور بے تاب تھی۔ کیا کرے۔؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ آخر اس نے اپنی ایک رازدار سہیلی سے دل کی بات کہہ دی اور ساتھ ہی کہا۔

"کوئی ایسی تجویز کرو کہ پنوں ہمیشہ کے لیے میرا ہو جائے۔"

اس کی بات سن کر سہیلی سوچ میں پڑ گئی۔ اس کے ذہن میں ایک تجویز آئی اور اس نے جا کر محمد دھوبی اور اس کی بیوی سے سسی کا سارا حال بیان کر دیا اور کہا۔

"وہ پنوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکے گی۔ پھر یہ رشتہ بھی برا نہیں ہے۔ پنوں شہزادہ ہے جوان ہے' خوبصورت ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ سسی کی پسند ہے؟"

اس پر محمد دھوبی نے جواب دیا۔

"پنوں ایک تو پردیسی ہے۔ پھر اس کی ذات پات کا پتا نہیں' پھر کیسے یہ رشتہ کر دیا جائے؟ ہم اپنی بیٹی کا رشتہ برادری سے باہر نہیں کر سکتے پھر کیسے یہ رشتہ کر دیا جائے۔؟"

"سہیلی نے اپنی بات بنتے دیکھی تو جلدی سے بولی "میں نے معلوم کر لیا ہے اگرچہ مشک و عنبر

کی تجارت کرتا ہے مگر وہ بھی ذات کا دھوبی ہے۔ آپ لوگ اسے آزما کے دیکھ سکتے ہیں۔"
"اگر یہ بات ہے تو اسے بلواؤ ہم دیکھ لیتے ہیں۔"
محمد دھوبی کے اتنا کہنے پر وہ پہلے تو بھاگی بھاگی سسی کے پاس گئی اور اسے خوشخبری سناتے ہوئے کہا۔
"سسی! تمہاری خوش قسمتی کا دروازہ کھلنے والا ہے۔ تم نے پنوں مانگا تھا سو وہ تمہیں ملنے والا ہے۔"
پھر وہ پنوں کے پاس گئی اور اسے سمجھایا۔
"تم سسی کے ماں باپ کے پاس یہی کہنا کہ تم ذات کے دھوبی ہو۔ اگر تم سسی کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس کے لیے صرف یہی ایک راستہ ہے۔"

اس طرح ایک طرف اس نے پنوں کو سکھا پڑھا دیا اور دوسری جانب سسی کے ماں باپ کو یقین دلا دیا کہ پنوں اصل میں دھوبی ذات کا ہے اور مشک و عنبر کی تجارت تو وہ وقتی طور پر کر رہا ہے۔ اس کے بعد اس نے پنوں کو اپنے ساتھ لیا اور اسے محمد دھوبی اور اس کی بیوی کے پاس لے گئی۔ انہوں نے چند لمحے پنوں کا جائزہ لیا اور پھر محمد نے اسے میلے کپڑوں کا ایک بڑا گٹھا دے کر کہا۔
"جاؤ یہ کپڑے دھو کر لاؤ!"

پنوں عجیب امتحان میں پڑ گیا تھا لیکن وہ سسی کو حاصل کرنے کے لیے بڑی سے بڑی مصیبت برداشت کر سکتا تھا۔ حکمران کا بیٹا جو نازوں میں پلا بڑھا تھا' وہ شہزادہ میلے کپڑوں کا گٹھا اٹھا کر گھاٹ پر پہنچ گیا۔ اس نے زندگی میں آج تک اپنا کوئی کام نہ کیا تھا' پھر بھلا اتنے سارے کپڑے کیسے دھو لیتا۔؟ مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ کپڑے دھوتے دھوتے اس کا برا حال ہو گیا۔ ہاتھ زخمی ہو گئے اور کپڑے پھر بھی صاف نہ دھل سکے بلکہ کپڑے دھونے کا تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے کپڑے پھٹ گئے۔ یہ دیکھ کر وہ بہت گھبرایا کہ محمد پھٹے ہوئے کپڑے دیکھے گا تو اسے پتا چل جائے گا' میں دھوبی نہیں ہوں۔ اس صورت حال کا جب

سسی کو علم ہوا تو وہ بھی بہت پریشان ہوئی لیکن پھر اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی اس نے سہیلی کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ۔

"کپڑے تہہ کرنے کے بعد ہر کپڑے کی تہہ میں ایک سونے کی مہر رکھ دو تاکہ جن لوگوں کے کپڑے پھٹ گئے ہیں ان کو کوئی اعتراض نہ ہو۔"

پنوں نے ایسے ہی کیا اور کپڑے کی تہہ میں سونے کی ایک ایک مہر رکھ دی۔ اس طرح جب دھلے ہوئے کپڑے مالکوں تک پہنچا دیے گئے تو کسی کو بھی کپڑے پھٹنے کی شکایت نہ ہوئی بلکہ ہر شخص اپنی جگہ خوش تھا کہ اسے سونے کی مہر مل گئی ہے۔ اگر کسی کے کپڑے پھٹے بھی تھے تو اسے قیمت سے کہیں زیادہ پیسے مل گئے تھے۔ یوں پنوں کی رازداری بھی قائم رہی اور محمد دھوبی کو بھی یقین ہو گیا کہ پنوں ذات کا دھوبی ہی ہے۔ چنانچہ سسی کے لیے اس کا رشتہ منظور کر لیا۔ پنوں اور سسی اپنی اپنی جگہ دونوں انتہائی خوش تھے کہ ان کی مراد بر آنے والی ہے اور وہ چند ہی روز میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہو جائیں گے لیکن پیشتر اس کے کہ ان کی شادی ہوتی ایک اور رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ رکاوٹ یہ تھی کہ اس دوران میں ایک سنارن کا پنوں پر دل آ گیا اور وہ اس پر بری طرح فدا ہو گئی۔ اس نے کہا۔

"پنوں سے میں سسی کی شادی نہیں ہونے دوں گی اس سے میں خود شادی کروں گی۔"

اس نے پنوں کے پاس جا کر سسی پر الزام لگایا کہ اس کا چال چلن خراب ہے اور وہ تمہارے لائق نہیں ہے۔ اس زمانے میں یہ رسم تھی کہ جب کسی پر برے کردار کا الزام لگایا جاتا تھا تو اسے اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے آگ میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ سسی سے بھی یہی مطالبہ کیا گیا کہ وہ آگ میں سے گزرے تاکہ اس بات کا پتا چل جائے اس کا کردار اچھا ہے یا الزام صحیح ہے۔ سسی جانتی تھی کہ اس پر یہ الزام محض حسد کی بنا پر لگایا گیا ہے اور اس کا دامن صاف ہے اس لیے وہ فوراً تیار ہو گئی۔ جب وہ دہکتی آگ میں سے صحیح سلامت گزر گئی اور اسے کوئی نقصان نہ پہنچا تو سب کو اس کی پاک دامنی کا یقین آ گیا۔ محمد دھوبی نے اسی وقت سسی کی شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ سسی اس کی اکیلی بیٹی تھی اور وہ

اس کی شادی پر اپنے سارے ارمان پورے کرنا چاہتا تھا۔ اس کے گھر میں یہ پہلی اور آخری شادی تھی، پھر اللہ کی دی ہوئی دولت کا شمار نہ تھا، اس نے دل کھول کے شادی کے رسم و رواج پورے کیے اور بڑی شان و شوکت سے سسی اور پنوں کی شادی کی۔ اس شادی میں پنوں کے ساتھ آئے ہوئے اس کے ساتھیوں نے بھی شریک ہو کر خوشیاں منائیں۔ ان کا خیال تھا شادی کرنے کے بعد پنوں سسی کو ساتھ لے کر کیچ مکران چلے گا مگر اس نے وطن جانے کا خیال سرے ہی سے ترک کر دیا اور بھنبھور ہی میں مستقل قیام کر کے بیٹھ گیا۔

پنوں کے قافلے والوں نے کچھ روز اس کا انتظار کیا۔ وہ پردیس میں رہتے رہتے تنگ آ چکے تھے اور اب اپنے وطن جانا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا، پنوں چند دن بھنبھور میں رہ کر واپس چلنے پر راضی ہو جائے گا مگر اس کا چلنے کا کوئی ارادہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ انھوں نے اسے بہت سمجھایا مگر پنوں نے وہاں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی تھی۔ قافلے میں پنوں کا ایک بھائی چرو بھی شامل تھا، اس نے بھی بھائی کو بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ آخر مجبور ہو کر قافلے والے واپس مکران چلے گئے اور وہاں جا کر چرو نے اپنے باپ آری جام کو صورتحال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ پنوں نے وہاں سسی سے شادی کر لی ہے اور وہیں رہ گیا ہے، ہم نے اسے بہت سمجھایا مگر اس نے ہماری بات نہیں مانی۔ باپ نے یہ سنا تو بہت پریشان ہوا۔ پنوں اپنے بھائیوں میں چھوٹا تھا اور باپ اس سے بہت زیادہ محبت کرتا تھا۔ اس کی جدائی اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اس نے اسی وقت ایک قاصد بھنبھور کی طرف روانہ کیا اور پنوں کو پیغام بھیجا کہ فوراً واپس وطن آ جائے۔ قاصد جب یہ پیغام لے کر بھنبھور پہنچا تو اس نے دیکھا پنوں وہاں ایک گھاٹ پر دوسرے دھوبیوں کے ساتھ کپڑے دھو رہا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا اور قریب جا کر کہا۔

"حضور! یہ کام آپ کی شان کے خلاف ہے۔ آپ شہزادہ ہیں، واپس چل کر وطن میں سرداری کریں۔"

اس نے اسے باپ کا پیغام بھی پہنچایا لیکن پنوں نے واپس جانے سے صاف انکار کر دیا اور

کہا۔

"تم واپس جا کر میرے باپ اور بھائیوں سے کہہ دینا' وہ مجھے بھول جائیں اور میرے واپس آنے کی امید نہ رکھیں۔ میرا وطن وہی ہے جہاں میری سسی ہے۔"

قاصد بیچارہ کیا کر سکتا تھا؟ وہ اپنے طور پر جتنا پنوں کو سمجھا سکتا تھا اس نے سمجھایا اور جتنا مجبور کر سکتا تھا کیا اور جب پنوں نے ایک نہ سنی تو وہ بھی ناکام واپس آ گیا۔ اس نے جب واپس آ کر آری جام کو حالات سے آگاہ کیا تو اس کے ہوش جاتے رہے۔ بڑھاپے میں اسے پیارے بیٹے کی جدائی برداشت کرنا پڑ رہی تھی۔ وہ اس کے غم میں اس طرح نظر آنے لگا تھا جیسے برسوں کا بیمار ہو۔ دن رات پنوں کی یاد میں آنسو بہاتا رہتا تھا اور اس کی یہ حالت دیکھ کر پنوں کے تینوں بھائی چرو' ہوتی اور نوتی نے آپس میں مشورہ کیا۔

"ہمیں اپنے باپ کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ اب تو اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔"؟

پھر انھوں نے آپس میں طے کیا۔

"چاہے کچھ بھی ہو' ہمیں ہر صورت میں پنوں کو واپس لانا چاہیے۔"

اور پھر ایک روز انھوں نے انتہائی تیز رفتار اونٹ تیار کیے اور تینوں ان پر سوار ہو کر بھنبھور کی طرف چل دیے جب وہ بھنبھور پہنچے تو پنوں اور سسی نے ان کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ پنوں نے خوش آمدید کہتے ہوئے کہا۔

"میری خوش قسمتی ہے کہ میرے بھائی میرے پاس آئے ہیں۔"

سسی ان کی آمد میں خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

"آپ لوگوں کی خاطر تواضع کر کے مجھے دلی خوشی ہو گی۔"

اس طرح تینوں بھائیوں کی خوب آؤ بھگت ہوئی اور ان کی آمد کی خوشی میں جشن منایا گیا۔ ان کی مہمان نوازی کے لیے روزانہ نئے سے نئے پکوان تیار ہوتے اور ہر رات محفل سجتی۔ اس طرح وہ پنوں اور سسی کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہو رہے تھے لیکن وہ جس مقصد کے لیے بھنبھور آئے تھے' انھوں نے اسے فراموش نہیں کیا تھا جب بھی موقع پاتے

پنوں کو سمجھاتے اور باپ کی حالت بتاتے کہ وہ تمہارے غم میں سوکھ کے کانٹا ہوا جارہا ہے' ہر وقت تمہیں یاد کرتا رہتا ہے۔ انھوں نے یہ تک کہا کہ۔

"اگر تم واپس نہ گئے تو باپ کا زندہ رہنا مشکل ہو جائے گا۔"

مگر ان کی یہ ساری کوششیں بیکار ثابت ہو رہی تھیں۔ پنوں اپنی اس نئی دنیا کو چھوڑنے کے لیے قطعی تیار نہ تھا۔ اس نے بھائیوں سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اس کی امید چھوڑ دیں' اور باپ سے بھی کہہ دیں وہ مجھے بھول جائے۔ تینوں بھائی اس کا دوٹوک جواب سن کر خاموش ہو گئے اور کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگے جس سے اسے وطن لے جایا جا سکے۔

ایک رات معمول کے مطابق محفل جمی ہوئی تھی اور تینوں بھائی پنوں کے ساتھ ناؤ نوش میں مصروف تھے۔ وہ آپس میں باتیں کرتے ہوئے رات دیر تک مست رہے۔ اس وقت پنوں کے بھائیوں نے یہ ہوشیاری کی کہ خود تو بہت کم پی رہے تھے مگر پنوں کو پیالے بھر بھر کے دے رہے تھے۔ اس طرح پیتے پلاتے بہت رات گزر گئی اور دوسری جانب سسی پنوں کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی اس پر نیند کا غلبہ ہوا اور وہ سو گئی۔ اس وقت تک پنوں کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ اسے ہوش تک نہ رہا تھا۔ بھائیوں نے اسے اس قدر زیادہ پلا دی تھی کہ وہ بالکل بے ہوش ہو چکا تھا۔ تینوں بھائی اسی موقع کے منتظر تھے۔ انھوں نے جب پنوں کی یہ حالت دیکھی تو ایک دوسرے سے کہنے لگے۔

"جلدی کرو۔ کہیں اسے ہوش نہ آجائے!"

انھوں نے اپنے تیز رفتار اونٹوں کو بالکل تیار رکھا ہوا تھا اور ان پر پالان وغیرہ پہلے ہی سے کسے ہوئے تھے' لہٰذا بڑی تیزی سے تینوں نے پنوں کو اٹھایا اور ایک اونٹ پر سوار کر کے خود بھی اونٹوں پر سوار ہو کر مکران کی طرف چل دیے۔ وہ بڑی تیز رفتاری سے اونٹ دوڑاتے ہوئے چلے جا رہے تھے کہ جتنی جلدی ہو سکے ۔ بھنبھور کے علاقے سے دور نکل جائیں۔

ادھر جب صبح سسی کی آنکھ کھلی تو دیکھا پنوں وہاں نہیں تھا۔ وہ پریشانی میں گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئی اور محل میں ادھر ادھر اسے تلاش کرنے لگی مگر پنوں وہاں ہوتا تو ملتا۔ وہ تو نہ جانے اس سے کتنی دور جا چکا تھا۔ یکایک اسے خیال آیا۔

"یقیناً اس کے بھائی اسے اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ مجھے پہلے ہی ان کی نیت ٹھیک نہیں لگتی تھی۔"

یہ خیال آتے ہی وہ پاگلوں کی طرح چیختی چلاتی ادھر ادھر بھاگنے دوڑنے لگی۔ اس کی چیخ پکار سن کر نوکر چاکر جمع ہو گئے' ماں باپ بھی آ گئے اور اسے سمجھانے لگے لیکن وہ تو جیسے واقعی دیوانی ہو گئی تھی۔ بار بار یہی پکار رہی تھی۔

"میرا پنوں کہاں ہے۔؟ میں پنوں کو تلاش کروں گی۔!"

اسی طرح چیختے چلاتے وہ سب کو چھوڑ کر دیوانوں کی طرح مکران کی طرف دوڑنے لگی۔ اسے بہت روکا گیا' سمجھانے کی کوشش کی گی لیکن اس نے نہ کسی کی بات سنی نہ مانی اور دوڑتی ہوئی جنگل کی طرف چلی گئی۔ گھر والوں نے کچھ دور تک اس کا پیچھا کیا اور پھر مایوس ہو کر پلٹ آئے۔

سسی دیوانہ وار بھاگتی ہوئی جا رہی تھی۔ ویران اور سنسان بیابان' خطرناک پہاڑیاں اور کھائیاں' اونچے نیچے اور ٹیڑھے میڑھے راستے' نوکیلے پتھر اور تپتی ہوئی ریت' وہ دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ اسے نہ یہ پتا تھا کہ کہاں جا رہی ہے اور نہ یہ جانتی تھی کہ اسے کہاں جانا ہے۔؟ کدھر جانا ہے۔؟ وہ تو بھاگی جا رہی تھی اور پاگلوں کی طرح پنوں پنوں پکار رہی تھی۔ دوپہر ہو چکی تھی اور سورج آگ برسا رہا تھا۔ پیاس کی شدت سے اس کا حلق خشک ہو گیا تھا اس کے پاؤں زخمی ہو چکے تھے۔ پھر بھی وہ ہانپتی اور کانپتی ہوئی دوڑتی جا رہی تھی اس کی ہمت بار بار جواب دے رہی تھی لیکن ہر بار پنوں کی محبت اسے حوصلہ دیتی اور وہ پھر آگے بڑھنے لگتی۔ اسی طرح وہ تپتی ہوئی زمین پر سفر کرتی اور خطرناک راستوں سے گزرتی ہوئی تقریباً چالیس کوس تک چلی گئی اور اب وہ پب کی پہاڑیوں میں ماری ماری پھر رہی تھی اس کی پیاس

اس قدر شدید ہو گئی تھی کہ قدم اٹھانا بھی اس کے لیے محال ہو رہا تھا۔ وہ چلتے چلتے غش کھا کر گر پڑی اس کے لبوں پر پانی پانی کی پکار تھی اور وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں آگ کی طرح تپتی ہوئی زمین پر پڑی تھی۔ اس موقع پر شاید قدرت کو اس پر رحم آگیا تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں پانی کا ایک چشمہ پھوٹ پڑا۔ اس نے جلدی سے پانی پی کر اپنی پیاس بجھائی اور اسے قدرے ہوش آیا۔ اس نے کچھ دیر وہاں آرام کیا اور تازہ دم ہو کر پھر سے اپنے ان جانے سفر پر چل دی۔ روایت بیان کی جاتی ہے کہ وہ چشمہ چھوٹے تالاب کی صورت میں آج تک وہاں موجود ہے جو ہمیشہ پانی سے بھرا رہتا ہے اور کبھی خشک نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ سسی نے گزشتہ رات مہندی لگائی تھی اور اس وقت کے رواج کے مطابق مہندی کی شاخ ہاتھ میں لے کر سوئی تھی، جاگتے وقت یہ مہندی کی شاخ اس کے ہاتھ میں تھی اور اس نے اسی شاخ کو اس مقام پر بو دیا تھا۔ یہ شاخ پھل پھول کر درخت بن گئی اور آج تک اس شکستہ دل کی یادگار کے طور پر موجود ہے۔

سسی تازہ دم ہو کر پھر چلنے لگی اور ابھی چھ سات کوس پہاڑی راستہ مزید چلی تھی کہ اس کے پاؤں بری طرح زخمی ہو گئے اب اس سے آگے بڑھنا مشکل ہو گیا تھا۔ ایک بار پھر وہ پیاس کی شدت میں بیکل ہو گئی مگر چشمہ تو اتنی دور پیچھے رہ گیا تھا کہ اس تک پہنچنا مشکل تھا۔ وہ اس پہاڑی راستے میں ماری ماری پھر رہی تھی کہ دور سے ایک چرواہے نے اسے دیکھا۔ وہ بڑا حیران ہوا، اس ویران اور سنسان جگہ پر یہ کون عورت گھومتی پھر رہی ہے۔؟ اس نے قریب پہنچ کر دیکھا تو ایک حسین و جوان عورت اس کے سامنے کھڑی تھی۔ سسی اسے دیکھتے ہی بے تابی سے پوچھنے لگی۔

"تم نے میرا پنوں تو نہیں دیکھا۔؟"

چرواہا تو اسے ایک نظر دیکھتے ہی بد نیت ہو چکا تھا۔ وہ جواب میں مسکراتے ہوئے بولا۔

"تم ایک پنوں کو ڈھونڈ رہی ہو۔ اس دنیا میں تو ہزاروں پنوں ہیں۔"

اس نے یہ کہا اور سسی کو بری نیت سے اپنے ساتھ لے جانا چاہا۔ سسی بھی اس کا

ارادہ بھانپ گئی تھی مگر وہ اس ویرانے میں اپنی مدد کے لیے کسے پکار سکتی تھی۔؟اس وقت وہ تو قسمت کی ماری ہوئی اپنی مصیبت میں گرفتار تھی چرواہے سے کہنے لگی۔

اے بے درد انسان! میں پیاس سے مری جا رہی ہوں اور تو مجھ پر فریفتہ ہو رہا ہے۔ تجھے خدا کا خوف کرنا چاہیے اور پہلے میری پیاس بجھانی چاہیے۔!

چرواہا سسی کی یہ بات سن کر بھاگ کے اپنے گلے کے پاس گیا تاکہ اس کے لیے کچھ دودھ لائے۔ اس نے سوچا تھا' اگر میں اس کی پیاس بجھانے کا بندوبست کر دوں گا تو یہ میرے ساتھ چلنے کے لیے راضی ہو جائے گی۔ جونہی وہ اپنے گلے کی طرف گیا تو بدقسمت سسی نے اس بے بسی کے عالم میں اللہ کو یاد کیا کہ اسے اس مصیبت سے نجات مل جائے۔ اس نے بارگاہ الٰہی میں گڑگڑا کے دعا کی۔

"اے بے بسوں کے چارہ ساز! اے مجبوروں کی فریاد سننے والے! اس مصیبت کے وقت میری مدد کر۔ میں پنوں کی امانت ہوں' میری پاک دامنی پر حرف نہ آئے۔ اس ویرانے میں تو ہی میری فریاد سننے والا ہے۔!"

بے بس اور بے کس سسی کی دعا اللہ نے قبول کر لی' اسی وقت ایک چٹان میں شگاف پیدا ہو گیا اور سسی اس میں سما گئی اور شگاف پھر سے بند ہو گیا۔ اتفاق سے اس کے پلو کا کچھ حصہ باہر رہ گیا تھا جب چرواہا دودھ لے کر واپس آیا تو وہاں سسی کو نہ پا کر بڑا پریشان ہو ادھر ادھر دیکھنے لگا اور جب اس کی نظر اس پتھر پر پڑی جس میں وہ سمائی تھی تو یہ عبرتناک منظر دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا۔ وہ اسی وقت سجدے میں گر کے اللہ سے اپنے گناہ کی معافی مانگنے لگا۔

"اے اللہ! میں خطاکار ہوں مجھے معاف کر دے۔ تو خطاکاروں کو بخشنے والا ہے۔"

اس طرح چرواہا اپنے گناہوں سے تائب ہو گیا۔ اس نے سسی کی آخری آرام گاہ کی نشاندہی کے لیے اس کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے پتھروں کا حصار سا بنا دیا تاکہ دیکھنے والوں کو پتا چل جائے کہ یہ کسی کی قبر ہے۔

دوسری طرف تینوں بھائی پنوں کو مکران لے جا رہے تھے۔ انھوں نے اسے اونٹ پر

باندھ رکھا تھا اور اونٹوں کو دوڑاتے چلے جا رہے تھے کیونکہ وہ جلد سے جلد اپنے باپ کے پاس پہنچ جانا چاہتے تھے تاکہ اسے پنوں سے ملا سکیں۔ پنوں بے ہوش تھا لیکن کب تک بے ہوش رہتا، راستے میں ایک جگہ اسے ہوش آ گیا۔ اس نے ہلنے جلنے کی کوشش کی تو اپنے آپ کو اونٹ پر بندھا ہوا پایا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو بھائی اسے اپنے ساتھ لے جا رہے تھے۔

وہ سمجھ گیا کہ وہ اسے بے ہوش کر کے اغوا کر لائے ہیں۔ اس نے پوچھا۔

"تم لوگ مجھے دھوکے سے لے آئے ہو۔ اب کہاں لے جا رہے ہو۔؟"

مگر بھائیوں نے اسے کوئی جواب نہ دیا بلکہ اپنے اونٹوں کو اور بھی تیزی سے دوڑانے لگے۔

"میں مکران نہیں جاؤں گا۔ مجھے چھوڑ دو۔۔۔ مجھے میری سسی کے پاس جانے دو!"

بھائیوں نے اسے کوئی جواب نہ دیا اور وہ اسے جواب دینا بھی نہیں چاہتے تھے۔ پنوں نے کوشش کی کہ کسی طرح اس کے بند کھل جائیں اور وہ آزاد ہو جائے لیکن یہ مشکل تھا، اس کے بھائیوں نے اسے بڑی مضبوطی سے باندھا ہوا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے، اگر یہ آزاد ہو گیا تو پھر اسے لے جانا بہت دشوار ہو جائے گا چنانچہ وہ اسی طرح اسے اپنے باپ کے پاس لے آئے۔ آری جام نے پنوں کو دیکھا تو بہت خوش ہوا لیکن جب اس نے اس کی حالت دیکھی تو بہت افسوس کرنے لگا۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔

"مجھے چھوڑ دو۔ مجھے سسی کے پاس جانے دو۔۔۔ میں سسی کے پاس جاؤں گا۔"

باپ کو خوف ہوا کہ کہیں اس کا بیٹا سسی کی جدائی میں جان ہی نہ دے ڈالے۔ اس نے دو چار روز اسے سمجھانے منانے کی کوشش کی لیکن سب بے سود۔ آخر مجبور ہو کر اس نے دوسرے بیٹوں سے کہا۔

"اسے اپنے ساتھ بھنبھور لے جاؤ اور جس طرح بھی ہو سکے سسی کو بھی ساتھ لے کر آؤ۔"

تینوں بھائیوں نے اسی وقت تیاری کی اور پنوں کو ساتھ لے کر اونٹوں پر سوار ہو گئے۔

جب وہ چلنے لگے تو باپ نے تاکید کی۔

"دیکھنا، سسی کو ہر صورت میں ساتھ لانا۔ اور جلد سے جلد واپس آنا۔؟"

"آپ بے فکر رہیں۔۔۔۔ ایسا ہی ہو گا۔"

انھوں نے باپ کو یقین دلاتے ہوئے جواب دیا اور بھنبھور کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ جلد سے جلد اپنی منزل پر پہنچنا چاہتے تھے تاکہ سسی کو لے کر آئیں اور ان کا باپ خوش ہو لیکن ان سے کہیں زیادہ پنوں کو عجلت تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ جس قدر جلد ہو وہ سسی کے پاس پہنچ جائے، اگر اس کے پر ہوتے تو وہ فوراً اڑ کے وہاں چلا جاتا۔ وہ جب سے سسی سے جدا ہوا تھا اس وقت سے ہر پل تڑپ تڑپ کر گزار رہا تھا۔ اسی طرح اونٹوں کو دوڑاتے، سفر کرتے جب وہ اس جگہ کے قریب پہنچے جہاں سسی سمائی تھی تو پنوں کو کسی غیبی آواز نے روک لیا۔ اس نے اونٹ کی مہار کھینچ لی اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اچانک اس کی نظر اس تازہ قبر پر پڑی جس میں سے پلو باہر نکلا ہوا تھا۔ اتفاق سے عین اس وقت وہ چرواہا بھی وہاں آنکلا جس نے سسی کی قبر بنائی تھی۔ پنوں نے اس سے دریافت کیا۔

"یہ قبر کس کی ہے۔۔۔؟ اور اس میں سے یہ پلو باہر کیوں نکلا ہوا ہے۔؟

جواب میں چرواہے نے روتے ہوئے اسے ساری کہانی سنائی اور بتایا کہ اس طرح ایک خوبصورت عورت پنوں پنوں پکارتی ہوئی یہاں آئی تھی، اس بدنصیب کی بہت بری حالت تھی اور یہ قبر اسی کی ہے جس کے دوپٹے کا پلو باہر رہ گیا۔ مرتے وقت بھی اس کے لبوں پر پنوں کا نام تھا اور وہ اسی کو ڈھونڈتی ہوئی موت کے منہ میں چلی گئی۔ پنوں نے جب چرواہے سے یہ سنا تو بے اختیار رونے لگا۔ پھر اس نے بھائیوں کے پاس جا کر ان سے کہا۔

"تم لوگ تھوڑی دیر ٹھہرو، میں اس قبر پر فاتحہ پڑھ لوں۔"

اس کے بعد وہ قبر پر آیا اور آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر دعا مانگی۔

"اے بچھڑے ہوؤں کے ملانے والے۔۔۔۔ اے ناامیدوں کی امید گاہ! مجھے میری سسی سے ملا دے!"

دعا کا مانگنا تھا کہ اچانک چٹان میں پھر سے شگاف پڑ گیا اور وہ سسی سسی پکارتا ہوا اس میں سما گیا۔ چٹان کا شگاف پھر سے بند ہو گیا اور اس طرح سچے دو پیار کرنے والے دونوں ایک

دوسرے سے ہمیشہ کے لیے مل گئے۔ یہ واقعہ دیکھ کر پنوں کے تینوں بھائی حیرت میں ڈوب گئے۔ وہ کچھ دیر تک وہاں کھڑے آنسو بہاتے رہے' پھر انھوں نے فاتحہ پڑھی اور اس کے بعد واپس مکران کی جانب چل دیے۔

روایت ہے کہ ملتان کا ایک اسماعیل نامی درویش ان دونوں سچے عاشقوں کی زیارت کے لیے آیا اور اپنے اونٹ کو دور چھوڑ کر ان کے دیدار کی آرزو میں تین دن بھوکا بیٹھا رہا۔ تین روز کے بعد ایک بوڑھی عورت چند روٹیاں اور تھوڑا پانی لے کر ظاہر ہوئی۔ درویش نے اس سے کہا۔

"جب تک میں سسی اور پنوں کو نہ دیکھوں گا' تب تک ہرگز کچھ نہ کھاؤں پیوں گا۔"

جواب میں بوڑھی بولی۔

"سسی تو میں ہوں لیکن تم پنوں کو دیکھنے کا خیال چھوڑ دو کیونکہ زمانے کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ میں پہلے ہی دیوروں کی ستائی ہوئی ہوں۔"

درویش کہنے لگا۔

"مجھے یہ کیسے یقین ہو کہ تم ہی سسی ہو۔؟ سسی تو حسین اور نوجوان تھی اور تم بوڑھی عورت ہو۔؟"

جیسے ہی درویش نے یہ کہا تو بوڑھی عورت نے فوراً اپنے آپ کو اصلی اور جوان روپ میں ظاہر کیا اور درویش سے بولی۔

"اب تو تم کچھ کھالو۔!؟"

لیکن درویش نے پھر کہا۔

"جب تک میں تم دونوں کو نہ دیکھ لوں گا اس وقت تک ہرگز کچھ نہ کھاؤں پیوں گا' خواہ میں بھوکا پیاسا ہی کیوں نہ مرجاؤں۔ میں نے یہ عہد کیا ہے۔"

آخر بڑے ردوقد کے بعد سسی نے لحد میں جا کر پنوں کو کمر تک باہر نکالا مگر اس نے اسے دونوں ہاتھوں سے اپنی گرفت میں لیے رکھا تاکہ پہلے کی طرح پھر کوئی اسے نہ لے جائے۔

لیلا چنیسر

یہ عوامی داستان تیرھویں صدی عیسوی کے دور کی ہے جب سندھ پر سومرہ خاندان حکومت کر رہا تھا۔ اس زمانے میں کوٹ دیول کا حکمران چنیسر تھا جو سومرہ سلسلے ہی سے تعلق رکھتا تھا۔ چنیسر کو اللہ نے دولت و ثروت کے ساتھ ساتھ مردانہ حسن و وجاہت سے بھی نوازا تھا اور وہ بڑی شان و شوکت سے حکومت کر رہا تھا۔ اس کی حکمرانی میں لوگ امن چین کی زندگی گزار رہے تھے اور وہ اپنے ذاتی اوصاف اور برتاؤ کی وجہ سے رعایا میں بے حد ہردلعزیز تھا۔ چنیسر اگرچہ خود بھی خوبصورت شخصیت کا مالک تھا' وجیہہ و شکیل تھا لیکن اس کی بیوی اس سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ لیلا جس قدر حسین و جمیل تھی اس سے کہیں زیادہ باکردار بھی تھی اس کی نیکی ' رحم دلی اور غریب پروری مشہور تھی۔ دونوں میاں بیوی میں بڑی محبت تھی اور وہ عیش و آرام سے زندگی بسر کر رہے تھے۔

اسی زمانے میں لکھپت کے صوبے پر ایک ہندو راجا راج کر رہا تھا جس کا نام رانا کھنگار تھا۔ یہ سولنگی راجپوتوں کی نسل میں سے تھا اور اس کی رانی کا نام مرکھی تھی۔ اس راجا کی ایک بیٹی تھی جو ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی اور اس کا نام کونرو تھا۔ کونرو بڑی حسین و جوان

تھی اور اس کے حسن کا چرچا پورے لکھپت میں ہوتا تھا۔ اس کی منگنی اس کے چچا زاد اتماری سے ہو چکی تھی اس کے باوجود اس پر مرنے والے نوجوانوں کی کمی نہ تھی۔ اس کے منگیتر کی بہن کا نام جمنی تھا جو کونرو کی قریبی خاص سہیلی تھی اور وہ زیادہ وقت کونرو کے ساتھ ہی گزارتی تھی۔ دونوں اکٹھی اٹھتی بیٹھتی تھیں' ایک ساتھ آتی جاتی تھیں' اور ایک دوسرے کو چاہتی بھی تھیں۔ ایک دن جمنی نے کونرو سے کہا۔

''ہم دونوں سارا دن ایک دوسرے سے باتیں کرتی رہتی ہیں' کچھ ایسی ترکیب کریں کہ دوسری سہیلیاں بھی ہمارے ساتھ زیادہ وقت گزارا کریں۔؟''

کونرو کے اس جواب میں جمنی نے تجویز پیش کرتے ہوئے کہا۔

''تم ہمارے قبیلے کی لڑکیوں میں سب سے زیادہ حسین ہو اور پھر ہمارے ملک کی راج کماری بھی ہو' اس لیے تمہیں چاہیے کہ ساری سہیلیوں سے کہو' وہ اپنے اپنے چرخے لے کر یہیں آ جایا کریں۔ اس طرح وہ اپنی کتائی بنائی کا کام بھی کرتی رہیں گی اور ہم سب باتیں بھی کیا کریں گی۔ اس طرح تمہارا دل بھی بہلا رہے گا۔!''

کونرو کو جمنی کی یہ تجویز پسند آئی اور خوش ہو کر بولی۔

''تم ٹھیک کہتی ہو' میں نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں تھا۔''

پھر اس نے ایسے ہی کیا۔ روزانہ تمام سہیلیاں اپنے اپنے چرخے لے کر جمع ہو جاتیں اس طرح کاتنے اور سینے پرونے کے ساتھ ساتھ آپس میں تفریح کی باتیں بھی کرتی رہتیں۔ اس میں شک نہیں کہ کونرو اپنی ساری سہیلیوں میں حسین و جمیل تھی لیکن اسے اپنے حسن پر گھمنڈ بھی بہت تھا۔ پھر یہ بھی تھا کہ وہ راجا کی بیٹی تھی اور اسے غرور تھا کہ میں راجکماری ہوں۔ وہ ہر وقت بناؤ سنگھار کیے رہتی تھی' سہیلیوں میں بڑھ چڑھ کر باتیں کرتی اور بڑے ناز نخرے دکھاتی' وقت بے وقت اپنی خوبصورتی کا مظاہرہ کرتی اور بات بات پر اپنی بڑائی بتاتی۔ ایک دن وہ اسی طرح اپنی سہیلیوں میں بیٹھی باتیں کر رہی تھی کہ اچانک اٹھی اور اچھل کر دوسری سہیلی کی جانب جانے لگی' اتنے میں اس کا دوپٹا جمنی کے چرخے میں الجھ گیا اور چرخہ

الٹ گیا۔ جمنی کو غصہ آگیا' وہ بڑے طنزیہ لہجے میں بولی۔

"تم تو اس طرح نخرے کرتی ہو جیسے تمہاری چنیسر سے شادی ہو رہی ہو۔!"

جمنی کی یہ بات کونرو کے سینے میں تیر کی طرح لگی اور وہ تلملا کر رہ گئی۔ اس نے غصیلی آنکھوں سے جمنی کی جانب دیکھا اور سخت لہجے میں کہا۔

"اگر یہ بات ہے تو میں یہ بھی کر کے دکھاؤں گی۔ اپنے بھائی سے کہہ دینا' اب مجھے اس کی ضرورت نہیں میں اب چنیسر ہی سے شادی کروں گی۔"

اس نے پکا ارادہ کر لیا کہ چاہے کچھ بھی کیوں نہ ہو جائے وہ چنیسر سے شادی کر کے رہے گی۔ جب اس کی ساری سہیلیاں چلی گئیں تو اس نے اپنی ماں مرکھی سے کہا۔ "ماں! میں سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔!!"

"کیا کہا۔؟ تم چنیسر شادی کرو گی۔؟ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔؟"

ماں اسے ڈانٹتے ہوئے بولی۔

"ہاں میں چنیسر سے شادی کروں گی۔ اور ضرور کروں گی۔"

"ماں کو بیٹی کی اس بات پر حیرت تو ضرور ہوئی تھی لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی اس کی بیٹی لاکھوں میں ایک ہے اور اس کی خوبصورتی کا بھی چرچا ہے۔ اگر چنیسر اسے دیکھ لے تو ہو سکتا ہے وہ اس پر فریفتہ ہو جائے اور یہ اس کی بیوی بن جائے' اگر ایسا ہو جائے تو ہمارا راج بھی مضبوط ہو جائے گا۔

چونکہ چنیسر کی خوبصورتی کی بھی شہرت تھی اور پھر وہ اس وقت سندھ کا حکمران تھا اس لیے بہت سی نوجوان لڑکیوں کی یہ خواہش تھی کہ ان کی اس سے شادی ہو جائے۔ مرکھی بھی یہی سوچ رہی تھی کہ میری بیٹی اگر چنیسر کے محل میں چلی جائے تو اچھا ہو گا۔ اگرچہ اسے یہ بھی احساس تھا کہ یہ ایک ان ہونی سی تمنا ہے' اس کے باوجود وہ اپنی بیٹی کے اس خیال کے خلاف نہ تھی۔ اس رات جب رانا کھنگار محل میں آیا اور اس نے تھوڑی دیر تک ستا لیا تو اس نے کونرو کی بات چھیڑ دی۔ کہنے لگی۔

"کونرو تو چینسر سے شادی کے خواب دیکھ رہی ہے۔ اس کا کہنا ہے' خواہ کچھ بھی ہو جائے وہ اس سے شادی کر کے رہے گی۔"

راناکھنگار بیوی کی زبانی بیٹی کی خواہش کے بارے میں سن کر کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ وہ بھی یہی سوچنے لگا تھا کہ اس کی بیٹی حسن میں اپنی مثال آپ ہے' ممکن ہے چینسر اسے دیکھ لے تو اس سے شادی کرنے پر راضی ہو جائے۔ اگر ایسا ہو جائے تو میرا راج پاٹ بھی ہر طرح سے محفوظ ہو جائے گا اور میں دوسرے راجوں میں سربلند کر کے بیٹھوں گا۔ تاہم اس سلسلے میں اسے یقین نہیں تھا کیونکہ وہ چینسر کی عادات اور برتاؤ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا مگر اسے اتنا ضرور معلوم تھا کہ ہر جوان لڑکی چینسر کی بیوی بننے کے خواب دیکھتی ہے' اس لیے اگر کونرو کی بھی یہ خواہش ہے تو کوئی اچھنبے کی بات نہیں ہے۔ اس کے باوجود وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو سکتا ہے۔؟ اس نے پہلے تو بیٹی کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے اسے سمجھایا۔

"بیٹی ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ اپنا خیال ترک کر دے۔!"

مگر کونرو کا یہی جواب تھا۔

"میں یہ ممکن کر کے دکھاؤں گی۔ میں چینسر کو حاصل کر کے رہوں گی۔!"

جب کھنگار نے دیکھا کہ بیٹی کسی صورت اپنی ضد سے باز نہیں آ رہی تو اس نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا اور دونوں نے آپس میں طے کیا کہ اسے اپنی کوشش کر لینے دو۔ پھر اس نے سوچا کہ اگر یہ اکیلی چلی گئی تو نہ جانے کہاں کہاں ماری ماری پھرے' کسی مصیبت ہی کا شکار نہ ہو جائے اور چینسر سے شادی کے چکر میں کہیں اپنی جان ہی سے ہاتھ نہ دھو ڈالے' اس لیے اس نے بیوی سے کہا۔

"یہ تو اپنے ارادے سے باز نہیں آ رہی۔ بہتر یہ ہے کہ تم بھی اس کے ساتھ جاؤ اور دیول جا کر کوئی ایسی ترکیب کرو کہ کوئی راستہ نکل آئے۔ ہو سکتا ہے چینسر سے ملنے کی کوئی سبیل پیدا ہو جائے؟"

اس کے ساتھ ہی اس نے بیوی کو یہ بھی مشورہ دیا کہ تم دونوں تاجروں کے روپ میں دیول جاؤ' اس طرح اونچے طبقے تک رسائی ممکن ہو سکے گی۔ بیوی کو کھنگار کی یہ تجویز پسند آئی۔ لہٰذا ایسے سازوسامان کا اہتمام کیا گیا جو وہاں جا کر فروخت کیا جا سکے۔ اس کے بعد ماں بیٹی نے بھی ایسا بھیس اختیار کر لیا جس سے وہ تاجر طبقے سے تعلق رکھنے والی دکھائی دیں۔ پھر انھوں نے چند ملازم ساتھ لیے اور رخصت ہو کر دیول کی طرف چل دیں۔ وہ اس سے پہلے کبھی دیول نہیں گئی تھیں اس لیے انھوں نے سفر شروع کرنے سے پہلے وہاں کے بارے میں پوری پوری معلومات حاصل کر لی تھیں۔ پہلے ڈھٹ کا علاقہ آتا تھا جو انھوں نے عبور کیا' اس کے بعد راہ میں دریائے پربت پڑتا تھا وہ بھی پار کیا اور پھر اسی طرح چلتی چلاتی دیول پہنچ گئیں۔ وہاں جا کر سب سے پہلے مرکھی نے یہ کوشش کی کہ کوئی ایسا وسیلہ مل جائے جس کے سہارے چنیسر تک رسائی حاصل کر سکیں مگر ایسا وسیلہ ملنا مشکل ہو رہا تھا۔ انھوں نے ہمت نہ ہاری اور ماں بیٹی مسلسل اسی کوشش میں لگی رہیں۔ ان کی خوش قسمتی تھی کہ ان کی راہ و رسم ایک ایسی مالن سے پیدا ہو گئی جس کا چنیسر کے محل میں آنا جانا تھا' یہ روزانہ وہاں تازہ پھولوں کے ہار اور پھول لے کر جاتی تھی اور وہاں کے حالات سے پوری طرح آگاہ تھی۔ انھوں نے اس سے تعلقات پیدا کر کے گہری دوستی کر لی تاکہ اس کی مدد حاصل کی جا سکے۔ ایک روز مرکھی نے اس سے کہا۔

"بہن! ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔؟"

"میری مدد۔؟ میں تاجروں کی کیا مدد کر سکتی ہوں۔؟"

"بہن! دراصل ہم تاجر نہیں ہیں۔ ہم نے تاجروں کا بھیس اس لیے اختیار کیا ہے کہ ہم چنیسر سے ملنا چاہتے ہیں۔ تم روزانہ ان کے محل میں جاتی ہو' وہاں کے حالات سے واقف ہو' ہمیں مشورہ دو ہم اس تک کیسے پہنچیں۔؟"

اس کے بعد اس نے کھل کر بات کی اور اسے بتا دیا کہ اس طرح میری بیٹی نے عہد کیا ہے' وہ چنیسر سے شادی ضرور کرے گی۔ ہم نے اسے بہت سمجھایا ہے مگر یہ نہیں مانتی

اور اس کی اسی ضد سے مجبور ہو کر میں خود اس کے ساتھ آئی ہوں تاکہ کوئی راستہ نکل سکے۔
اس نے اپنے اور اپنی بیٹی کے بارے میں کچھ اس انداز سے مالن کو بتایا جس سے اس کا دل پسیج گیا اور ان کے لیے اس کے دل میں ہمدردی پیدا ہو گئی۔ ان کی مجبوری اور بے بسی نے اسے بڑا متاثر کیا تھا وہ اپنے دل میں سوچنے لگی 'اگر میں ان کی کسی طرح مدد کر سکوں تو اچھا ہے' ماں بیٹی پردیس میں ماری ماری پھر رہی ہیں۔ اس نے کچھ سوچ بچار کے بعد کہا۔

''میں تمہیں چنیسر سے نہیں ملا سکتی مگر میں ایک ترکیب بتاتی ہوں۔!''

''وہ کیا۔؟ جلدی بتاؤ۔؟''

دونوں ماں بیٹی نے بڑی بے تابی سے اس کی بات کاٹ کر پوچھا' جس پر مالن نے بتایا۔

''اگر تم چنیسر کے وزیر جھکرا سے ملو تو وہ یقیناً تمہاری مدد کر سکتا ہے کیونکہ چنیسر اس کی بات مانتا بھی ہے اور وہ اس کے بہت قریب بھی ہے۔ وہ تمہارے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔''

وہ تو دونوں وہاں اجنبی تھیں' انھوں نے اسی سے درخواست کی کہ وہ ان کی جھکرا سے ملاقات کرا دے۔ مالن یہ کام کرنے پر راضی ہو گئی اور انھیں وزیر جھکرا کے پاس لے گئی۔ کونرو کی ماں نے وہاں جا کر اپنی ساری بپتا بیان کر دی۔ اس نے اس قدر دردناک انداز میں بیٹی کے دل کی روداد بیان کی تھی کہ جھکرا کو بھی ان دونوں کی حالت پر بہت ترس آیا۔ اپنے سارے حالات بتانے کے بعد مرکھی نے جھکرا کی منت کرتے ہوئے کہا۔

''آپ ہی میری بیٹی کی مدد کر سکتے ہیں۔ ورنہ یہ اپنی جان دے دے گی۔''

کونرو نے بھی روتے ہوئے اس کے پاؤں پکڑ لیے اور درخواست کی۔

''آپ ہی میری زندگی بچا سکتے ہیں۔؟ مجھ پر مہربانی کریں اور میری مدد کریں۔!''

جواب میں جھکرا انھیں تسلی دیتے ہوئے بولا۔

''بیٹی! گھبراؤ نہیں میں اپنی طرف سے پوری پوری کوشش کروں گا کہ اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکوں۔ آگے تمہاری قسمت ہے۔''

اس طرح اس نے انھیں امید دلا کر واپس بھیج دیا اور وہ واپس آ کر اس انتظار میں بیٹھ گئیں کہ دیکھیں وہ ان کے لیے کیا کرتا ہے۔؟ ادھر جھکرا ایسے موقع کی تلاش میں تھا جب چنیسر فرصت میں ہو اور اس کے ساتھ اچھے مزاج میں بھی ہو تاکہ وہ اس سے بات کرے۔ اسے یہ بھی خیال تھا' بات بڑی نازک ہے اسے سلیقے سے کرنا ہو گا' کہیں ایسا نہ ہو کہ چنیسر ناراض ہو جائے کیونکہ وہ اپنی بیوی لیلا سے بے انتہا محبت کرتا تھا۔ وہ اسی انتظار میں تھا کہ ایک روز اس نے دیکھا تو چنیسر خوش دکھائی دے رہا تھا اور اس وقت اس کے پاس کوئی دوسرا شخص بھی موجود نہ تھا۔ جھکرا کے لیے یہ موقع نہایت موزوں تھا۔ وہ پہلے تو تھوڑی دیر تک امور سلطنت کی ضروری باتیں کرتا رہا اور پھر ادھر ادھر کی دوسری باتیں ہونے لگیں۔ باتوں باتوں میں اس نے کونرو کے حسن و جوانی کی تعریف شروع کر دی۔ کہنے لگا۔

"اس جیسی خوبصورت لڑکی شاید سارے دیول میں بھی نہ ہو۔"

چنیسر اس کی باتیں بڑی توجہ سے سن رہا تھا اور کونرو کو دیکھے بغیر اس کے حسن کا بھی قائل ہو رہا تھا۔ جھکرا نے اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ کونرو اس سے شادی کرنے کی غرض سے آئی ہے اور اپنی خواہش کے لیے دیوانی ہو رہی ہے۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کی باتیں غور سے سن رہا ہے اور اس کے چہرے پر ناراضی کے آثار بھی نہیں تو وہ اپنے مطلب پر آ کر ڈرتے ڈرتے بولا۔

"حضور! یہ لڑکی واقعی اس قابل ہے کہ آپ کے محل کی زینت بنے۔"

اگرچہ چنیسر اس کی گفتگو سے کافی متاثر ہو رہا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کی بیوی لیلا کے حسن کی تو مثال ہی نہیں تھی۔ وہ لاکھوں میں ایک تھی' اسی لیے اس نے جواب یوں کہا۔

"جھکرا! تم جانتے ہو' میری اپنی بیوی اتنی حسین ہے کہ اس جیسی عورت تلاش کرنے سے نہ ملے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے' میں دوسری عورت کو محل میں لے آؤں۔"؟

اس کے بعد اس نے کہا۔

"تم اس دیوانی لڑکی کو سمجھا بجھا کر واپس بھیج دو اور اسے بتا دو کہ یہ بات ناممکن ہے چینسر سے اس کی شادی نہیں ہو سکتی۔"

دوسرے روز جھکرا نے کونرو اور اس کی ماں کو بتا دیا کہ ان کی خواہش کا پورا ہونا ممکن نظر نہیں آتا، چینسر اپنی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کرنے پر راضی نہیں ہے۔ اتنا کہنے کے ساتھ ہی اس نے ماں بیٹی کو مشورہ دیا۔

"تم لوگوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ واپس اپنے وطن چلی جاؤ۔"

مرکھی تو اس بات پر راضی تھی کہ یہ خیال ترک کر کے انھیں واپس چلے جانا چاہیے۔ اس نے بیٹی سے کہا بھی مگر کرنرو اس کے لیے تیار نہ تھی۔ وہ جھکرا کے جواب میں مایوس اور دل شکستہ تو ضرور ہوئی تھی لیکن اس نے اپنی ضد نہیں چھوڑی تھی۔ اسے ابھی تک امید تھی کہ صورت حال ضرور بدل جائے گی۔ چینسر ایک نہ ایک دن اس کی طرف ضرور توجہ دینے پر مجبور ہو جائے گا۔ اس کی اس ضد کی وجہ سے ماں بھی مجبور تھی۔ وہ کوئی ترکیب سوچنے لگی، جس پر عمل کر کے انھیں ان کا مقصد حاصل ہو سکے۔ بڑے سوچ بچار کے بعد آخر اس کے ذہن میں ایک طریقہ آیا اس نے کونرو سے مشورہ کیا تو اس نے بھی حمایت کی اور کہا۔

"ہاں ماں! اس ترکیب سے یقیناً کوئی راستہ نکل آئے گا۔"

اس نئی ترکیب کے مطابق انھوں نے اپنا تمام تجارتی مال و اسباب ادنے پونے داموں فروخت کر دیا اور اپنے قیمتی کپڑے اتار کر معمولی سے لباس پہن لیے۔ پھر اسی مالن کی مدد سے وہ چینسر کی رانی لیلا کے پاس پہنچ گئیں اور ایک جھوٹ موٹ کی کہانی گھڑ کے اسے سنائی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ماں بیٹی زمانے کی ستائی ہوئی ہیں اور اس دنیا میں ان کا کوئی مدد گار نہیں ہے۔ وہ در در کی ٹھوکریں کھا رہی ہیں اور اپنی عزت و آبرو بچائے ہوئے ہیں۔ بے سہارا ہیں، مجبور ہیں، یہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد انھوں نے رانی لیلا کے آگے گڑگڑا کر

درخواست کرتے ہوئے کہا۔

"رانی جی! آپ نیک اور رحم دل ہیں۔ ہم آپ کی رحم دلی کے بارے میں سن کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہیں۔ اگر آپ ہمیں اپنی باندیوں میں شامل کرلیں تو ہم مجبوروں کو سہارا مل جائے گا اور ہم آپ کو دعائیں دیں گی۔"

ایک تو رانی لیلا ویسے ہی رحم دل واقع ہوئی تھی اور دوسرا انھوں نے اپنی داستان کچھ اس انداز سے سنائی تھی کہ اسے دونوں ماں بیٹی پر بہت ترس آنے لگا۔ اس نے سوچا' جہاں اتنی باندیاں اور نوکرانیاں پل رہی ہیں وہاں یہ دونوں بھی آجائیں گی تو کوئی بات نہیں۔ چنانچہ ان کو اپنی باندیوں میں شامل کرلیا اور اس طرح انھیں چنیسر کے محل تک رسائی حاصل ہو گئی جو اب تک محال نظر آرہی تھی۔ پہلے تو کچھ روز تک انھیں محل میں ادھر ادھر کے کام پر لگایا گیا جو ماں بیٹی نے بڑی محنت اور سلیقے سے کیا یہی وجہ تھی کہ رانی ان کے کام سے بہت خوش ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود اس دوران انھیں چنیسر سے ملنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ رانی ان کے کام سے اتنی خوش ہوئی تھی کہ اس نے کونرو کو اپنی خواب گاہ کی صفائی ستھرائی کرنے پر لگا دیا۔ روزانہ خواب گاہ کو سجانا اور بستر وغیرہ بچھانا اس کے فرائض میں شامل تھا۔ وہ دل ہی دل میں بڑی خوشی محسوس کررہی تھی' اب اسے امید ہوگئی تھی کہ کسی نہ کسی روز اس کی ملاقات چنیسر سے ضرور ہوجائے گی اور اسی امید میں وہ رانی کی خواب گاہ کو بڑے سلیقے اور قرینے سے سجاتی اور سنوارتی تھی۔

ایک روز کونرو خواب گاہ کا بستر بچھا رہی تھی اور اس وقت لیلا اور چنیسر بھی دونوں موجود تھے کہ اچانک اس کو اپنا وطن اور ماضی یاد آگیا۔ وہ اپنے دل میں سوچنے لگی' ایک وہ دن تھے جب میں خود راجکماری تھی' نوکر چاکر میری خدمت کے لیے حاضر رہتے تھے اور ایک یہ وقت ہے کہ میں خود باندی بنی ہوئی ہوں۔ یہ سوچتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے آنسو چھپانے کی بہت کوشش کی لیکن ضبط کے باوجود وہ ڈھلک کر اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔ لیلا اور چنیسر کی بھی اس کے آنسوؤں پر نظر پڑ گئی تھی۔ وہ

پوچھنے لگے۔

"کیا بات ہے کونرو۔۔۔۔۔۔۔۔؟۔ ۔۔۔رو کیوں رہی ہو۔۔۔۔؟"

کونرو نے جلدی سے آنسو پونچھ لیے اور بہانہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

"میرے ہاتھ میں چراغ سے تیل لگ گیا تھا' آنکھ میں کھجلی ہوئی تو میں نے اسی ہاتھ سے کھجالیا جس سے آنسو آ گئے۔۔۔۔۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

اس کا یہ جواب سن کر چینسر تو مطمئن ہو گیا تھا لیکن لیلا کو اس کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ اس کا خیال تھا' کونرو نے اصل بات چھپائی ہے۔ آنسو آنے کی وجہ تیل نہیں کچھ اور ہو سکتی ہے۔ پھر جب چینسر وہاں سے چلا گیا اور وہ دونوں رہ گئیں تو لیلا نے اسے پاس بلا کر کہا۔

"میں جانتی ہوں تمہاری آنکھوں میں آنسو آنے کی وجہ وہ نہیں ہے جو تم نے بتائی ہے۔ تم نے یقیناً اصل بات چھپائی ہے۔ مجھے سچ سچ بتاؤ تم روئی کیوں تھی۔۔۔۔؟"

پھر اس نے یہ کہتے ہوئے کونرو کو یقین دلایا۔ "میں تم پر ناراض نہیں ہوں گی ہو سکتا ہے میں تمہارے کسی کام آسکوں۔؟"

جب رانی لیلا نے بہت زیادہ اصرار کیا اور کونرو کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ اب جھوٹ سے بات نہیں بنے گی' سچ بتانا ہی پڑے گا تو اس نے ہمت کر کے لیلا کو بتایا۔

"رانی جی سچ یہ ہے' میں بھی ایک راجا کی بیٹی ہوں اور اپنے ملک کی راجکماری ہوں۔ میرے محل میں تو رات کو میرے نولکھے ہار کی آب و تاب سے اندھیرا دور ہو جاتا تھا مگر میں یہاں باندی بن کے تیل کے چراغ روشن کرتی ہوں۔"

وہ بات کرتے کرتے لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو گئی اور پھر ایک لمبی آہ بھرتے ہوئے بولی۔

"کبھی میں بھی آپ کی طرح عیش و عشرت کی زندگی بسر کیا کرتی تھی۔ میرے چاروں طرف خدمت کے لیے نوکر چاکر اور باندیاں ہوا کرتی تھیں۔ جب ان گزرے ہوئے دنوں کی یاد آ جاتی ہے تو میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آجاتے ہیں۔"

اس کی بات سن کر رانی لیلا کچھ سوچ میں پڑ گئی۔ وہ بڑے غور سے کونرو کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی یوں لگتا تھا جیسے اسے اس کی باتوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک خاموش بیٹھی اسے تکتی رہی اور پھر بولی۔

"مگر میں تمہاری ان باتوں پر کیسے یقین کرلوں۔؟"

کونرو اجازت لے کر اسی وقت گئی اور تھوڑی دیر میں اپنے پرانے کپڑوں کی ایک گٹھڑی لائی۔ اس نے ان کپڑوں میں سے نولکھا ہار نکال کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ رہا میری باتوں کا ثبوت!"

نولکھا ہار دیکھ کر رانی لیلا حیران تھی۔ تعجب سے اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ ہار کو بڑی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اب واقعی اسے یقین آگیا تھا کہ کونرو کوئی معمولی لڑکی نہیں ہے۔ اور وہ جو کچھ کہہ رہی ہے وہ حقیقت ہے۔ اس کی نظریں مسلسل نولکھے ہار پر ٹکی ہوئی تھیں جو اس کے دل میں کھب گیا تھا۔ پہلے تو وہ نولکھا ہار صرف دیکھنا چاہتی تھی لیکن اب اسے حاصل کرنے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی۔ اس نے کونرو سے کہا۔

"کونرو! تم نے جس کارن یہ روپ بھرا ہے اس کی حقیقت مجھ پر ظاہر کردے۔ میں تمہاری ہر خواہش پوری کرنے کو تیار ہوں لیکن اپنا نولکھا ہار مجھے دے دو۔؟"

کونرو بھی جان گئی تھی کہ رانی اس کے ہار پر بری طرح فدا ہو چکی ہے' اگر میں اسے یہ ہار دے دوں تو وہ میری ہر بات ماننے کو تیار ہو جائے گی۔ پھر بھی اس نے اسے پکا کرنے کی خاطر کہا۔

"آپ وعدہ کریں کہ میری بات سے ناراض نہیں ہوں گی؟"

"میں وعدہ کرتی ہوں کہ تم جو بھی کہو گی میں اسے پورا کروں گی۔!"

لیلا نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا' جس پر کونرو نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے' میں نولکھا ہار آپ کو دے دیتی ہوں مگر اس کے بدلے میں آپ کو ایک رات کے

لیے راجا چینسر مجھے دینا ہو گا۔ میں صرف ایک رات چینسر کے ساتھ بسر کرنا چاہتی ہوں۔!"

"مجھے منظور ہے۔ میں تمہاری شرط پوری کروں گی!!"

لیلا نولکھا ہار کے لیے اس قدر دیوانی ہو چکی تھی کہ اس کا ہر جائز و ناجائز مطالبہ پورا کرنے پر تیار تھی۔ جب اس نے یہ شرط منظور کر لی تو کونرو کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ اس نے نولکھا ہار رانی لیلا کو دے دیا وہ تو یہ ہار اپنے ساتھ لائی ہی اس غرض سے تھی کہ کسی مصیبت میں کام آئے گا۔ اگر چینسر کے وصال کی قیمت بھی ادا کرنی پڑے تو وہ ادا کر دے گی۔ اس کے لیے چینسر کے مقابلے میں نولکھے ہار کی کوئی قیمت نہ تھی۔ اس کے پاس تو ایسے کئی نولکھے ہار بھی ہوتے تو وہ اس مقصد کے لیے پیش کر دیتی۔ وہ خوشی خوشی اپنی ماں مرکھی کے پاس گئی اور اسے بتایا۔

"ماں! میں اپنے مقصد میں کامیاب ہونے والی ہوں۔ بہت جلدی تم دیکھو گی' میں چینسر کی بیوی بن جاؤں گی۔"

"وہ کیسے۔؟ ابھی تو چینسر سے تمہاری ملاقات بھی نہیں ہوئی۔؟"

جواب میں کونرو نے اپنی ماں کو ساری بات بتائی کہ کس طرح رانی لیلا اس کے نولکھا ہار پر مر مٹی اور کس طرح اس نے ہار کے بدلے چینسر کو ایک رات کے لیے مانگا اور اس نے میری یہ شرط منظور کر لی ہے۔ ماں بھی یہ سن کر بہت خوش ہوئی کہ جس مقصد کی غرض سے ماں بیٹی اپنا وطن چھوڑ کر آئی ہیں اور جس کی خاطر حکومت کی آسائشیں چھوڑ کر پر دیس میں ماری ماری پھر رہی ہیں' ان کا وہ مقصد پورا ہونے کی امید پیدا ہو رہی ہے اگرچہ اسے اس بات کا دھڑکا بھی تھا کہ کہیں لیلا اپنے منصوبے میں ناکام نہ ہو جائے یا پھر چینسر اس پر ناراض ہو جائے اور وہ ماں بیٹی کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں' اس کے باوجود وہ خوش تھی کہ ان کی کوششیں یہاں تک پہنچ گئی ہیں۔ اس نے بیٹی کی ذہانت پر اس کی تعریف کی اور ساتھ ہی نصیحت کرتے ہوئے کہا۔

"مگر بیٹی! تمہیں بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے کام کرنا ہو گا۔ کہیں ایسے نہ ہو یہ سلسلہ درمیان ہی میں ٹوٹ جائے۔ اگر ایسا ہوا تو ہم دونوں کی جان کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔"

"تم بے فکر رہو ماں میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر دکھاؤں گی۔"

اب ہوا یہ کہ ایک شام چنیسر اپنے قریبی مصاحبین کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ پینے پلانے کا دور شروع ہو گیا۔ وہ ناؤ نوش میں یہ بھی بھول گئے کہ انھیں محفل سجائے کتنی دیر ہو گئی ہے۔ کسی ایک نے بھی زیادہ رات گزرنے کا احساس نہ کیا اور اپنے شغل میں مصروف رہے۔ اچانک، چنیسر چونک کر کہنے لگا۔

"بہت رات ہو چکی ہے۔ اب سونا چاہیے۔"

اس وقت تک وہ نشے میں دھت ہو چکا تھا اور جب حرم سرا میں پہنچا تو اس سے صحیح طور پر چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے اور بار بار گرتے گرتے بچ رہا تھا۔ جونہی لیلا نے اسے اس حالت میں دیکھا تو دل میں خوش ہو گئی کیونکہ اسے اس سے بہتر موقع نہیں مل سکتا تھا۔ اس نے اسی وقت کرنرو کو اپنی خواب گاہ میں بھیج دیا اور اس کے بعد چنیسر کو بھی سہارا دے کر اندر داخل کر دیا اس وقت وہ اس قدر نشے میں تھا کہ اس سے بات بھی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ یہ جانے بغیر کہ اس کے بستر پر کون لیٹا ہے، خود بھی لیٹ گیا۔ اس طرح اس نے پوری رات بے خبری اور بے ہوشی میں گزار دی اور جیسے ہی صبح بیدار ہوا اپنے پہلو میں لیلا کی بجائے کونرو کو دیکھ کے پریشان ہو گیا۔ اس نے گھبرا کے ادھر ادھر دیکھا، وہاں لیلا کا کچھ پتا نہ تھا۔

"یہ کیا۔؟ لیلا کہاں ہے۔؟"

اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ گھبرا کے بستر سے اٹھا مگر کونرو نے اسے پھر بٹھا دیا۔ چنیسر نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور غصے میں بولا۔

"تمھیں یہ جرأت کیسے ہوئی کہ میرے بستر پر میرے ساتھ سوئے۔؟"

پیشتر اس کے کہ وہ کچھ اور کہتا، کونرو کی ماں پردے کے پیچھے سے نکل کر سامنے آ گئی

جسے دیکھ کر چنیسر اور بھی پریشان ہو گیا۔ وہ وہاں سے جانے ہی لگا تھا کہ مرکھی نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"شاید آپ کو معلوم نہیں کہ اس لڑکی نے آپ کے لیے اپنا وطن چھوڑ دیا ہے اور صرف آپ کی خاطر پردیس میں دھکے کھا رہی ہے۔"

"میں اپنی پیاری لیلا کے ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تم دونوں یہاں سے چلی جاؤ۔"

"حضور! آپ جس پیاری لیلا کی بات کر رہے ہیں' اس نے تو آپ کو نولکھا ہار کی عوض فروخت کر دیا ہے۔ اس نے آپ پر ایک ہار کو ترجیح دی ہے۔؟"

اس کے بعد اس نے چنیسر کو پوری روداد سنائی کہ کس طرح لیلا نے نولکھا ہار لے کر آپ کو ایک رات کے لیے کونرو کو دے دیا اسی نے رات کونرو کو آپ کی خواب گاہ میں سلایا تھا۔ یہ سنتے ہی چنیسر غصے میں کانپنے لگا اور فرش پر پاؤں ٹپکتے ہوئے بولا۔

"اچھا' یہ بات ہے۔ وہ اس قدر حرص و ہوس کا شکار ہو گئی ہے؟ اگر ایسا ہے تو آج سے وہ میری بیوی نہیں رہی اب کونرو ہی میری بیوی ہو گی۔"

پھر اس نے کونرو کی طرف چہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں تمھیں جان سے زیادہ عزیز رکھوں گا اور اب کبھی لیلا کی طرف توجہ نہ دوں گا۔"

لیلا تو کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ ایک ہی رات میں یوں کایا پلٹ جائے گی اور اس پر جان چھڑکنے والا چنیسر اس سے اس طرح بدگمان ہو جائے گا۔ اسے اب بھی امید تھی کہ چند روز میں اس کا غصہ ختم ہو جائے گا اور وہ پھر سے ہمیشہ کے لیے اس کے دل پر راج کرنے لگے گی لیکن اس نے تو واقعی کونرو کو اپنے دل میں بٹھالیا تھا اور لیلا اس کی نظروں سے ہمیشہ کے لیے گر گئی تھی۔ یہ صورت حال کونرو اور اس کی ماں کے لیے تو جیت تھی۔ خوشی سے ان دونوں کے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ وہ جس مقصد کے لیے اپنا وطن چھوڑ کے آئی تھیں اور جس کے لیے انھوں نے اتنی مشکلات اور تکلیفیں برداشت کی تھیں' وہ مقصد

حاصل ہو گیا تھا۔ اس کے برعکس لیلا تو جیسے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح چنیسر کی بدگمانی دور ہو جائے، وہ اس سے راضی ہو جائے مگر سب بے سود۔ اس نے ہر جتن کر دیکھا، ہر حیلے بہانے سے کام لیا لیکن چنیسر کو نہ منایا جا سکا۔ آخر جب وہ چاروں طرف سے مایوس و نامراد ہو گئی تو اس نے سوچا۔

"اب میرا یہاں رہنا بیکار ہے بہتر ہے میں اپنے میکے چلی جاؤں۔"

اس نے اپنا ضروری سامان ساتھ لیا اور اپنے ماں باپ کے پاس چلی گئی جہاں جدائی کی آگ میں جلتے ہوئے زندگی بسر کرنے لگی۔ اس طرح اسے اپنے ماں باپ کے پاس رہتے ہوئے طویل عرصہ بیت گیا مگر چنیسر کی طرف سے کوئی پیغام نہ ملا۔ اس دوران اس کے ماں باپ نے بہتیری کوششیں کیں کہ کسی طرح چنیسر کے دل کا میل دور ہو جائے لیکن ان کی ہر کوشش بیکار گئی۔ لیلا میکے میں بیٹھی اپنی بدقسمتی کے دن گنتی رہی۔ یہ سب کچھ اس کا اپنا ہی کیا کرایا تھا اور یہی سوچ سوچ کر وہ پچھتاوے کی آگ میں جل رہی تھی۔

اتفاق یہ ہوا کہ چنیسر کے وزیر جھکرا کی نسبت لیلا ہی کے خاندان کی ایک لڑکی سے ہو چکی تھی اور اب شادی ہونے والی تھی۔ جھکرا اور اس کی منگیتر ایک دوسرے کو چاہتے بھی تھے لیکن چنیسر نے لیلا کے ساتھ جو کچھ کیا تھا اس کا اثر اس رشتے پر بھی پڑ رہا تھا۔ اگرچہ شادی طے تھی مگر اب لڑکی کے ماں باپ اور عزیزوں نے شادی سے انکار کرتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ۔

"ہمارے خاندان کی لڑکی کے ساتھ دیول میں پہلے جو کچھ کیا گیا ہے اسے دیکھتے ہوئے ہم اپنی بیٹی کی شادی نہیں کریں گے۔"

جھکرا نے انھیں بہتیرا سمجھایا کہ چنیسر اور لیلا کے واقعہ سے میرا کیا تعلق۔؟ میری شادی کا معاملہ بالکل الگ ہے لیکن اس کی بات نہیں مانی گئی۔ وہ اپنی ضد پر اڑے رہے۔ اتنے میں جھکرا کو خیال آیا، لیلا بھی اسی خاندان کی ہے وہ مجھ سے ناراض بھی نہیں ہے پھر یہ کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، وہ چنیسر نے کیا ہے، اگر میں اس کے پاس جا کر مدد

طلب کروں تو ہو سکتا ہے وہ میری مدد کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔؟ یہی کچھ سوچ کر وہ لیلا کے پاس گیا اور کہنے لگا۔

”رانی جی! مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔؟“

جواب میں لیلا بولی۔

”میں تو خود بے بس و مجبور بیٹھی ہوں‘ پھر میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں۔؟“

جھکرا نے اسے ساری بات بتائی اور یہ بھی کہا کہ اگر وہ اس کی مدد کرے تو یقیناً لڑکی کے گھر والے مان جائیں گے اور اس کی شادی اس کی منگیتر سے ہو جائے گی۔ اس نے لیلا کی منت سماجت کی کیونکہ وہ جانتا تھا‘ اب لیلا ہی اس کی مدد کر سکتی ہے۔ لیلا نے اس کی پوری بات سنی اور کچھ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر اس نے کہا۔

”میں تمہاری شادی کرا دوں گی مگر ایک شرط پر!“

”وہ شرط کیا ہے مجھے بتائیں۔ میں اسے ہر صورت میں پوری کرنے کی کوشش کروں گا۔؟“۔

اس پر لیلا نے کہا۔

”شرط یہ ہے کہ تمہاری بارات میں چنیسر ضرور آئے اگر تم یہ کر سکتے ہو تو تمہاری شادی ضرور ہو گی۔“

یہ شرط پوری کرنا جھکرا کے لیے کچھ زیادہ مشکل نہ تھی کیونکہ وہ چنیسر کا خاص وزیر تھا اور اس کی ہر بات مانی جاتی تھی۔ اس نے لیلا سے وعدہ کیا کہ بارات میں چنیسر کو بھی ضرور ساتھ لائے گا۔ اس کی یقین دہانی پر لیلا نے درمیان میں پڑ کے اس کے سسرال والوں کو راضی کر لیا‘ انھوں نے شادی کی تاریخ مقرر کر دی اور جھکرا خوش خوش واپس چلا گیا۔ دیول جاتے ہی اس نے اپنی شادی کی تیاریاں شروع کر دیں اور ایک روز موقع پا کر چنیسر سے بھی درخواست کی کہ وہ اس کی شادی میں شریک ہو۔ اس نے کہا۔

”حضور! میری شادی ہو رہی ہے اور میں چاہتا ہوں آپ میری بارات میں شریک ہو کر میری

عزت میں اضافہ کریں۔ آپ کی شرکت سے میری خوشیاں دوبالا ہو جائیں گی۔؟
چینسر اپنے خاص اور بااعتماد وزیر کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اس کی بارات میں شریک ہونا منظور کرتے ہوئے کہا۔

"تمہاری خوشی ہماری اپنی خوشی ہے ہم تمہاری بارات میں ضرور شریک ہوں گے۔"

چینسر کی منظوری کے بعد جھکرا نے شادی کی تیاریاں اور بھی زور و شور سے جاری رکھیں اور پھر جب مقررہ تاریخ کا دن آیا تو وہ بڑی شان و شوکت سے بارات لے کر لڑکی والوں کے شہر کی جانب چل دیا۔ چونکہ بارات میں چینسر بھی شریک تھا اس لیے اس کی شان شاہانہ ہو گئی تھی۔ بارات کا استقبال بھی بڑی دھوم دھڑکے سے کیا گیا اور باراتیوں کی آؤ بھگت بھی بڑھ چڑھ کر کی جانے لگی۔ ادھر لیلا نے اپنا بھیس بدلا اور گھونگھٹ نکال کے وہاں پہنچ گئی جہاں چینسر ٹھہرا ہوا تھا۔ اس نے جا کر چینسر سے باتیں شروع کر دیں۔

وہ بھی اس کی گفتگو میں دلچسپی لینے لگا۔ لیلا نے گفتگو میں کچھ ایسے ناز نخرے سے کام لیا کہ چینسر اس پر فریفتہ ہو گیا۔ اگرچہ وہ ایک عرصہ سے لیلا سے بچھڑا ہوا تھا اور کونرو کے ساتھ رہ رہا تھا لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ تھی کہ اس کے دل کی گہرائیوں میں لیلا کی محبت ابھی تک موجود تھی۔ وہ محض غیرت کی وجہ سے بدظن ہوا تھا کہ اس کی پیاری بیوی نے محض ایک ہار کے بدلے میں اس کی محبت فروخت کر دی تھی۔ تاہم اس وقت وہ یہ جانے بغیر کہ یہ عورت کون ہے' اس کی اداؤں پر مرمٹا تھا۔ لیلا نے جب یہ اندازہ کر لیا کہ چینسر اس پر سو جان سے فدا ہو چکا ہے تو اس نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ رانی لیلا کی بے وفائی کی باتیں کرنے لگی۔ چینسر کچھ دیر تک اس کی باتیں سنتا رہا' سوچتا رہا اور پھر بولا۔

"اے حسینہ! یہ لیلا کا ذکر کب تک کرو گی۔ کچھ اپنا تعارف بھی کراؤ۔۔ تم کون ہو۔۔؟ تم تو میرے دل میں بس گئی ہو۔۔۔ مجھے کچھ اپنے بارے میں بتاؤ۔۔۔؟"

اس پر لیلا نے بڑے انداز میں جواب دیا۔

”تم نے لیلا جیسی شریف اور باوقار عورت سے بے وفائی کی ہے۔ دوسری عورت کی خاطر اسے چھوڑ دیا۔ تم جیسے بے وفا مرد سے کون محبت کر سکتا ہے۔؟“

اس وقت چنیسر بے حد بے تاب ہو چکا تھا‘ وہ بے قرار ہو کر آگے بڑھا تاکہ اس کا گھونگھٹ اٹھا کر دیکھے مگر پیشتر اس کے کہ اس کا ہاتھ وہاں تک جاتا لیلا نے خود ہی اپنا گھونگھٹ اٹھا دیا۔ جونہی اس نے گھونگھٹ اٹھایا چنیسر دھک سے رہ گیا۔ اسے اپنی بھولی ہوئی محبت یاد آگئی اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ اس نے ایک لمبی آہ بھری اور وہیں گر کے جان دے دی۔ ہجرو فراق کی ماری ہوئی لیلا نے بھی ایک چیخ ماری اور اس کی لاش پر گر پڑی۔ اس طرح دونوں ایک دوسرے پر قربان ہو کر ہمیشہ کے لیے ایک ہو گئے۔

عمر ماروی

یہ داستان چھ صدیوں سے بھی زائد پرانی ہے اور اس کا تعلق چودھویں صدی عیسوی کی آخری دہائی سے ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سندھ میں سومرہ خاندان کی حکومت تھی۔ اسی خاندان کا ایک شخص عمر جنوبی سندھ کا حکمران تھا جس کا دارالحکومت عمر کوٹ تھا جو آج بھی ضلع تھرپارکر میں واقع ہے۔ عمر ایک نیک نام حکمران تھا' اس میں وہ تمام خوبیاں اور اوصاف موجود تھے جو ایک اچھے حکمران میں ہونے چاہئیں۔ وہ ذہین اور معاملہ فہم بھی تھا' بہادر اور نڈر بھی تھا' اور اس کے ساتھ ساتھ وجیہہ اور جوان بھی تھا۔ وہ جس مہم پر جاتا کامرانی و کامیابی اس کے قدم چومتی تھی۔ اس کا انصاف بھی مشہور تھا' اس کے دربار میں جو بھی فریادی آتا وہ اس کی فریاد سنتا اور اس کی شکایت دور کرتا۔ اس کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ کوئی اس کے دروازے سے خالی ہاتھ نہ لوٹتا تھا۔

جس زمانے کی یہ بات ہے' اس دور میں تھر کے علاقے میں ملیر کو شہرت حاصل تھی۔ اگرچہ تھر میں ہر طرف ریگستان پھیلا ہوا تھا اور چاروں جانب ریت ہی ریت دکھائی دیتی تھی لیکن ملیر کا حصہ بہت سرسبز و شاداب ہوتا تھا۔ یہاں کے لوگ دوسرے علاقوں کی نسبت زیادہ

خوش اور خوشحال رہتے تھے۔ ملیر ہی کے علاقے میں ایک گاؤں تھا جس کا نام تہلہا تھا‘ اس میں مارو قوم کے لوگ آباد تھے۔ یہ لوگ گجرات اور کاٹھیاواڑ سے ترک وطن کر کے آئے تھے اور انھوں نے یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہ یہاں نسل در نسل سے رہتے چلے آ رہے تھے اور زیادہ تر کھیتی باڑی کرتے تھے۔ یہی ان کا ذریعہ معاش تھا اور اسی پر ان کی گزر بسر ہوتی تھی۔ تہلہا گاؤں میں ایک شخص پالنا بھی رہتا تھا جو تھوڑی سی زمین کا مالک تھا جس میں کاشت کاری کر کے اپنے بیوی بچوں کے لیے کچھ پیدا کر لیتا تھا۔ پالنا کی بیوی کا نام ماڈوئی تھا اور ان کی ایک بیٹی تھی جس کا نام ماروی تھا۔ ماروی اگرچہ غریب گھر میں پیدا ہوئی تھی لیکن اس کی خوبصورتی کا یہ عالم تھا کہ اس سارے علاقے میں کوئی دوسری اتنی حسین لڑکی نہ تھی۔ پالنا اور اس کی بیوی محنت مشقت کر کے اپنا پیٹ پالتے تھے اور اپنے کھیت میں کاشت کاری میں لگے رہتے تھے۔ ایک دن انھیں ایک لڑکا ملا جس کا نام پھوگ تھا۔ پالنا نے اس سے پوچھا۔

”تمھارے ماں باپ کون ہیں اور تم کہاں سے آئے ہو۔؟“

جواب میں لڑکے نے آنسو بہاتے ہوئے بتایا۔

”میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ میں یتیم اور بے سہارا ہوں۔“

پالنا اور اس کی بیوی کو لڑکے پر بہت ترس آیا۔ انھوں نے یہ بھی سوچا کہ اگر اس کو رکھ لیا جائے تو اسے رہنے کا ٹھکانا مل جائے گا اور ہمیں ایک سہارا ملے گا۔ یہ ہمارے ساتھ کام کاج میں ہاتھ بٹائے گا اور اس طرح ہمارا بوجھ کچھ ہلکا ہو گا۔ یہی کچھ سوچ کر انھوں نے اسے اپنے گھر میں رکھ لیا اور وہ وہاں گھر کے ایک فرد کی طرح زندگی گزارنے لگا۔

ماروی جوں جوں بڑی ہوتی جا رہی تھی اس کے حسن کا چرچا بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کا گاؤں تو خیر ایک چھوٹی سی جگہ تھی‘ پورے ملیر میں بھی اس جیسی خوبصورت لڑکی کہیں دکھائی نہ دیتی تھی یہی وجہ تھی مارو قوم کے تمام نوجوان اسے اپنے دل میں بسائے ہوئے تھے اور ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ ماروی اس کی ہو جائے۔ پھوگ چونکہ ماروی ہی کے گھر میں رہتا تھا‘ اس

طرح اسے ماروی کا قرب بھی حاصل تھا دوسرا یہ کہ وہ بھی اب جوان ہو چکا تھا اس لیے اس کی تمنا بھی یہی تھی، وہ بھی یہی چاہتا تھا کہ اس کا بیاہ ماروی سے ہو جائے مگر وہ یہ بات اپنے منہ پر نہیں لا سکتا تھا۔ اسے یہ احساس تھا کہ پالنا نے اسے مصیبت کے وقت سہارا دیا تھا، ہو سکتا ہے وہ اس بات سے برا مان جائے۔ دوسری طرف اسے یہ بھی غلط فہمی تھی کہ ماروی اسے پسند کرتی ہے۔ چونکہ وہ ایک ہی گھر میں رہتے تھے، اس لیے ماروی اکثر اس سے ہنس کر باتیں بھی کرتی تھی اور اسی سے اسے یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ شاید وہ بھی اس کی طرف مائل ہے۔
وہ اکثر سوچتا۔

"یقیناً ماروی بھی یہی چاہتی ہے۔"

وہ دل ہی دل میں ماروی سے محبت کرنے لگا تھا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کی محبت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا حالانکہ ماروی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی۔ وہ تو چونکہ برسوں سے ایک ساتھ ایک ہی گھر میں رہ رہے تھے اس لیے ماروی اسے گھر کا فرد سمجھ کر اپنوں جیسا برتاؤ کرتی تھی مگر وہ اس غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا کہ ماروی بھی اس کو چاہتی تھی۔ وہ اس بات سے بھی بے خبر تھا کہ ماروی کی بچپن ہی سے منگنی ہو چکی تھی۔ پالنا نے اپنے بھتیجے کھیت سے اس کی سگائی کر رکھی تھی، اس طرح رواج کے مطابق وہ اس کی بیوی بن چکی تھی۔ پھوگ ایک عرصہ تک تو سوچتا رہا اور دل ہی دل میں منصوبے بناتا رہا، آخر ایک روز اس نے موقع پا کر پالنا سے اپنے رشتے کی بات کرتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، میں ماروی کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھوں گا۔!"

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔؟"

پالنا نے قدرے چونک کر کہا اور پھر اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

"یہ ٹھیک ہے، تم ہمارے گھر ہی کے فرد ہو اور تم بھی مجھے عزیز ہو مگر شاید تمھیں معلوم نہیں کہ ماروی کا رشتہ بچپن ہی میں طے ہو چکا ہے۔ اس کی منگنی میرے بھتیجے کھیت سے ہو چکی ہے اور شادی بھی اسی سے ہو گی۔"

پھوگ پالنا کی یہ بات سن کر بڑا مایوس ہوا۔ اس نے جو خیالی محل تعمیر کر رکھے تھے وہ یکدم گر کے ریزہ ریزہ ہو گئے۔ وہ اس قدر مایوس ہوا کہ اس کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا۔ پھر اس کی یہ مایوسی انتقام میں بدل گئی۔ حسد کی آگ میں جلتے ہوئے وہ اپنے آپ سے کہنے لگا۔

"اگر ماروی کی شادی میرے ساتھ نہیں ہو سکتی تو پھر کھیت کے ساتھ بھی نہیں ہو گی۔!"

وہ کچھ دن تک دل ہی دل میں منصوبے بناتا اور سوچتا رہا۔ کبھی کوئی ترکیب اس کے ذہن میں آتی، پھر اسے چھوڑ کر کوئی اور طریقہ سوچنے لگتا۔ اس طرح سوچتے سوچتے وہ ایک روز یکایک خوش ہو کر اپنے آپ سے بولا۔

"یہ ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک ہے!"

اس کے دل میں کوئی ایسا خیال آیا تھا جس پر وہ خود ہی متفق ہو گیا تھا۔ فوراً اٹھا اور چپکے سے اپنے گاؤں سے باہر آگیا۔ پھر اس نے عمرکوٹ کا رخ کیا اور اس طرف چل دیا۔

عمرکوٹ میں حکمران عمر اپنے وزرا اور امراء میں گھرا بیٹھا تھا۔ اس وقت وہ انھیں بتا رہا تھا کہ امور سلطنت چلانے کے لیے کن کن باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے اور حکمران کو اپنی رعایا کی کیسے دیکھ بھال کرنی چاہیے۔ وہ اپنے مصاحبین میں بیٹھا کہہ رہا تھا کہ جس طرح چونے اور گارے کے بغیر کوئی دیوار دیر تک کھڑی نہیں ہو سکتی، اسی طرح عدل و انصاف کے بغیر کوئی سلطنت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ اس لیے ایک حکمران کو کبھی بھی انصاف کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ انصاف ہی کی وجہ سے لوگ اس کو عزت دیں گے اور اس سے محبت کریں گے۔ وہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ ایک اچھے حکمران کو ہمیشہ ظلم و زیادتی اور جور و ستم سے احتراز کرنا چاہیے۔ یہی نہیں بلکہ اسے ہر قسم کی زیادتی کے خلاف جہاد کرنا چاہیے تاکہ لوگ امن اور چین کی زندگی بسر کر سکیں۔ اس نے اپنے وزیروں اور امیروں کو تلقین کرتے ہوئے کہا، جن لوگوں کے پاس اختیار اور اقتدار ہوتا ہے، انھیں دوسروں کے لیے مثال بننا چاہیے تاکہ مجبوروں اور بے کسوں کو حوصلہ ملے۔ انھیں اپنے دروازے غریبوں اور ضرورت مندوں کے لیے ہر وقت کھلے رکھنے چاہئیں۔

وہ اس طرح مصاحبوں سے باتیں کرنے اور ہدایات دینے میں مصروف تھا کہ اتنے میں ایک خادم نے آکر عرض کیا۔

"حضور! ایک اجنبی نوجوان ملیر کے علاقے سے آیا ہے جو شرف باریابی چاہتا ہے۔؟"

عمر نے سوچا' یقیناً کوئی مصیبت زدہ فریادی ہو گا اس لیے حکم دیتے ہوئے بولا۔

"نوجوان کو ہمارے حضور پیش کیا جائے۔ اس کی داد رسی کر کے یقیناً ہمیں مسرت ہو گی۔"

حکم ملتے ہی خادم باہر گیا اور چند ہی لمحوں بعد پھوگ کو اپنے ساتھ لے آیا۔ پھوگ بڑے ادب سے جھک کر آداب بجالایا جس پر عمر نے اس کا سر سے پاؤں تک کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"اے نوجوان! کہو' تمہیں کیا کہنا ہے۔؟ ہم تمہاری فریاد سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہیں۔؟"

جواب میں پھوگ نے جھک کر کہا۔

"حضور والا! میں تخلیے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔!"

یہ سن کر عمر نے تمام وزیروں امیروں کو رخصت کر دیا اور پھر بولا۔

"نوجوان! اب کہو۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔؟"

اس پر پھوگ نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔

"عالی جاہ! میں کچھ طلب کرنے یا فریادی بن کر حاضر نہیں ہوا میں تو حضور کے لیے ایک خوشخبری لے کے آیا ہوں جسے سن کر یقیناً آپ خوش ہوں گے۔!"

"ہم تمہارا مطلب نہیں سمجھ سکے؟"

عمر نے تعجب کے ساتھ اس سے وضاحت کرتے ہوئے پوچھا' جس پر پھوگ نے کہا۔

"جناب عالی! ملیر کے سرسبز علاقے میں ایک گاؤں ہے جس کا نام تیلھا ہے جہاں مارو قوم کے لوگ آباد ہیں۔ انھی لوگوں میں ایک شخص پالنا بھی ہے۔ پالنا کی ایک بیٹی ماروی ہے جس کو قدرت نے ایسا حسن و جمال عطا کیا ہے کہ چاند بھی اسے دیکھ کر شرماتا ہے۔ خوبصورتی میں اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ اللہ نے اس کے خدوخال اور قدو قامت میں وہ تناسب دیا ہے کہ

دیکھنے والا اس سے نظریں نہیں ہٹا سکتا۔ جب وہ مسکراتی ہے تو واقعی اس کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں اور جب وہ چلتی ہے تو مور دیکھ کر اپنی چال بھول جائیں اس کا جسم ایسے ہے جیسے سنگ مرمر سے تراشا گیا ہو۔ انسان تو انسان فرشتے بھی اگر اسے دیکھ لیں تو عش عش کر اٹھیں۔

وہ ماروی کے حسن و جوانی کا نقشہ کھینچ رہا تھا اور عمر بیٹھا بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ جوں جوں پھوگ اپنی بات کو طول دے رہا تھا' توں توں عمر کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ہر لمحہ اس کا اشتیاق بڑھ رہا تھا اور وہ اس تمہید کا مقصد جاننے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ ادھر پھوگ نے یہ دیکھا کہ عمر ضرورت سے زیادہ متوجہ ہے تو وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ عمر درمیان میں بول پڑا۔

"مگر تم نے ابھی تک ہمیں یہ تو بتایا ہی نہیں کہ وہ ہے کون۔؟"

جواب میں پھوگ نے بتایا۔

"حضور! وہ ایک غریب کسان کی بیٹی ہے اور اس کا نام ماروی ہے۔ پورے ملیر کے علاقے کے نوجوان اس کے خواب دیکھتے ہیں۔ اگر اس پر آپ کی نظر عنایت ہو جائے تو اس کی زندگی سنور جائے گی ورنہ یہ چاند ہمیشہ گہنا رہے گا اگر وہ آپ کے حرم میں شامل ہو جائے تو شاہی حرم کی رونق اور بڑھ جائے گی!۔"

عمر جو تھوڑی دیر پہلے اپنے وزیروں اور مصاحبوں کو عدل و انصاف کی تلقین کر رہا تھا اور رعایا کے سکھ چین کے بارے میں اصول بتا رہا تھا' ماروی کے حسن و جمال کی داستان سن کر سب کچھ بھول گیا تھا۔ اس وقت اسے ماروی کے سوا کچھ یاد نہ رہا تھا۔ پھوگ نے ماروی کے حسن و جوانی کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا تھا کہ عمر اسے دیکھنے کے لیے بے تاب ہو گیا تھا۔

ادھر پھوگ نے جب اپنا نشانہ ٹھیک لگتے دیکھا تو آہستہ سے کہنے لگا۔

"حضور! ماروی تو صرف آپ کے محل کی زینت کے لیے پیدا ہوئی ہے۔؟"

عمر واقعی اس وقت ماروی کو دیکھنے کے اشتیاق میں بے قرار ہو رہا تھا۔ وہ دل میں سوچ

رہا تھا' آج سے پہلے مجھے کسی نے اس حسن بے مثال کے بارے میں نہیں بتایا۔ مجھے علم ہی نہیں' میری رعایا میں ایک ایسا ہیرا بھی موجود ہے جس کی روشنی میں میرا محل جگمگا سکتا ہے۔ پہلے تو وہ اسے دیکھنے کا مشتاق ہو رہا تھا لیکن اب وہ اسے حاصل کرنے کے بارے میں منصوبے بنا رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک خاموش خیالوں میں کھویا رہا اور پھر پھوگ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہمیں بتاؤ' ماروی تک کیسے پہنچا جائے۔؟"

"حضور! آپ میرے ساتھ چلیں۔ میں آپ کو وہاں لے چلتا ہوں!"

پھوگ کے اتنا کہنے پر عمر اس کے ساتھ چلنے پر راضی ہو گیا۔ اس نے اسی وقت دو انتہائی تیز رفتار اور طاقتور سانڈنیاں تیار کروائیں اور پھوگ کو اپنے ساتھ لے کر ملیر کے علاقے میں واقع بھلوا گاؤں کی جانب چل دیا۔ عمرکوٹ سے ماروی کا گاؤں اسی میل کے فاصلے پر تھا۔ دونوں مار اماری کرتے ہوئے جب وہاں پہنچے تو اس وقت صبح ہو چکی تھی۔ جب وہ اپنی منزل کے قریب گئے تو عمر گاؤں سے کچھ دوری پر ایک پہاڑی پر رک گیا۔ اس نے سوچا' میرا گاؤں میں جانا مناسب نہیں ہو گا' مبادا لوگ مجھے پہچان جائیں اور میری بدنامی ہو کہ حکمران ایک غریب لڑکی کی خاطر اتنا لمبا سفر کر کے آیا ہے۔ یہی کچھ سوچتے ہوئے اس نے پہاڑی پر اپنی سانڈنی کھڑی کر لی تھی۔ وہاں کھڑے کھڑے اردگرد کے علاقے کا جائزہ لیا۔ اسے گاؤں صاف دکھائی دے رہا تھا اور اس سے باہر کچھ فاصلے پر کنواں تھا۔ اس نے پھوگ سے دریافت کیا۔

"ہمارا خیال ہے' ماروی کو اٹھا لے جانا چاہیے؟' تمہارا کیا خیال ہے؟"

جواب میں پھوگ جلدی سے بولا۔

"حضور کا خیال بالکل درست ہے۔ ماروی کو اٹھا لے جانا ہی بہتر رہے گا۔"

"مگر اسے اٹھایا کیسے جائے' ہم گاؤں میں جانا نہیں چاہتے!"

اس پر پھوگ نے بتایا۔

"ماروی روزانہ گاؤں کے باہر کنوئیں پر سہیلیوں کے ساتھ پانی بھرنے آتی ہے' میری رائے میں اس کام کے لیے یہی موقع مناسب ہو سکتا ہے۔"

عمر کو پھوگ کی تجویز پسند آئی اور وہ پہاڑیوں سے نیچے آکر گاؤں سے باہر بنے ہوئے کنوئیں سے کچھ فاصلے پر اس وقت کا انتظار کرنے لگے جب ماروی سہیلیوں کے ساتھ پانی بھرنے آئے۔ماروی روزانہ جب کنوئیں پر پانی لینے آتی تھی اس کے ساتھ گاؤں کی کئی لڑکیاں اور بھی ہوتی تھیں کیونکہ پینے کے پانی کی ضرورت ہر گھر میں ہوتی تھی اور یہ کام لڑکیوں کے سپرد تھا۔ مرد اپنے کام کاج پر چلے جاتے تھے اور بڑی بوڑھیاں گھروں کے کام میں لگ جاتی تھیں۔ ماروی بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ پانی لینے جاتی تھی اوز اس وقت عمر اور پھوگ اسی کا انتظار کر رہے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ انھوں نے دیکھا تو کنوئیں پر دو لڑکیاں آگئی تھیں جن میں ایک ماروی تھی۔ دراصل ہوا یہ تھا کہ اتفاق سے اس روز ماروی کی آنکھ صبح جلدی کھل گئی تھی' اس نے سوچا سہیلیوں کا انتظار کرنے کی بجائے اکیلی چلتی ہوں۔ اس وقت تک گاؤں کی دوسری لڑکیاں ابھی نہیں آئی تھیں البتہ جب وہ کنوئیں پر پہنچی تو وہاں اس کی ایک سہیلی پہلے ہی سے موجود تھی۔ اس طرح اب کنوئیں پر دو لڑکیاں تھیں۔ پھوگ نے دور ہی سے عمر کو بتا دیا کہ کونسی ماروی ہے کیونکہ وہ خود قریب نہیں جانا چاہتا تھا۔ اگر وہ قریب جاتا تو ماروی یقیناً اسے پہچان لیتی اور عمر کا سارا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ جاتا۔ اسی لیے اس نے دور ہی سے عمر کو بتایا اور کہا۔

"آپ قریب جائیں یہ اچھا موقع ہے۔ آج ماروی کے ساتھ صرف ایک ہی سہیلی ہے۔!"

عمر ذرا سوچ میں پڑ گیا تو اس نے پھر کہا۔

"میرا وہاں جانا ٹھیک نہیں۔ اگر میں آپ کے ساتھ گیا تو مجھے وہ پہچان لیں گی۔ آپ اکیلے جائیں اور دیر نہ کریں ورنہ دوسری سہیلیاں بھی آگئیں تو آپ کے لیے مشکل ہو جائے گا۔"

"تمھاری بات ٹھیک ہے مجھے اکیلے ہی جانا چاہیے۔"

عمر نے اتنا کہا اور کنوئیں کی جانب چل دیا۔ ادھر جب دونوں سہیلیوں نے دو سانڈنی سوار

دیکھے تو ماروی قدرے خوفزدہ ہو کر سہیلی سے کہنے لگی۔
"معلوم نہیں کون لوگ آ رہے ہیں۔ بہتر ہے ہم گاؤں واپس چلیں اور دوسری سہیلیوں کے ساتھ آ جائیں گی۔؟"
لیکن اس کی سہیلی نے ہنستے ہوئے کہا۔
"تو بڑی ڈرپوک ہے' دو آدمی دیکھ کر ڈر گئی ہو۔ بیچارے مسافر ہوں گے گزر جائیں گے۔ زیادہ سے زیادہ ہوا تو پانی پلانے کو کہیں گے۔ اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔؟"
اس نے ماروی کا حوصلہ بڑھایا اور وہ مطمئن ہو گئی۔ ابھی انھوں نے گھڑوں میں پانی بھرا ہی تھا کہ اتنے میں عمر سانڈنی پر سوار وہاں پہنچ گیا۔ جب اس کی نظر ماروی پر پڑی تو وہ چند لمحوں کے لیے جیسے پتھر بن گیا۔ وہ تو اس سے بھی کہیں زیادہ حسین تھی جو نقشہ پھوگ نے کھینچا تھا۔ اس کے قیاس و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ماروی اس قدر حسین و جمیل ہو سکتی ہے۔ وہ اسے دیکھتے ہی سو جان سے اس پر فدا ہو گیا اور سانڈنی سے اتر کر کھڑے ہو کے اسے ٹکٹکی لگائے دیکھنے لگا۔ اس کا انگ انگ اس کے دل میں کھبتا جا رہا تھا۔ ماروی نے اسے اس طرح بت بنا ہوا دیکھا تو پوچھا۔
"اے مسافر! تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو۔؟ تم کون ہو؟"
اس کی بات پر عمر جیسے چونک پڑا اور اس کے قریب جا کر درخواست کے لہجے میں بولا۔
"میں تھکا ہوا مسافر ہوں اور بہت دور سے آیا ہوں۔۔۔ پیاسا ہوں۔ اگر چند گھونٹ پانی پلا دو تو تمھاری مہربانی ہو گی؟"
جواب میں ماروی نے کچھ کہے بغیر گھڑا اٹھا کے آگے کیا اور پانی پلانے کی خاطر اسے ٹیڑھا کر کے ابھی جھکایا ہی تھا کہ عمر نے انتہائی پھرتی سے آگے بڑھ کے اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑ لیا۔ وہ چیختی چلاتی اور شور کرتی رہی مگر عمر نے بجلی کی سی تیزی سے اس کو اپنی سانڈنی پر بٹھایا اور خود بھی چھلانگ لگا کر سوار ہو گیا۔ ماروی چیخ رہی تھی' اس نے منہ پر کپڑا باندھ کر اسے چپ کرا دیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کیا کہ ماروی کو پالان کے ساتھ مضبوطی

سے جکڑ دیا تاکہ وہ کود کر بھاگ نہ سکے۔ ماروی نے اپنی طرف سے بڑی کوشش کی' بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے' مدد کے لیے پکارا' مگر سب بیکار۔ اس کی سہیلی بھی چیخی چلائی اور پھر اپنی جان بچاتے ہوئے گھڑا چھوڑ کر گاؤں کی جانب بھاگ کھڑی ہوئی۔

"بھاگو بھاگو۔۔۔ بچاؤ بچاؤ!"

وہ چیختی ہوئی گاؤں کی طرف جا رہی تھی۔ ادھر عمر نے یہ سب کچھ اتنی تیزی سے اور اچانک کیا تھا کہ ماروی بے بس ہو گئی تھی۔ وہ آنسو بہانے کے سوا کچھ نہ کر سکی کیونکہ اس کے ہاتھ بھی بندھے ہوئے تھے اور وہ خود بھی رسیوں سے جکڑی ہوئی تھی۔ عمر اپنی کامیابی پر خوش تھا' وہ سانڈنی کو دوڑاتا ہوا عمرکوٹ کی جانب روانہ ہو گیا تاکہ جس قدر جلد ہو اسی میل کا فاصلہ طے کر کے اپنے محلوں میں جا پہنچے۔ اس نے تو اس افراتفری اور مارا ماری میں اسے اچھی طرح دیکھا بھی نہیں تھا۔

عمرکوٹ پہنچ کر عمر نے ماروی کو محل میں اس طرح رکھا جیسے قید کر دیا گیا ہو۔ اسے کہیں آنے جانے کی اجازت بھی نہیں تھی کیونکہ اس کے بھاگ جانے کا خطرہ موجود تھا۔ مگر اس کے آرام و راحت کا بڑا خیال رکھا گیا اور اس کی خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی۔ عمر نے باندیوں کو حکم دیا کہ۔

"ماروی کو شاہی لباس پہنایا جائے!"

لیکن ماروی نے شاہی لباس پہننے سے صاف انکار کر دیا اور کہا۔

"مجھے میرے پرانے کپڑوں ہی میں رہنے دیا جائے۔ میں شاہی لباس نہیں پہنوں گی۔"

عمر کو اطلاع دی گئی کہ ماروی لباس تبدیل کرنے پر تیار نہیں ہوتی۔ اسے یہ بھی بتایا گیا' جب سے وہ آئی ہے اس نے رو رو کر اپنا برا حال کر لیا ہے۔ وہ نہ کچھ کھاتی ہے' نہ پیتی ہے اور نہ ہی بات چیت کرتی ہے۔ عمر نے اس کی خدمت کرنے کے لیے باندیاں مقرر کر دی تھیں جو ہر طرح سے اس کا خیال رکھ رہی تھیں لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس کا رونا ہی بند نہیں ہو رہا تھا۔ باندیوں نے اپنے طور پر اسے بہتیرا سمجھایا مگر سب بے سود۔ وہ بیچاری کیا کر

سکتی تھیں۔؟اس رات جب عمر محل سرا میں گیا تو اس نے دیکھا' ماروی نے اپنی عجیب حالت بنا رکھی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور رو رو کر آنکھیں سوج گئی تھیں۔ اس نے بڑے پیار سے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"اس طرح رونے دھونے سے کیا فائدہ۔؟اب تمہیں رانی بن کے اس محل میں رہنا ہے۔ تم میری مہارانی بنو گی اور عیش و آرام سے زندگی گزارو گی۔"

ماروی جو پہلے ہی رو رہی تھی عمر کی اس بات پر اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس وقت وہ بری طرح سسکیاں بھر رہی تھی۔ عمر کا خیال تھا شاید وہ کسی لالچ میں آجائے' اسی لیے کہنے لگا۔

"میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری ہر خواہش پوری کروں گا تم اس محل میں میری دوسری رانیوں کی سردار بن کے رہو گی اور زر و جواہر میں کھیلو گی۔!"

وہ اسے طرح طرح کے لالچ دیتا رہا تاکہ وہ اپنی غربت اور مفلسی کی زندگی کے مقابلے میں شاہی عیش و آرام کو ترجیح دے لیکن ماروی پر اس کی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بیٹھی سسکیاں بھرتی رہی' اس کی باتیں سنتی رہی اور لاکھ بلانے پر بھی اس نے کوئی بات نہ کی۔ پھر جب بات کی بھی تو صرف یہی کہا۔

"مجھے آپ سے اور آپ کے محلوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے اپنے گاؤں کی مفلسی کی زندگی زیادہ پسند ہے میرا رشتہ کھیت سے ہو چکا ہے۔ وہ میرا منگیتر ہے اور اسی سے میں شادی کروں گی۔ کھیت کے بغیر میری زندگی بیکار ہے۔ مہربانی کر کے مجھے واپس میرے گاؤں پہنچا دیں۔"

پھر وہ عمر کے آگے ہاتھ جوڑ کر واسطے دیتے ہوئے بولی۔

"آپ نے میری ہر خواہش پوری کرنے کا وعدہ کیا ہے' میری پہلی اور آخری خواہش یہی ہے کہ مجھے ملیر میرے گاؤں پہنچا دیا جائے میں وہیں خوش رہوں گی۔"

عمر یہ سوچ رہا تھا کہ ابھی وہ تازہ تازہ آئی ہے اور اسے ماں باپ اور وطن چھوٹنے کا غم

ہے' دو چار روز گزر جائیں گے تو خود بخود ٹھیک ہو جائے گی' جوں جوں وقت بیتے گا یہ اپنے گاؤں کے ساتھ ساتھ ماں باپ کو بھی بھول جائے گی مگر یہ بھی اس کی خام خیالی تھی۔ ماروی تھی کہ دن رات اپنے ماں باپ' کھیت اور اپنے گاؤں کو یاد کر کر کے اپنا برا حال کر رہی تھی جیسے جیسے عمر اس سے پیار جتاتا تھا' اسے شاہانہ زندگی گزارنے اور زرو جواہر کا لالچ دیتا ویسے ویسے ماروی کو اس سے نفرت ہوتی جا رہی تھی۔ ہیرے جواہر' بیش قیمت شاہی لباس' شاہانہ زندگی' محل کا عیش و آرام' اس کی نظر میں یہ سب کچھ ہیچ تھا۔ ماروی کا تو صرف یہی کہنا تھا۔

"مجھے شاہی فاخرہ لباسوں سے اپنے پرانے اور معمولی کپڑے زیادہ پسند ہیں' مرغن شاہی کھانوں سے تھر کے جنگلی پھل پھول زیادہ مرغوب ہیں اور ان عالیشان محلوں کی بجائے اپنے گاؤں کے گھاس پھونس اور گارے سے بنے ہوئے جھونپڑوں میں کہیں زیادہ آرام اور سکون ملتا ہے۔ مجھے میرے گاؤں میں ماروؤں کے پاس پہنچا دیا جائے۔ میں وہیں رہنا پسند کروں گی۔"

جب ماروی پیار محبت اور زرو جواہر کے لالچ میں نہ آ سکی اور اس پر کسی طرح قابو نہ پایا جا سکا تو عمر نے سوچا' نرمی سے کام نہیں چلے گا' اس کے ساتھ سختی سے پیش آنا چاہیے۔ اس نے اسے طعنہ دیتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔

"تم ایک غریب کسان کی بیٹی ہو اور تمہاری سگائی ایک مفلس گڈریے سے ہوئی ہے۔ ان کے پاس نہ اچھا کھانے کو ہے نہ اچھا پہننے کو ہے اور نہ ہی رہنے کو معقول مکان ہے' اس کے برعکس میں تمہیں اپنی رانی بنا رہا ہوں اور تمہیں عیش و آرام کی شاہی زندگی پیش کر رہا ہوں۔ بتاؤ تمہیں یہ شاہی زندگی پسند ہے یا گاؤں میں غربت میں رہنا پسند ہے۔؟"

جواب میں ماروی نے پورے اعتماد کے ساتھ بے خوف ہو کر کہا۔

"اے بادشاہ! یہ مانا کہ مال و دولت سے آپ کے خزانے بھرے ہوئے ہیں لیکن مجھے اپنا حقیر سا جھونپڑا زیادہ عزیز ہے جن میں ہم لوگ اپنی مرضی اور پسند سے زندگی گزارتے ہیں"۔

پھر اس نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آپ کو یہ عالیشان محل اور زر و جواہر کی زندگی مبارک ہو۔ ہمارے ہاں عورت کی ایک بار شادی ہوتی ہے اور میری شادی کھیت سے ہو چکی ہے۔ اب میں کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ میرا مرنا جینا سب کھیت کے ساتھ ہے، جو مارو ہے اور ہم جیسا ہے۔"

اس طرح جب عمر نے یہ اندازہ ہی نہیں بلکہ یقین کر لیا کہ وہ ماروی کو کسی طرح بھی رام نہیں کر سکتا تو اس نے اس کو محل کے ایک کمرے میں قید کر دیا۔ قید بھی ایسے کیا کہ اسے زنجیروں میں جکڑ دیا گیا اور اس پر طرح طرح کی سختیاں کی جانے لگیں لیکن ماروی اپنے ارادے کی سچی اور پکی تھی، وہ بڑے صبر و استقلال سے ساری مشکلات برداشت کر رہی تھی۔ اس نے یہ گوارا نہ کیا کہ محض اپنے عیش و آرام کی خاطر مصائب سے گھبرا کے اپنی پاک دامنی پر داغ لگا لے۔ اسے کامل یقین تھا کہ یہ مصیبت کے دن زیادہ دیر تک نہیں رہیں گے، آخر کو یہ مشکلات ختم ہوں گی اور وہ اپنے عزیزوں سے جا ملے گی۔ اسی امید پر وہ ہر قسم کی مصیبت کا سامنا کر رہی تھی اور روتی دھوتی مجبوری و مہجوری میں دن گزار رہی تھی۔

اسی طرح ایک سال گزر گیا۔ اس دوران کھیت ماروی سے مل آیا تھا، وہ اس طرح کہ جب عمر ماروی کو اٹھا کر لے گیا تو اس کی سہیلی نے گھر جا کر اس کے باپ پالنا اور ماں مرکھی کو بتایا کہ ماروی کو عمر کوٹ کا حکمران زبردستی اٹھا کر لے گیا ہے تو یہ سن کر دونوں کے تن بدن سے جیسے جان نکل گئی، مگر بیچارے کیا کر سکتے تھے۔؟ پہلے تو انہوں نے ارادہ کیا کہ عمر کوٹ جائیں اور وہاں جا کر فریاد کریں لیکن پھر اس خیال سے خاموش ہو گئے کہ جب حکمران خود ہی اسے اٹھا کر لے گیا ہے تو پھر وہ فریاد کس کے پاس جا کر کریں گے۔؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری بیٹی پر اور کوئی مصیبت آ جائے۔ پھر انھیں یہ بھی خیال آیا ہو سکتا ہے اس طرح ان کی بیٹی کی زندگی بدل جائے، اگر وہ ہمارے پاس رہتی تو ہماری طرح ساری زندگی غربت اور تنگدستی میں گزارتی۔ یہی کچھ سوچ کر انھوں نے عمر کوٹ جانے کا ارادہ بدل دیا اور اس کے اچھے مستقبل کی امید میں اسے چھڑوانے کی کوشش نہ کی لیکن ماروی کے منگیتر نے ہمت نہ ہاری۔ وہ کہنے لگا۔

"میں ماروی کے پاس ضرور جاؤں گا وہ میری منگیتر ہے۔"

اس نے ایک روز فقیروں کا بھیس بدلا اور عمر کوٹ کی جانب چل دیا۔ وہاں جا کر اس نے ماروی کو تلاش کرنے سے پہلے اپنا کوئی ٹھکانا بنانا ضروری سمجھا۔ عمر کوٹ کے باہر ایک بزرگ کی خانقاہ تھی کھیت نے وہاں اپنا ڈیرا لگا لیا اور فقیروں کی طرح مانگتا مانگتا اسی شاہی محل تک پہنچ گیا جہاں ماروی قید تھی۔ اس نے محل کے دروازے پر جا کر خیرات کے لیے آواز لگائی اور ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا تاکہ کہیں ماروی نظر آ جائے۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ عین اس وقت ماروی نے اوپر سے دیکھا تو وہاں فقیر کے بھیس میں کھیت کھڑا تھا۔ اس نے ایک برس کے بعد کوئی اپنا دیکھا تھا اور وہ بھی اس کا پیارا کھیت تھا۔ لہٰذا اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ وہ اوپر سے دیکھ رہی تھی اور نیچے سے کھیت بھی اسے دیکھ چکا تھا' دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور دونوں میں جیسے نئی زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ ماروی نے اپنی ایک ہمدرد نوکرانی کو اپنا رازدار بنا لیا اور اس کے ہاتھ فقیر کو خیرات بھیجنے کے ساتھ یہ پیغام بھی بھیجا کہ۔

"پیارے کھیت! اطمینان رکھو۔ میں تمھاری ہوں اور تمھاری رہوں گی۔ میری وفا میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ تم واپس جا کر باپ اور ماں کو حوصلہ دو۔ اللہ نے چاہا تو ہم بہت جلد مل جائیں گے۔"

اسی زمانے میں موسم برسات آ گیا تھا جس سے ماروی کے دل میں اپنوں سے جدائی کا غم اور بھی جاگ پڑا کیونکہ اس موسم میں بادل برستے تھے تو ملیر کے علاقے سرسبز و شاداب ہو جایا کرتے تھے۔ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی ہو جاتی تھی۔ اسے وہ سہانا زمانہ یاد آیا تو بے اختیار جی بھر آیا اور خوب روئی۔ اس روز جب رات کو عمر اس کے پاس آیا تو وہ اس سے کہنے لگی۔

"میری ایک خواہش ہے۔ مجھے امید ہے آپ اسے پورا کریں گے۔؟"

یہ سنتے ہی عمر دل ہی دل میں خوش ہو گیا کہ شاید ماروی راضی ہو رہی ہے۔ اس نے جلدی سے پوچھا۔

"میں تمھاری ہر خواہش پوری کروں گا۔ بتاؤ تمھاری کیا خواہش ہے۔؟"

اس پر ماروی نے آنسو بہاتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کہا۔
"ہو سکتا ہے اب میں اپنی زندگی میں ملیر نہ جا سکوں اور یہیں تڑپ تڑپ کر جان سے چلی جاؤں' میری آپ سے درخواست ہے کہ مرنے کے بعد میری لاش کو ملیر میں میرے گاؤں تہلا پہنچا دیا جائے تاکہ کم از کم مرنے کے بعد تو میں اپنے وطن کی پیاری مٹی سے مل سکوں۔!"

اس نے روتے ہوئے یہ کہا اور ہچکیاں لیتے ہوئے بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ اس وقت اس کی حالت اس قدر قابل رحم ہو رہی تھی کہ خود عمر کو بھی اس پر ترس آ گیا۔ اس پر اتنا اثر ہوا کہ ساری ہوس بھول گیا اور اس کے دل میں انسانی ہمدردی کا جذبہ جاگ پڑا۔ سوچنے لگا' میں اس بیچاری پر ناحق اتنا ظلم کر رہا ہوں۔ اس نے اسی وقت ماروی سے معافی مانگتے ہوئے کہا۔

"ماروی! میں نے اب تک تم پر جو زیادتی کی ہے' میں اس پر شرمندہ ہوں اور اس کے لیے تم سے معافی مانگتا ہوں۔ تم ایک باعصمت اور پاک دامن لڑکی ہو۔ اور آج سے میری بہن ہو۔!"

اس کے بعد اس نے اسی وقت ماروی کے عزیزوں کے پاس ایک قاصد روانہ کیا اور انھیں پیغام بھیجا کہ۔

"آپ کی بیٹی ماروی میرے پاس ہے اور وہ میری بہن کی طرح ہے۔ آپ لوگ آئیں اور اسے اپنے ساتھ لے جائیں۔"

ماروؤں کو جب عمر کا یہ پیغام ملا تو وہ کچھ شک و شبہ میں پڑ گئے۔ ایک دوسرے سے کہنے لگے۔
"یقیناً یہ عمر کی کوئی چال ہے۔ وہ سزا دینے کے لیے ہمیں دھوکے سے بلا رہا ہے۔"

انھوں نے اس بات کی تصدیق کرنے کی خاطر کہ عمر واقعی نیک دلی سے انھیں بلا رہا ہے یا دھوکا دے رہا ہے' ایک آدمی کو عمر کوٹ بھیجا اور جب اس نے واپس آ کر یقین دلایا کہ اس کی نیت نیک ہے تو چند آدمی مل کے عمر کوٹ گئے۔ عمر نے بڑی عزت سے ان کا استقبال

کیا' ان کی خاطر تواضع کی اور پھر ماروی کو ان کے ساتھ رخصت کر دیا۔ جاتے وقت اس نے بہت سامال اور دولت بھی دی تاکہ وہ اس کی شادی کھیت کے ساتھ دھوم دھام سے کر سکیں۔ اس طرح مارو' ماروی کو اپنے ساتھ لے کر خوشی خوشی ملیر اپنے گاؤں میں آ گئے۔ ماروی ایک برس کے بعد واپس آئی تھی' سب گھر والے خوش تھے لیکن اس کا منگیتر کھیت اس سے کچھ بدگمان نظر آ رہا تھا۔ ماروی نے اسے لاکھ یقین دلایا اور کہا۔

"میں جس طرح پاک دامن گئی تھی اسی طرح پاک دامن واپس آئی ہوں!"

یہی نہیں بلکہ اس نے ان مصائب اور مشکلات کی تفصیل بھی بتائی جو اپنی پاک دامنی قائم رکھنے کی خاطر اسے جھیلنا پڑی تھیں مگر کھیت کے دل میں گرہ پڑ گئی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔

"یہ کیسے ممکن ہے۔؟ یہ ایک برس تک دوسرے شخص کے پاس رہی ہے' پھر پاک دامن کیسے ہو سکتی ہے۔؟"

تاہم کھیت کے دل کا میل دور نہیں ہو رہا تھا۔ وہ کسی صورت میں اس کی بات پر یقین کرنے پر راضی نہیں ہو رہا تھا۔ ادھر کسی نہ کسی طرح عمر کو بھی اس بات کا پتا چل گیا کہ مارو بیچاری ماروی کی پاک دامنی پر شک کر رہے ہیں۔ اسے یہ بھی خیال آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ اس کی وجہ سے ہو رہا ہے لہٰذا اس موقع پر مجھے اس کی مدد کرنی چاہیے۔ اس نے کہا۔

"اس سے ماروی کی زندگی کو نقصان پہنچنے کے ساتھ ساتھ میری اچھی شہرت کو بھی بدنامی کا داغ لگ سکتا ہے۔"

اس نے ماروؤں پر حملہ کرنے کی تیاری کی اور پھر مار اماری کرتا ہوا ملیر کی طرف چل دیا۔ وہاں آ کر اس نے ملیر کا محاصرہ کر لیا جس کے ساتھ ہی ماروؤں میں افراتفری پھیل گئی اور وہ مقابلے کے لیے تیار ہونے لگے۔ یہ صورت حال بڑے بوڑھوں کے لیے بڑی تشویشناک تھی' چند ایک مل کے عمر کے پاس گئے تاکہ عمر سے دریافت کریں کہ اس نے ان کا محاصرہ کیوں کیا ہے۔؟ جواب میں عمر نے ان سے کہا۔

"کھیت نے ماروی کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا ہے' اس سے میری بدنامی بھی ہو سکتی ہے۔"
اس موقع پر ماروی خاموش نہ رہ سکی۔ اس نے عمر کے قریب جا کر کہا۔
"حضور! ہم غریب آپ کی رعایا میں ہیں۔ آپ دانشمند ہیں' خود ہی فیصلہ کریں کہ اس میں قصور کس کا ہے۔؟"
پھر وہ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولی۔
"آپ نے ایک سال تک مجھے اپنے محل میں قید رکھا' اس صورت میں میری پاک دامنی پر کون یقین کر سکتا ہے۔۔۔ کھیت کی بدگمانی فطری ہے۔۔۔ یہ خطا تو آپ کی ہے کہ آپ نے ایک غیر لڑکی کو ایک برس تک اپنے پاس رکھا اور اس کے گھر والوں کو خبر تک نہیں دی۔!"
ماروی کی یہ بات سن کر عمر اپنے کیے پر بہت پچھتایا۔ اس پر اس کی باتوں کا بڑا اثر ہوا تھا اور وہ انتہائی نادم دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ماروی کے ماں باپ اور دوسرے موجود لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
"میں بلاشبہ اس سلسلے میں قصوروار ہوں کہ میں نے ماروی کو اتنا عرصہ اپنے محل میں قید رکھا لیکن میں تم لوگوں کو یقین دلاتا ہوں' وہ نہایت نیک اور پاک دامن ہے۔ میں نے اسے اپنی بہن بنالیا ہے اور میں قسم کھا کے کہتا ہوں' وہ عصمت و عفت والی ہے۔"
اس نے مزید کہا۔
"اگر میری ان باتوں کے باوجود آپ لوگوں کو یقین نہیں آیا تو تم میری آزمائش کر سکتے ہو۔ میں ہر قسم کی آزمائش کے لیے تیار ہوں۔؟"
اس موقع پر جلدی سے ماروی آگے بڑھی اور کہنے لگی۔
"الزام تو مجھ پر لگایا گیا ہے اس لیے آزمائش بھی میری ہونی چاہیے۔؟"
"یہ میری پاک دامنی کا معاملہ ہے اور میں اپنی پاک دامنی ثابت کروں گی۔؟"
اس وقت طے کیا گیا جلتی ہوئی آگ میں لوہے کی سلاخ کو اس قدر تپایا جائے کہ وہ سرخ ہو جائے اور پھر یہ سلاخ ماروی کی ہتھیلی پر رکھی جائے۔ اگر وہ پاک دامن ہے تو اسے

کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور اگر وہ جھوٹی ہو گی تو اس کی ہتھیلی جل جائے گی۔ یہ تجویز سب نے منظور کی اور پھر ایسے ہی کیا گیا مگر ماروی چونکہ واقعی پاک دامن تھی اسے کوئی نقصان نہ پہنچا۔ دہکتی ہوئی سرخ سلاخ اس کے ہاتھ پر ایسے نظر آ رہی تھی جیسے پھول رکھا ہو۔ یہ دیکھ کر تمام لوگوں کو یقین آ گیا کہ۔

"ماروی سچ کہہ رہی ہے۔۔۔ وہ پاک دامن ہے۔"

لیکن اس کے باوجود کہ سب کو اس کی پاک دامنی کا یقین ہو گیا تھا' اس نے کہا۔

"میں اس سے بھی بڑا امتحان دوں گی!"

چنانچہ اسے نے آگ کا ایک بہت بڑا الاؤ جلایا اور اس میں سے کئی بار ادھر سے ادھر گزر گئی مگر اس کے لباس تک کو آگ نے نقصان نہ پہنچایا۔ اب تو کسی قسم کے شک کی گنجائش نہ رہ گئی تھی۔ اس کے ماں باپ نے جلدی سے آگے بڑھ کے اسے چھاتی سے لگا لیا۔ اور پھر چند ہی روز میں بڑی دھوم دھام سے اس کی کھیت کے ساتھ شادی ہو گئی۔

مومل رانو

مومل رانو کی داستان بھی سندھ کی عوامی کہانیوں میں مشہور ہے اور یہ مومل میندھرا کے نام سے بھی جانی پہچانی جاتی ہے۔ اس کا زمانہ پندرھویں صدی عیسوی کی پہلی دہائی ہے اور یہ سندھ میں سومرہ خاندان کے حکمرانوں کا دور تھا جب ہمیر سومرو حکومت کر رہا تھا جو اس خاندان کا آخری حکمران تھا۔ اس زمانے میں سندھ کی جنوب مغربی سرحد پر ایک چھوٹی سی ریاست تھی جس کا دارالحکومت کاک تھا جو کاک ندی کے کنارے پر آباد تھا۔ موجودہ دور میں بھی تحصیل شاہ بندر کا جنوب مغربی حصہ "کاک مکان" کہلاتا ہے۔ اس وقت جو چند چھوٹی چھوٹی ہندو ریاستیں موجود تھیں ان کے راجوں کے نام کے ساتھ رانا کا لفظ لگتا تھا۔ ریاست کاک کے راجے کا نام رانا نند تھا جس کا تعلق گوجر قوم سے تھا۔ اس کی ریاست یوں تو رقبے کے لحاظ سے کوئی زیادہ بڑی نہ تھی لیکن خوشحال تھی اور یہاں کے لوگ امن چین کی زندگی گزار رہے تھے۔ اس راجا کا کہنا تھا کہ۔

"رعایا میری اولاد کی طرح ہے۔۔۔۔وہ خوش ہے تو میں بھی خوش ہوں۔"

راجا نند کی دو بیٹیاں تھیں۔ ایک کا نام مومل تھا اور دوسری کا نام سومل تھا۔ یوں تو یہ

دونوں بہنیں خوبصورت اور ذہین تھیں لیکن مومل جو بڑی تھی، وہ اپنی چھوٹی بہن سے بہت زیادہ حسین بھی تھی اور ذہانت میں بھی اس سے آگے تھی۔ دونوں بہنیں جوان تھیں اور ابھی کنواری تھیں کہ رانا نند کا انتقال ہو گیا۔ اس کے خاندان میں صرف یہ دو بیٹیاں ہی تھیں جن پر باپ کے انتقال کی وجہ سے غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ انھوں نے کچھ روز تک باپ کی موت کا سوگ منایا اور پھر بڑی بہن مومل نے حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی۔ وہ حسین تو تھی ہی، اس کے ساتھ ساتھ انتہائی عقلمند اور معاملہ فہم بھی تھی۔ وہ اپنے باپ کو بھی امور ریاست چلاتے ہوئے دیکھتی رہی تھی، یہی وجہ تھی کہ اس نے بڑے حسن و خوبی سے ریاست کا انتظام و انصرام سنبھال لیا تھا۔ شروع شروع میں تو لوگوں کا خیال تھا کہ۔

"ایک لڑکی کے لیے ریاست کا کاروبار چلانا بہت مشکل ہو گا۔"

مگر جب انھوں نے دیکھا، مومل بڑی ذہانت اور محنت سے ریاست کے امور نمٹانے لگی ہے تو درباری اور امراء اس کی معاملہ فہمی کے قائل ہو گئے۔ مومل ایک طرف تو ریاست کے کاموں کو بڑی خوبی سے چلا رہی تھی اور دوسری جانب اس نے عام لوگوں کی زندگی بہتر بنانے اور انھیں سہولتیں مہیا کرنے کی کوششیں بھی جاری رکھیں۔ ان ساری کوششوں میں اس کی چھوٹی بہن سومل بھی اس کے ساتھ برابر کی شریک تھی۔ تاہم یہ سلسلہ کب تک چل سکتا تھا۔؟ وہ کب تک اکیلی ریاست کا کاروبار چلا سکتی تھی۔؟ پھر یہ کہ دونوں بہنیں جوان اور کنواری تھیں اس لیے ان کی شادی کا مسئلہ بھی تھا۔ مومل بڑی تھی اور رواج کے مطابق اس کی شادی پہلے ہونی چاہیے تھی۔ اس کے بعض قریبی وزراء نے بھی کئی بار دبی دبی زبان میں مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"رانی جی! اب آپ کو ایسے جیون ساتھی کی ضرورت ہے جو امور ریاست میں بھی آپ کا ہاتھ بٹا سکے؟"

یوں تو اس کے حسن اور ریاست کو دیکھتے ہوئے کئی ایک راجکمار اس پر دل و جان سے نثار تھے مگر مومل کا مقصد صرف شوہر حاصل کرنا نہیں تھا بلکہ وہ یہ چاہتی تھی کہ اس کا جیون

ساتھی ایسا شخص ہو جو بہادر ہو' مردانہ خوبیوں کا مالک ہو' سمجھ دار ہو اور حسن صورت کے ساتھ ساتھ حسن سیرت کا بھی مالک ہو تاکہ ریاست کے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹائے۔ دونوں بہنیں اکثر تنہائی میں اس سلسلے میں ایک دوسری سے باتیں کرتیں تو سومل کہتی۔

"تم بڑی ہو' پہلے تمہیں شادی کرنی چاہیے۔ اس طرح کب تک حکومت کا کام چلاؤ گی۔؟ پھر یہ بھی ہے کہ ہمیں ایک نہ ایک روز تو شادی کرنی ہی ہے۔؟"

اس طرح دونوں بہنوں نے بارہا آپس میں مشورہ کیا اور آخر انھوں نے کاک ندی کے کنارے ایک طلسمی محل تعمیر کرانا شروع کر دیا۔ اپنی ریاست میں جہاں جہاں ماہر کاریگر تھے انھیں بلایا اور پھر آس پاس کے علاقوں سے بھی ماہر تعمیر بلوائے اور کچھ عرصہ میں یہ محل بن کے تیار ہو گیا۔ یہ محل اپنی خوبصورتی اور فن تعمیر کے لحاظ سے تو بے مثال تھا ہی لیکن انھوں نے اسے محض محل کی بجائے ایک طلسم کدہ بنوایا تھا۔ اس کے چاروں طرف نہایت شاندار باغ لگوائے ان باغات میں صرف رنگا رنگ کے پھولدار پودے اور پھل دار درخت ہی نہیں لگوائے تھے بلکہ اس کی روشوں میں ایسی بھول بھلیاں بنوائیں کہ اگر آدمی ایک بار ان میں داخل ہو جائے تو اس کا باہر آنا مشکل ہو جائے۔ محل کا بیرونی حصہ شیشے کا تھا جس کے ارد گرد چاروں جانب کچھ علاقے کو خالی رکھا گیا تھا۔ وہ انتہائی صاف و شفاف تھا اور اس پر پانی کی ہلکی سی تہہ رکھی گئی تھی جس پر جب شیشے کا عکس پڑتا تو یوں دکھائی دیتا جیسے پورا محل پانی کے اوپر کھڑا ہے۔ دیکھنے والے کو یہ دھوکا ہوتا کہ اسے محل تک جانے کے لیے پانی میں تیر کر جانا پڑے گا۔ یہ پانی محل کے چاروں طرف پھیلا ہوا تالاب سا دکھائی دیتا تھا جو اس کے ستونوں تک چلا جاتا تھا۔ محل کے دروازوں پر خوفناک شیروں کے مجسمے نصب تھے۔ شیروں کے ان مجسموں میں یہ کمال دکھایا گیا تھا کہ ایک شیر بیٹھا ہوا نظر آتا تھا تو دوسرا دوڑتا ہوا آتا دکھائی دیتا تھا جیسے حملہ کرنے کے لیے بھاگا آ رہا ہے۔ محل میں جادوگری اور طلسم سازی کا یہ کھیل یہیں ختم نہیں ہوتا تھا' اس کے آگے بھی یہ سلسلہ چلتا تھا۔ محل کے دیوان خانے میں سات پلنگ بچھوائے گئے تھے جو شکل و صورت اور اپنے انداز میں بالکل ایک جیسے تھے۔ ان

سات پلنگوں میں چھ ایسے تھے جن کی نواڑ انتہائی کچے دھاگے سے بنی ہوئی تھی اور اس قدر نازک تھی کہ ذرا سے بوجھ سے ٹوٹ جائے۔ ان میں ساتواں پلنگ ایسا تھا جو مضبوط نواڑ سے بنا گیا تھا تاہم دیکھنے والا اس کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ ان میں یہ فرق رکھا گیا ہے' اسے سارے پلنگ ایک سے نظر آتے تھے۔ ان پلنگوں کے نیچے گہرے گڑھے کھدوائے گئے تھے تا کہ گرنے والا جان سے چلا جائے۔ اس طرح محل تک جانے والا پہلے مرحلے پر بھول بھلیوں ہی میں گم ہو کر ہمت ہار دیتا تھا اسے آگے جانے کا راستہ ہی نہیں ملتا تھا۔ اگر کوئی شخص بھول بھلیوں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا تو آگے پھیلے ہوئے تالاب کو دیکھ کر گھبرا جاتا کہ اس کو کیسے پار کروں۔؟ پھر جب اس کی نظر دھاڑتے ہوئے خوفناک شیروں پر پڑتی تو اس کے اوسان خطا ہو جاتے اور وہ اپنی جان بچانے کے لیے واپس بھاگنے لگتا۔ اور اگر کسی طرح یہ مرحلہ بھی طے ہو جائے تو دیوان خانے میں بچھے ہوئے پلنگ پر بیٹھنا اپنی موت کو دعوت دینا تھا۔ جب یہ محل بالکل تیار ہو گیا تو مومل نے نزدیک و دور اعلان کرا دیا کہ۔

"جو شخص باغ میں سے گزر کر' بھول بھلیاں سے نکل جائے گا۔ پھر شیروں سے بچ کر پانی کا تالاب پار کر کے محل کے اندر بچھے ہوئے پلنگ پر جا بیٹھے گا' میں اس سے شادی کر لوں گی۔!"

اس اعلان کا ہونا تھا کہ بہت سے راجکمار اور امیرزادے اپنی قسمت آزمانے کے لیے تیار ہو گئے۔ مومل کے حسن کا چرچا تو پہلے ہی سے دور دور تک پھیلا ہوا تھا اور اس سے شادی کی تمنا رکھنے والے نوجوانوں کی بھی کمی نہ تھی۔ ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ مومل اس کی ہو جائے۔ اسی لیے جب مومل نے اپنی شادی کی شرائط کا اعلان کرایا تو نوجوان دور دور سے قسمت آزمائی کی خاطر کاک میں آنے لگے۔ مومل نے محل کے باہر باغ کے دروازے پر ایک نقارہ رکھوا دیا تھا تا کہ جو بھی امیدوار آئے نقارہ بجا کر اپنی آمد کی خبر کر دے۔ اس کی باندیوں میں سے ایک باندی انتہائی ہوشیار اور چالاک تھی جس کا نام ناتر تھا۔ اس کی ہوشیاری اور چالاکی کا یہ عالم تھا کہ اڑتی چڑیا کے پر گن لیتی تھی۔ مومل نے اس کے سپرد یہ کام کیا تھا' جب کوئی شادی کا امیدوار نوجوان آتا اور باہر رکھے ہوئے نقارہ پر چوٹ مارتا تو ناتر محل سے نکل

کر دروازے کے پاس پہنچ جاتی اور اسے خوش آمدید کہتے ہوئے اس کا استقبال کرتی۔
"آیئے۔ میرے ساتھ ساتھ اندر چلیے۔!"

آنے والا اس کے پیچھے پیچھے چل پڑتا اور تاتر چند قدم چلنے کے بعد غائب ہو جاتی۔ اس طرح آنے والا نوجوان اکیلا آگے بڑھنے لگتا۔ پھر یا تو وہ بھول بھلیاں میں کھو کے رہ جاتا' یا طلسمائی پانی اور خوفناک شیروں سے خوفزدہ ہو کر پلٹ جاتا اور اگر کوئی ان مرحلوں سے گزر بھی جاتا تو محل کے اندر پہنچ کر کچی نواڑ کے پلنگ پر بیٹھ جاتا اور یوں موت کے منہ میں چلا جاتا۔ اس طرح بہت سے نوجوان آئے مگر انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ کچھ بھول بھلیاں میں کھو گئے' کچھ مصنوعی پانی کا تالاب دیکھ کر پلٹ گئے' بعض شیروں سے خوفزدہ ہو کے جی ہار گئے اور بعض کچی نواڑ کے پلنگ پر بیٹھنے کے ساتھ ہی گہرے گڑھے میں جا گرے۔ یوں بہت سے شہزادوں' راجکماروں اور امیروں وزیروں نے اپنا آپ گنوا لیا۔ جن میں سے کئی ایک تو نامراد ہو کے جنگلوں میں مارے مارے پھرنے لگے۔ ایک دو نے نہیں' بے شمار لوگوں نے اپنی قسمت آزمائی کی لیکن انھیں مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ کچھ لوگ تو اس قدر مایوس ہو گئے تھے کہ وہ شہر چھوڑ کے جنگلوں میں چلے گئے اور مومل کے عشق میں بیراگی بن گئے۔

اس زمانے میں سومرو حکمران کا پایہ تخت امرکوٹ تھا اور اس خاندان کا آخری بادشاہ ھمیر سومرو حکومت کر رہا تھا۔ ھمیر سومرو مشہور حکمران تھا اور اس کی بہادری کا بھی بہت شہرہ تھا۔ اس کے تین خاص وزیر تھے۔ ایک کا نام ڈونر بھٹی تھا' دوسرا سنترو ڈھاچانی تھا اور تیسرا رانا میندھرا تھا جو رشتے میں ھمیر سومرو کا سالا بھی لگتا تھا۔ ھمیر اپنے ان تینوں ساتھیوں کو بہت چاہتا تھا اور ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ یہ چاروں سرکار دربار کے علاوہ بھی اکٹھے نظر آتے تھے ایک ساتھ سیر و تفریح کرتے اور ایک ساتھ عیش و عشرت کی محفلیں جماتے۔ ھمیر سومرو کو شکار کھیلنے کا بہت شوق تھا اور اس کا بہت سا وقت اسی ذوق و شوق میں بسر ہوتا تھا جب وہ شکار کے لیے جاتا تو اس کے تینوں دوست بھی اس کے ساتھ ہوتے تھے۔

ایک روز ہوا یہ کہ ھمیر سومرو اپنے تینوں ساتھیوں کے ساتھ شکار پر گیا۔ اس روز

انھوں نے پرندوں کی بجائے ہرنوں کے شکار کا ارادہ کیا تھا اور ہرنوں کی تلاش میں دور تک نکل گئے تھے۔ اس علاقے میں وہ پہلے کبھی نہیں آئے تھے۔ تینوں شکار کی غرض سے ادھر ادھر گھوم رہے تھے کہ جنگل میں ان کی ملاقات ایک سیلانی جوگی سے ہو گئی۔ وہ یوں تو جوگی کے لباس میں تھا مگر اس کی شکل و صورت جوگیوں جیسی نہیں تھی۔ نوجوان تھا' خوبصورت تھا اور اس کی داڑھی اور جٹائیں بھی نہیں تھیں۔ چونکہ وہ عام جوگیوں سے مختلف نظر آ رہا تھا اس لیے سارے اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

ایک دوسرے سے کہنے لگے۔

"یار! یہ جوگی بہت مختلف دکھائی دے رہا ہے۔؟ یقیناً کوئی وجہ ہو گی۔!"

ھیر نے ساتھیوں کو روکنا چاہا اور کہا۔

"کوئی ہو گا' تم اپنا وقت کیوں ضائع کرنے لگے ہو۔ اسے اپنا کام کرنے دو ہم اپنا کام کرتے ہیں۔"

اس پر رانا میندھرا بولا۔

"ذرا اس سے پوچھیں تو سہی کہ یہ کون ہے اور اس جنگل میں اکیلا کیا کرتا پھر رہا ہے"؟

اتنا کہہ کے رانا میندھرا اس کے قریب گیا۔ پہلے اسے سلام کیا اور پھر پوچھنے لگا۔

"مہاراج! آپ اس سنسان جنگل میں اکیلے رہ رہے ہیں۔؟ کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے۔؟

جواب میں چند لمحوں تک جوگی انھیں دیکھتا رہا اور پھر لمبی سانس بھر کے بولا۔

"میری کہانی بڑی عجیب و غریب ہے' سنو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔۔۔ مگر تم لوگوں کو میری کہانی سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔؟"

"نہیں مہاراج۔۔۔ ہمیں دلچسپی ہے۔ اسی لیے تو آپ سے دریافت کر رہے ہیں۔؟"

رانا میندھرا یہ کہہ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ جب جوگی نے یہ کہا تھا کہ میری کہانی عجیب و غریب ہے تو یہ سن کر ھیر سومرو اور دوسرے ساتھی بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اور اس وقت سارے اس کے ارد گرد جمع تھے۔ ھیر سومرو نے اس سے کہا۔

"مہاراج! آپ ہمیں اپنی عجیب و غریب کہانی ضرور سنائیں۔ ہمیں بڑا اشتیاق ہے کہ آپ کی کہانی سنیں۔؟"

جواب میں جوگی کچھ دیر تک خاموش بیٹھا انھیں تکتا رہا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ جن سے باتیں کر رہا ہے وہ عام شکاری نہیں ہیں بلکہ شاہی خاندان کے افراد ہیں۔ اس نے باری باری چاروں کا جائزہ لیا اور پھر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں کبھی تمہاری طرح ایک راجکمار تھا اور مجھے ہر طرح عیش و آرام حاصل تھا۔ میں بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ شکار کھیلا کرتا تھا لیکن اب کاک کی رانی کی وجہ سے ایک بیراگی بن گیا ہوں۔"

"مگر یہ سب کچھ آپ کے ساتھ کیسے ہوا۔؟ کاک کی رانی نے کیا کیا جو آپ اپنا راج پاٹ چھوڑ چھاڑ کے جوگی بن گئے ہیں۔؟"

جوگی چند لمحوں کے لیے اپنے خیالات میں کھو گیا اور پھر کہنے لگا۔

"کاک کی رانی مومل کے عشق نے مجھے اس حالت تک پہنچا دیا ہے۔ میں اس حسینہ سے شادی کے لالچ میں کاک گیا لیکن میں اس کی شرائط پوری نہ کر سکا اور ناکام ہو کے اب ان ویرانوں میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ ناکامی کے بعد میرا دل دنیا سے اچاٹ ہو گیا ہے۔"

اس کے بعد جوگی نے اپنی پوری کہانی سنائی۔ وہ کس طرح مومل کے حسن و جمال پر فریفتہ ہوا اور اس کو حاصل کرنے کے لیے شرائط پوری کرنے میں ناکام ہو گیا۔ اور پھر امیر سے فقیر ہو کر جنگلوں میں نکل آیا۔ اس نے مومل کے حسن کا نقشہ کچھ اس انداز میں کھینچا تھا کہ ہمیر اور اس کے ساتھیوں کا دل بھی مچل گیا۔ انھوں نے مومل کے حسن کا چرچا تو سن رکھا تھا مگر یہ اندازہ نہیں تھا کہ لوگ اس کے عشق میں دیوانے ہو رہے ہیں۔ وہ آپس میں کہنے لگے۔

"ہمیں بھی چل کے قسمت آزمائی کرنی چاہیے۔ اور مومل کو دیکھنا چاہیے۔!"

انھوں نے جوگی سے اجازت لی اور چاروں کاک کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ تین چار

دن کا سفر تھا جو انھوں نے شوق میں جلد سے جلد طے کیا اور کاک جا پہنچے۔ وہاں پہلے تو انھوں نے ادھر ادھر لوگوں سے معلومات حاصل کیں اور جب انھیں یہ پتا چلا کہ اب تک بہت سے نوجوان ناکام ہو چکے ہیں جن میں سے بعض نے اپنی جان تک گنوادی ہے تو ان کے ارادے ڈانواں ڈول ہونے لگے۔ ایک دوسرے سے کہنے لگے۔

"ایسا نہ ہو مومل کو حاصل کرنے کی بجائے جان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔!"

پھر انھوں نے یہ کہہ کے اپنے آپ کو حوصلہ دیا۔

"یہ ضروری تو نہیں، اگر دوسرے ناکام رہے ہیں تو ہم بھی ناکام ہو جائیں۔ ہو سکتا ہے ہم میں سے کوئی کامیاب ہو جائے۔"

ہمیر سومرو کو تو اپنی کامیابی کا پکا یقین تھا۔ وہ بولا۔

"میں مومل کو ضرور حاصل کر کے رہوں گا۔"

یہ چاروں اس جگہ پہنچ گئے جہاں نقارہ رکھا ہوا تھا۔ ادھر مومل کو بھی ان کی آمد کی خبر مل گئی تھی۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ امرکوٹ کا حکمران اپنے ساتھیوں سمیت آیا ہے تاکہ مومل کی شرائط پوری کریں۔ جونہی وہ نقارہ کے پاس پہنچے ہمیر نے کہا۔

"پہلے میں قسمت آزمائی کروں گا۔"

پھر جیسے ہی انھوں نے نقارے پر چوٹ لگائی مومل نے اپنی خاص باندی ناتر کو بھیجا کہ وہ پہلے ان کی ذہانت کا امتحان لے۔ ناتر اسی وقت ان کے پاس گئی۔ پہلے بڑے ادب سے سلام کیا اور پھر ہر ایک کے سامنے تھالی میں کچھ چنے اور الجھے ہوئے سوت کے گچھے پیش کیے۔ رانا میندھرا تو یہ سب کچھ دیکھ کر قدرے سوچ میں پڑ گیا مگر ہمیر سومرو اور دیگر دونوں ساتھی جلدی سے آگے بڑھے، انھوں نے دیکھتے ہی دیکھتے تھالی میں سے چنے کھا لیے اور الجھے ہوئے سوت کے گچھے لے کر دھاگا سلجھانے لگے۔ اس کے برعکس رانا میندھرا نے چنوں کی طرف دیکھا تک بھی نہیں اس کے ساتھیوں نے جب چنے کھا لیے تو اس نے ہاتھ بڑھا کے اپنی تھالی اٹھا کر گھوڑے کے آگے کر دی۔ پھر اس نے الجھے ہوئے سوت کے گچھے کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے

اس کا ایک ہار بنا دیا اور وہ ہار اپنے گھوڑے کے گلے میں ڈال دیا۔ تاتر قریب ہی کھڑی اس کے اس سارے عمل کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی اور دل ہی دل میں اس کی ذہانت کی قائل ہو رہی تھی۔ جب وہ چنے اور الجھے ہوئے سوت کے گچھے ٹھکانے لگا چکا تو تاتر سے مخاطب ہو کر کہا۔

"اے لڑکی! جو کچھ تم نے دیکھا ہے' یہ سب کچھ اپنی رانی سے بیان کر دینا۔"

اگر وہ نہ بھی کہتا تب بھی تاتر واپس جا کر رانی کو سب کچھ بتاتی کیونکہ وہ تو آئی ہی اس لیے تھی کہ ان کی ذہانت کا اندازہ کر سکے' اس نے جا کر رانی سے پورا واقعہ بیان کر دیا کہ کس طرح تین نے چنے خود کھا لیے اور اور الجھا ہوا سوت سلجھانے بیٹھ گئے جب کہ ایک نے چنے اپنے گھوڑے کو کھلا دیے اور سوت کا گچھا کاٹ کر اس کا ہار بنایا اور وہ بھی گھوڑے کے گلے میں ڈال دیا۔ مومل نے باندی کی باتیں بڑے غور سے سنیں اور کہنے لگی۔

"ان میں سے یہ نوجوان ذہین معلوم ہوتا ہے۔"

"رانی جی! یقیناً ایسا ہی ہے۔ اگرچہ وہ چاروں خوبصورت اور نوجوان ہیں' اس کے باوجود یہ نوجوان اپنے ساتھیوں سے الگ نظر آتا ہے۔"

مومل نے سوچا' اس نوجوان کا ابھی مزید امتحان لینا چاہیے۔ لہٰذا اس نے اسی وقت حلوہ تیار کرایا اور تاتر حلوے کا تھال بھر کے ان کے پاس لے گئی۔ مومل نے تاتر سے یہ بھی کہا تھا کہ۔

"یہ تھال اسی نوجوان کو دینا اور کہنا' یہ آپ کے لیے رانی نے خود تیار کیا ہے۔"

تاتر نے ایسے ہی کیا۔ رانا مہندھرا سے جا کر کہا۔

"آپ کے لیے یہ کھانا رانی جی نے بھیجا ہے۔!"

آگے سے رانا مہندھرا نے ایک نظر حلوے کی طرف دیکھا اور بولا۔

"تمہاری رانی نے کیا ہمیں ناریاں سمجھ لیا ہے جو زنانہ کھانا ہمیں بھیج دیا ہے۔؟ انھیں جا کر بتاؤ' ہم مرد ہیں اور مردوں کے لیے مردوں جیسا کھانا ہونا چاہیے۔!"

تاتر نے واپس جا کر مول سے وہ سب کچھ بیان کردیا جو رانا مینڈھرا نے کہا تھا۔ مول نے اسی وقت قسم قسم کے بہت سے کھانے تیار کرائے اور ان کھانوں میں زہر ملا دیا۔ جب تمام کھانے تیار ہو گئے تو اس نے تاتر سے کہا' یہ تمام ان کے پاس لے جاؤ اور کہنا۔

"رانی نے آپ کے لیے مردانہ کھانے بھیجے ہیں اور امید کی ہے آپ کو پسند آئیں گے۔؟"

جب باندی یہ قسم قسم کے کھانے لے کر وہاں گئی تو مینڈھرا کے سوا باقی تینوں جلدی سے آ گئے۔ انھیں اس وقت شدید بھوک لگی ہوئی تھی اور طرح طرح کے پکوان دیکھ کر یہ بھوک اور بھڑک اٹھی تھی۔ جب تاتر نے ان سے یہ کہا۔

"یہ کھانے رانی جی نے آپ لوگوں کے لیے خاص طور پر خود تیار کیے ہیں۔"

تو وہ بہت خوش ہو گئے اور کھانے کے لیے ہاتھ بڑھانے ہی والے تھے کہ رانا مینڈھرا نے انھیں روک دیا۔ اس نے چند لحوں تک کھانوں کا جائزہ لیا کیونکہ اسے کچھ شک ہو گیا تھا۔ پھر اس نے دو تین نوالے قریب ہی کھڑے ایک کتے کے آگے ڈال دیے۔ کتے نے لپک کے کھالیا اور کھاتے ہی وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس طرح رانا مینڈھرا کی ذہانت سے چاروں کی جان بچ گئی۔ اس کے ساتھی گھبرا گئے تھے اس لیے کہنے لگے۔

"ہمیں مول کو حاصل کرنے کا خیال ترک کر دینا چاہیے۔ بہتر یہی ہے' یہاں سے چلے جائیں ورنہ کسی نہ کسی مرحلے پر اپنی جان گنوا بیٹھیں گے۔"؟

مگر رانا مینڈھرا نے ہمت نہیں ہاری تھی اس نے کہا۔

"ہمیں بزدلی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ اب اگر آ گئے ہیں تو ہمیں ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ کوئی پتا نہیں قسمت کی دیوی ہم پر مہربان ہو جائے اور ہم مول کو جیت لیں۔"

تاتر پہلے کی طرح واپس گئی اور اس نے رانی مول سے ساری روداد بیان کر دی۔ اس نے ساتھ ہی رانا مینڈھرا کی دانشمندی کی بہت تعریف کی۔ اس کا خیال تھا کہ اس سے زیادہ ذہین نوجوان کا ملنا مشکل ہے اور یہی رانی مول کے لیے مناسب ہے لیکن مول نے کہا۔

"پہلے میری شرائط پوری ہونی چاہئیں میں امتحان ضرور لوں گی۔ جو میری شرائط پر پورا اترے

گا وہی میرا شوہر بن سکے گا۔"

یہ پیغام جب ان چاروں تک پہنچا تو وہ امتحان کے لیے تیار ہو گئے۔ وہ تو اتنی دور سے آئے ہی اسی مقصد کے لیے تھے تاکہ اپنی اپنی قسمت آزمائیں اور دیکھیں، موُمل کس کے مقدر میں لکھی ہوئی ہے۔ دوسرے روز موُمل نے ناتر کو ان کے پاس بھیجا کہ وہ ان میں سے کسی ایک کو محل میں بچھے ہوئے پلنگ تک پہنچنے کی دعوت دے ہمیر سومرو کو اپنی ذہانت اور بہادری پر بڑا گھمنڈ تھا۔ اس نے جب باندی کی زبانی شرائط پوری کرنے کی دعوت کا سنا تو اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا "پہلے میں جاؤں گا۔ دیکھ لینا' یہ معاملہ تم لوگوں تک پہنچ نہیں سکے گا۔ میں پلنگ تک پہنچ جاؤں گا اور موُمل میری ہو جائے گی۔"

اس فیصلے کے بعد کہ پہلے شرائط پوری کون کرے گا' ناتر نے ہمیر سومرو کو ساتھ لیا اور بھول بھلیاں کی جانب چل دی۔ آگے آگے ناتر تھی اور اس کے پیچھے پیچھے ہمیر سومرو چل رہا تھا۔ جونہی وہ بھول بھلیاں میں پہنچے اچانک ناتر اسے دھوکا دے کر غائب ہو گئی اور ہمیر ادھر ادھر بھٹکنے لگا۔ طلسمائی محل کی اس بھول بھلیاں میں وہ اس طرح بھٹکا کہ اسے آگے جانے کا کوئی راستہ نہ مل سکا۔ لہٰذا وہ گھوم پھر کے واپس اپنے ساتھیوں کے پاس آ گیا اس وقت وہ اپنی جگہ بڑا نادم تھا کہ اپنا مقصد حاصل کرنا تو دور کی بات وہ تو پہلے ہی مرحلے میں ناکام ہو گیا تھا حالانکہ تھوڑی دیر پہلے وہ بڑے دعوے کر کے گیا تھا۔ اپنی اسی ناکامی کو دیکھتے ہوئے اس نے ساتھیوں سے کہا۔

"میرا مشورہ تو یہ ہے کہ ہم اس خیال کو ترک کر کے واپس چلے چلیں۔ یہاں تو قدم قدم پر جان جانے کا خطرہ ہے!" اس کے دوسرے دونوں ساتھی بھی اس کے حامی تھے مگر رانا میندھرا نہ مانا اس نے کہا۔

"بہتر یہ ہے کہ ہم تینوں بھی کوشش کر دیکھیں۔"

دوسرے روز ناتر آئی تو اس کے ساتھ ڈونر بھٹی گیا اور وہ بھی ناکام و نامراد واپس آ گیا۔ اسی طرح تیسرے روز سنترو ڈھاچانی گیا مگر اس کی قسمت میں بھی ناکامی لکھی ہوئی تھی۔

اپنی ناکامی کے بعد وہ تینوں رانا میندھرا کو سمجھانے لگے کہ ہم سب ناکام ہو گئے ہیں، تمہاری ناکامی بھی یقینی ہے، بہتر یہی ہے کہ تم یہ خیال چھوڑ دو، اپنے لیے مزید ندامت کا سامان پیدا کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا لیکن میندھرا نے جواب دیا۔

"تم تینوں اپنی قسمت آزما چکے ہو، اب مجھے بھی موقع دو تاکہ میں بھی اپنا مقدر آزماؤں جہاں تک ندامت کا تعلق ہے وہ تو جتنی ہونی تھی ہو چکی۔ میں بھی دیکھ لوں کہ قسمت میرا ساتھ دیتی ہے یا نہیں۔۔۔؟ اگر میں بھی ناکام ہو گیا تو افسوس نہیں ہو گا کیونکہ ہم سب ناکامی سے دوچار ہوں گے۔"

اس طرح جب چوتھے روز تاتر آئی تو رانا میندھرا اس کے ساتھ ہو لیا۔ حسب معمول تاتر آگے آگے چلنے لگی تاکہ میندھرا اس کے پیچھے پیچھے آئے لیکن اس نے اسے کاندھے سے پکڑ کے اپنے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

"باندیوں کو سرداروں کے آگے چلنا زیب نہیں دیتا۔ تمہیں میرے پیچھے پیچھے آنا چاہیے۔"

اس طرح اب رانا میندھرا تاتر کے آگے آگے چل رہا تھا۔ وہ ہر قدم سوچ سنبھل کر اٹھا رہا تھا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا، ساتھ ہی ساتھ پیچھے آتی ہوئی تاتر کو بھی کنکھیوں سے دیکھتا جا رہا تھا۔ وہ بھول بھلیاں سے نکل کر وہاں پہنچ گیا جہاں طلسمی دریا پھیلا ہوا تھا تاتر کا خیال تھا کہ وہ پانی دیکھ کر رک جائے گا مگر رانا میندھرا اس فریب میں نہ آسکا۔ وہ جاتے وقت اپنے ہاتھ میں نیزہ لے گیا تھا جب اس کے سامنے پانی کا طلسمی دریا آیا تو اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے نیزے کو بڑھا کے پانی میں ڈالا تاکہ اس کی گہرائی کا اندازہ کر سکے۔ جیسے ہی اس نے پانی میں نیزہ ڈالا اسے پتا چل گیا کہ اس پانی اور پانی کے دریا کی کوئی حقیقت نہیں ہے، یہ محض جادو کا کھیل ہے۔ وہ آگے بڑھا تو اسے ایسے لگا جیسے شیر اس پر حملہ کرنے کے لیے بھاگتے ہوئے آ رہے ہیں وہ لمحہ بھر کے لیے تو واقعی گھبرا گیا تھا لیکن پھر آگے بڑھ کے انھیں بھی نیزے سے چھوا تو پتا چلا یہ بھی محض دھوکا دینے کی خاطر ہیں۔ اس طرح وہ آگے بڑھتا ہوا محل کے دروازے پر پہنچ گیا جہاں ایک باندی اس کے استقبال کے لیے کھڑی تھی۔ اس نے

سر جھکا کے رانا مینڈھرا کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا۔

"اندھر تشریف لائیے اور پلنگ پر بیٹھیے۔ رانی جی آنے ہی والی ہیں۔"

مینڈھرا نے محل کے اندر دیکھا تو وہاں ایک ہی طرح کے سات پلنگ بچھے ہوئے تھے ساتوں پر بستر بھی بالکل ایک ہی انداز کے تھے' ان میں ذرا سا فرق بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ یہ دیکھ کہ وہ اپنے دل میں سوچنے لگا۔

"بیٹھنے کے لیے پلنگ تو ایک ہی ہونا چاہیے' پھر یہ سات پلنگ کیوں ہیں؟ یقیناً اس میں بھی کوئی فریب ہو گا۔!"

یہ سوچ کر وہ دھیرے سے آگے بڑھا اور پہلے پلنگ پر نیزہ مار کے دیکھا تو اس کی نواڑ ٹوٹ کے نیچے گر گئی اس نے آگے بڑھ کے دوسرے پلنگ پر بھی نیزہ مار کے دیکھا تو اس کی نواڑ بھی ٹوٹ کے نیچے جا گری اس طرح وہ ہر پلنگ پر نیزہ مار کے آگے بڑھ رہا تھا اور ہر پلنگ کی نواڑ ٹوٹ کر نیچے گر جاتی تھی جس کے نیچے ایک گہرا گڑھا دکھائی دیتا تھا۔ جب اس نے آخری اور ساتویں پلنگ پر نیزہ مار کے دیکھا تو اس کی نواڑ ٹوٹ کے نیچے نہ گری' وہ فوراً سمجھ گیا کہ یقیناً یہی وہ پلنگ ہے جس پر مجھے بیٹھنا چاہیے اور آگے بڑھ کے اس پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے باندی سے کہا۔

"اپنی رانی کو خبر کر دو۔۔۔۔ میں آگیا ہوں۔"

"باندی اسی وقت گئی اور تھوڑی دیر بعد واپس آ کر کہنے لگی۔"

"رانی جی نے کہا ہے' آپ اوپر کے کمرے میں آجائیں۔!"

رانا مینڈھرا باندی کے ساتھ محل کے اوپر والے کمرے میں پہنچا تو ایک بار پھر پریشان ہو گیا۔ ابھی اس کا امتحان ختم نہیں ہوا تھا۔ اس نے دیکھا تو وہاں ایک نہیں کئی مومل رانیاں موجود تھیں اور سب کی سب ایک ہی سے انداز میں' قطار میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان سب کا لباس بھی بالکل ایک جیسا تھا اور انھوں نے زیورات بھی ایک ہی طرح کے پہنے ہوئے تھے۔ ان میں اس قدر مشابہت تھی کہ کسی ایک کو الگ کرنا مشکل تھا۔ رانا مینڈھرا سوچنے لگا۔

"مومل تو ایک ہی ہوگی۔ پلنگوں کی طرح ان میں بھی کوئی راز ہے۔!"

وہ اس سوچ میں تھا کہ اچانک ایک بھنورا اڑتا ہوا آیا اور سارے چہروں پر گھومتا ہوا ایک کے بالوں پر آ کر بیٹھ گیا۔ یہ دیکھ کر میندھرا فوراً سمجھ گیا کہ یہی اصل مومل ہے۔ وہ مسکراتے ہوئے اسی طرف بڑھ گیا۔ مومل تو پہلے ہی اس کی دانائی اور ذہانت کی قائل ہو چکی تھی۔ وہ جس طرح باغ سے محل کے اندر پلنگ تک پہنچا تھا اس کا امتحان تو وہی کافی تھا اور اب جب کہ اس نے اپنی عقلمندی سے کام لیتے ہوئے مومل کو پہنچان لیا تو وہ بھی اس کی طرف بڑھ گئی اس نے قریب جا کر بڑے والہانہ انداز میں کہا۔

"اے بہادر اور دانشمند نوجوان۔ تم نے مجھے ہی نہیں میرا دل بھی جیت لیا ہے؟"..

مومل نے اسی وقت خادموں اور باندیوں کو حکم دیا اور رانا میندھرا کے لیے ایک شاندار دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ دعوت کے بعد ایک عیش و عشرت کی محفل برپا کی گئی جس میں مومل اور میندھرا' میاں بیوی کی حیثیت سے شریک تھے۔ وہ رات جوان کی شادی کی پہلی رات تھی دونوں نے ایک ساتھ گزاری' راز و نیاز کی باتیں کرتے رہے اور آئندہ زندگی کے لیے عہد و پیاں باندھتے رہے۔

دوسری صبح رانا میندھرا اپنے ساتھیوں کے پاس گیا جو پہلے ہی سے اس کا انتظار کر رہے تھے اور اس کی روداد سننے کے لیے بے تاب تھے۔ اس نے جا کر انھیں پوری کہانی سنائی اور بتایا کہ کس کس طرح اس نے بھول بھلیاں' اور پانی کا دریا پار کیا' پھر کس طرح شیروں سے بچ کر رانی مومل کے پلنگ تک پہنچا۔ اس نے مومل کو پہچاننے کا واقعہ بھی بتایا اور رات کی دعوت کے ساتھ اپنی شادی کے بارے میں بھی تفصیل بیان کی۔ اس کے ساتھیوں نے اس کی ساری داستان سنی تو انھیں اس پر رشک آنے لگا۔ وہ اس کی خوش بختی پر حیرت میں تھے اور دل ہی دل میں اس سے جل بھن بھی رہے تھے۔ خاص طور پر ہمیر سومرو کو بڑا رنج تھا کیونکہ اس کا سالا امتحان میں کامیاب ہو گیا تھا اور یہی بات اس کے لیے ندامت اور بے عزتی کا باعث تھی۔ وہ اس سے کہنے لگا۔

"ہمیں خوشی ہے، تم مومل کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہو۔ اب تو وہ تمہاری بیوی بن چکی ہے اس لیے ہمیں ملانے پر تمہیں کوئی عذر نہیں ہونا چاہیے۔ میں مومل کو دیکھنا چاہتا ہوں۔؟"

اس پر رانا مینڈھرا نے چند لمحوں تک سوچا کیونکہ اسے ڈر تھا، کہیں مومل ناراض نہ ہو جائے۔ پھر اس نے ہمیر سے کہا۔

"اگر واقعی تم مومل کو ضرور دیکھنا چاہتے ہو تو میرے ساتھ تمہیں چرواہے کے بھیس میں چلنا ہو گا۔"

"مجھے یہ شرط منظور ہے!"

اگرچہ یہ بات ہمیر سومرو کے لیے مزید بے عزتی کا سبب تھی لیکن کیا کرتا۔؟ مومل کو دیکھنے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ وہ راضی ہو گیا اور مینڈھرا اسے چرواہے کے روپ میں اپنے ساتھ لے گیا۔ محل میں جا کر جب ہمیر نے مومل کو دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ ایسی حسین و جمیل عورت اس نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ اب تو واقعی وہ مینڈھرا سے بری طرح حسد کرنے لگا تھا۔ ایک طرف تو وہ حسد میں جل رہا تھا، اوپر سے مینڈھرا اسے چرواہا بنا کر لے گیا تھا اور جب مومل نے اس کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے اس کا تعارف بھی اس طرح کرایا تھا۔

"یہ میرا چرواہا ہے میرے ساتھ آیا ہوا ہے۔"

اس تعارف سے ہمیر اور بھی جل گیا تھا مگر اس وقت مجبور تھا، کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ اس نے خود ہی مومل کو دیکھنے کے لیے یہ شرط قبول کی تھی حقیقت یہ تھی کہ اب وہ اس سے بے عزتی کا انتقام لینے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ پھر جب وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کے پاس گیا تو اس نے انھیں سارا قصہ بتایا۔ وہ شکایت کے لہجے میں کہنے لگا کہ دیکھو، میں مینڈھرا کا بہنوئی ہوں لیکن اس نے اپنی بیوی سے مجھے چرواہا کہہ کے متعارف کرایا ہے اور اس طرح پردیس میں میری بے عزتی کی۔ دوستوں نے اسے سمجھایا کہ مومل سے ملنے کا کوئی اور طریقہ

نہیں تھا اور تم اسے ضرور دیکھنا چاہتے تھے۔ اب افسوس کرنا فضول ہے لیکن ھمیر سومرو کی ناراضگی میں کمی نہ آسکی۔ وہ چند روز وہاں رہے اور پھر میندھرا سے کہنے لگے۔

"اب ہمیں واپس جانا چاہیے۔ گھر سے نکلے ہوئے کئی دن ہو گئے ہیں۔؟"

اس پر میندھرا نے جواب دیا۔

"تم لوگ جاؤ اور مجھے یہیں چھوڑ جاؤ۔ میرا وطن تو اب کاک ہے' میں یہیں اپنی مومل کے ساتھ رہوں گا۔"

"انھوں نے اسے بہت سمجھایا اور اپنے ساتھ چلنے پر اصرار کیا لیکن میندھرا نہ مانا۔ اس کا یہی کہنا تھا۔

"اب میرا مرنا جینا کاک ہی میں ہو گا۔ میں مومل کو نہیں چھوڑ سکتا۔!"

اس طرح جب ان کے سمجھانے بجھانے کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو ھمیر سومرو نے یہ کیا کہ میندھرا کو اپنے ساتھیوں کی مدد سے اونٹ پر جکڑ دیا اور زبردستی امرکوٹ شہر لے آئے جہاں پہنچتے ہی اسے قید میں ڈال دیا گیا تاکہ وہ بھاگ کر واپس کاک مومل کے پاس نہ جا سکے۔ اس طرح ھمیر سومرو اس سے اپنی بے عزتی اور شکست کا انتقام لے رہا تھا مگر میندھرا اب مومل کو کیسے چھوڑ سکتا تھا۔؟ وہ تو اس کی بیوی بن چکی تھی اور بیوی بھی ایسی تھی جو اسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ ادھر مومل پریشان تھی۔ اس نے میندھرا کو کاک شہر میں تلاش کرایا' ہر جتن کیا اور جب اسے اس بات کا علم ہوا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کاک سے چلا گیا ہے تو اس کا سارا سکھ چین برباد ہو کر رہ گیا۔ وہ میندھرا کی جدائی میں دن رات تڑپنے لگی۔ دوسری طرف میندھرا قید میں بند تھا اور مومل کے پاس پہنچنے کے لیے بے تاب تھا۔ آخر ھمیر سومرو کے دوستوں نے اسے سمجھایا کہ

"میندھرا کو اس طرح قید میں ڈالنا مناسب نہیں ہے۔ یہ تو اپنی بدنامی کو دعوت دینا ہے۔!"

یہ بات ھمیر کی سمجھ میں آئی اور اس نے میندھرا کو آزاد تو کر دیا لیکن اس پر یہ پابندی لگا دی کہ وہ کاک نہیں جا سکتا اور مومل سے نہیں مل سکتا۔ اس کے ساتھ ہی اس پر ایک

نگران مقرر کر دیا گیا تاکہ وہ اس پر نگاہ رکھے مگر میندھرا نے نگرانی کرنے والے آدمی کو کسی نہ کسی طرح لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ پھر اس نے ایک ایسا تیز رفتار اونٹ حاصل کیا جو ایک رات میں پانچ دن کے آنے جانے کا سفر طے کرتا تھا۔ وہ رات کو اس اونٹ پر سوار ہو کر کاک جا پہنچا جہاں مومل اس کے فراق میں تڑپ رہی تھی اور میندھرا کو دیکھ کر اسے نئی زندگی مل گئی۔ وہ کچھ دیر مومل کے پاس رہا اور صبح ہونے سے پہلے پہلے واپس امرکوٹ آ گیا۔ اس کے بعد اس کا یہ معمول بن گیا تھا۔ ہر رات برق رفتار اونٹ پر سوار ہو کر کاک چلا جاتا' وہاں کچھ وقت مومل کے ساتھ گزارتا اور پھر صبح ہونے سے قبل ہی لوٹ آتا۔ وہ خوش تھا کہ اس طرح وہ روزانہ رات کو مومل سے مل لیتا تھا اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی مگر یہ سلسلہ زیادہ عرصہ تک چل نہ سکا۔ ہمیر کو کسی نہ کسی طرح یہ خبر ہو گئی کہ میندھرا ہر رات تیز رفتار اونٹ پر سوار ہو کر کاک چلا جاتا ہے۔ چنانچہ اس نے اسے دوبارہ قید کر دیا اور اس کے برق رفتار اونٹ کے پاؤں میں میخیں ٹھکوا دیں۔ اس طرح ایک بار پھر سے مومل اور میندھرا جدائی کی آگ میں جلنے لگے۔

میندھرا کی بہن کو جب اس کے دوبارہ قید ہونے کا پتا چلا تو اسے بے حد دکھ ہوا۔ اس نے ایک دن موقع پا کر اپنے شوہر ہمیر سومرو سے کہا۔

''میری درخواست ہے کہ آپ مینڈھرا کو رہا کر دیں۔ وہ میرا بھائی ہے اور میں اس کی وجہ سے بہت غمگین ہوں۔''

ہمیر سومرو اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا' اس نے بیوی کی بات مان لی اور میندھرا کو رہا کر دیا لیکن اب وہ رات کو کاک نہیں جا سکتا تھا کیونکہ اس کے تیز رفتار اونٹ کے پاؤں میں میخیں ٹھکوا دی گئی تھیں۔ وہ کچھ دن تک پریشان رہا اور کوئی ترکیب سوچتا رہا۔ آخر اسے پتا چلا کہ اسی نسل کا ایک اور اونٹ بھی ہے جو اسی کی مانند برق رفتار ہے۔ اگر وہ مل جائے تو وہ راتوں رات کاک جا کے مومل سے مل کر واپس آ سکتا ہے۔ اس نے کسی نہ کسی طرح وہ اونٹ حاصل کر لیا تھا اور پھر مومل سے ملنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ دوسری جانب اس

دوران موول نے غم میں رو رو کر اپنا برا حال کر لیا تھا۔ اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا اور ہر وقت روتی رہتی تھی۔ اس کے دکھ میں اس کی بہن سومل برابر کی شریک تھی لیکن وہ بے بس تھی' کچھ نہ کر سکتی تھی۔ وہ طرح طرح سے اس کا دل بہلاتی اور تسلیاں دیتی کہ

''ایک نہ ایک روز مینڈھرا ضرور آئے گا۔ ہو سکتا ہے وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہو۔؟''

موول کا دل بہلانے کی خاطر سومل کو ایک تجویز سوجھی اور اس نے یہ کیا کہ روزانہ مردانہ لباس پہن کر اس کے ساتھ بستر پر لیٹ جاتی اور دونوں بہنیں ایک ہی پلنگ پر سو جاتیں۔ سومل کا خیال تھا' اس طرح موول رات کو سو سکے گی اور واقعی اس کی یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی۔ موول اس کے ساتھ سونے لگی اور اس طرح وہ دونوں رات ایک ہی بستر پر گزارتی تھیں۔

ادھر یہ ہوا کہ ایک رات رانا مینڈھرا موقع پا کر تیز رفتار اونٹ پر سوار ہوا اور دوڑاتا ہوا کاک پہنچ گیا۔ اس کا خیال تھا جس طرح میں موول سے ملنے کے لیے بے قرار ہوں اسی طرح وہ بھی بے تاب ہو گی اور اتنے دنوں کے بعد مجھے دیکھ کر مجھ سے لپٹ جائے گی لیکن جب وہ محل میں پہنچا' تو حیران و پریشان رہ گیا۔ اس نے دیکھا' موول کے ساتھ کوئی مرد سویا ہوا تھا۔ یہ بات تو اس کے ذہن میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ اس کی چھوٹی بہن سومل مردانہ لباس میں اس کے ساتھ سو سکتی ہے۔ وہ تو یہی سوچ کر ٹھٹھک گیا کہ موول کے کسی دوسرے مرد کے ساتھ بھی تعلقات ہیں اور وہ اس کے ساتھ سوئی ہوئی ہے۔ وہ ایسا بدگمان ہوا کہ وہاں اپنا عصا چھوڑ کے خود الٹے پاؤں لوٹ آیا۔ وہ اس طرح آیا تھا کہ پھر پلٹ کر کاک کا رخ نہ کیا۔

صبح جب موول بیدار ہوئی تو اپنے کمرے میں مینڈھرا کا عصا دیکھ کر سمجھ گئی' یقیناً رات کو مینڈھرا آیا ہو گا اور میرے ساتھ سومل کو مردانہ لباس میں سوئے ہوئے دیکھ کر واپس چلا گیا ہو گا۔ اسے انتہائی دکھ ہوا مگر اب افسوس کرنا بے سود تھا۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا اور مینڈھرا نے اس سے بدگمان ہو کر کاک نہ آنے کا عہد کر لیا تھا۔ اس کے نزدیک موول بے وفا تھی جسے اس نے اپنی آنکھوں سے کسی دوسرے مرد کے ساتھ سویا ہوا دیکھا تھا۔ موول نے دو

چار روز تک اس کی طرف امرکوٹ میں قاصد بھیجا لیکن سب کوششیں بیکار گئیں۔ آخر اس نے ارادہ کیا کہ خود امرکوٹ جائے اور مینڈھرا کی غلط فہمی دور کرے۔ اس نے ریاست کے راج پاٹ کا سارا کاروبار سومل کے سپرد کرتے ہوئے کہا۔

''بہن! تم گھبرانا نہیں۔ میں بہت جلد مینڈھرا کو ساتھ لے کر آجاؤں گی۔''

اس نے ضروری تیاری کی اور امرکوٹ کی جانب روانہ ہو گئی وہاں پہنچ کر اس نے مینڈھرا کے محل کے بالکل سامنے ایک جھونپڑی بنالی اور اس خیال سے اس میں رہنے لگی کہ جب مینڈھرا اپنے محل سے باہر آئے گا تو اس سے مل کر پوری بات بتائے گی اور اس کی غلط فہمی دور کرے گی لیکن مینڈھرا کا دل کچھ اس طرح ٹوٹا تھا' اس نے محل سے نکلنا تک ترک کر دیا تھا وہ ہر وقت اداس اور مایوس محل کے اندر ہی بند پڑا رہتا۔ اسی طرح عرصہ گزر گیا' اور مومل اس کے ہجر و فراق میں جلتی جھونپڑی میں تڑپتی رہی۔ یہاں تک کہ اس نے مینڈھرا کے محل کے سامنے سسک سسک کر جان دے دی۔ اس کی موت کے بعد مینڈھرا کو پتا چلا اور اسے اصل حقیقت سے آگاہی ہوئی تو وہ جیسے پاگل سا ہو گیا۔ سوچنے لگا۔

''محض میری بدگمانی کی وجہ سے مومل کی جان گئی اس نے میری بدگمانی کے سبب کس قدر دکھ برداشت کیے۔۔ کاش! میں کاک سے پلٹتے وقت اصل بات معلوم کر لیتا۔!''

اسے اپنی غلطی اور غلط فہمی کا اتنا زیادہ صدمہ ہوا کہ اسی وقت ایک لمبی آہ بھر کے نیچے گر پڑا اور اس کے ساتھ ہی اس کی روح جسم کا ساتھ چھوڑ گئی۔ اس طرح ایک عرصہ سے بچھڑے ہوئے مومل اور رانا مینڈھرا ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے مل گئے۔

سرحد

آدم خان درخانئ

آدم درخانئ صوبہ سرحد کی مقبول ترین داستانوں میں سے ہے اور اس کا تعلق اس علاقے کی حسین ترین وادی سوات سے ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے اس کا تعلق ہرنائی پشین کے قریب علاقہ کاکڑستان سے بتایا ہے۔ بلند و بالا پہاڑیوں اور دور دور تک پھیلے ہوئے دلکش سبزہ زاروں میں گھری ہوئی شفاف پانیوں کی اس وادی کو قدرت نے بے پناہ حسن سے نوازا ہے اور جس طرح سوات کے کونے کونے میں فطرت کا حسن بکھرا ہوا ہے اسی طرح آدم خان جسمانی خوبصورتی اور جوانی میں اپنی مثال آپ تھا۔ وہ اسی وادی کے ایک گاؤں "بازدرہ بالا" کا رہنے والا تھا، جس کے رباب سے نکلے ہوئے دلکش نغمے ہر وقت ہری بھری چراگاہوں اور پہاڑوں میں گونجتے رہتے تھے۔ یہ حسین نوجوان حسن خان ملک کا اکلوتا بیٹا تھا جو اپنے قبیلے کا ایک ممتاز اور دولت مند شخص تھا۔ آدم خان رباب نوازی میں اس قدر ماہر تھا کہ جب وہ اپنے رباب کے تار چھیڑتا تو اس میں سے قدرتی چشموں کے پانیوں کے طرح نغمے پھوٹ نکلتے جن کی سریلی آواز سن کر اڑتے ہوئے پنچھی بھی مست ہو کر ٹھہر جاتے تھے اور صنوبر کے درخت سرشاری سے جھومنے لگتے تھے۔ نغموں میں گھلے ہوئے اس کے ٹپوں کے بول سرسبز

شاداب وادیوں کے حسن کو اور بھی زیادہ حسین بناتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آدم خان اپنے گاؤں کی ہر نوجوان لڑکی کی تمنا بن گیا تھا اور اس کے نغمے ان کے خوابوں میں رس گھولتے تھے۔ لوگ حسن خان ملک کی قسمت پر رشک کرتے تھے کہ اللہ نے اسے ایسا حسین بیٹا عطا کیا ہے جس کا چرچا اپنے گاؤں سے باہر بھی ہونے لگا تھا۔ اس کا باپ بھی اس پر فخر کرتے ہوئے کہتا تھا۔

"آدم خان میرا بیٹا ہے۔"

اور لوگ بھی اسے رشک کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ وہ جب آپس میں باتیں کرتے تو کہتے۔

"حسن خان ملک کس قدر خوش قسمت ہے کہ اس کا بیٹا قبیلے کی آن اور شان ہے"۔

ہر ایک کا یہی خیال تھا کہ۔

"آدم خان آگے چل کر اپنے قبیلے کا نام روشن کرے گا اور اس پر اس کے باپ ہی کو نہیں پورے قبیلے کے ہر فرد کو فخر ہو گا۔"

آدم خان چونکہ امیر سردار کا بیٹا تھا اس لیے اسے کسی بات کی فکر نہ تھی۔ اسے تو بس ایک ہی کام تھا کہ اپنا رباب لے کر وادیوں اور پہاڑیوں میں نکل جاتا اور کسی چشمے کے کنارے بیٹھ کر دلوں میں اتر جانے والے سریلے نغمے چھیڑ دیتا۔ اس کے یہی نغمے گاؤں کی ہر نوجوان لڑکی کے دل کی دھڑکن بن گئے تھے لیکن آدم خان سب سے بے نیاز اپنی دھن میں مست رہتا تھا۔ ماں باپ اگرچہ اپنے بیٹے پر نازاں تھے مگر اب وہ جوان ہو چکا تھا اور انھیں اس کی وہی فکر ہونے لگی تھی جو ہر ماں باپ کو اپنی جوان اولاد کے بارے میں ہوتی ہے۔ وہ آپس میں مشورہ کرتے ہوئے کہتے۔

"اب آدم خان کی شادی کر دینی چاہیے۔ ماشاء اللہ جوان ہو چکا ہے۔ آخر کب تک اسی طرح رباب بجاتا گھومتا رہے گا۔"

ان کی خواہش تھی کہ وہ اس کے لیے' اسی طرح کی حسین لڑکی بیاہ کر لائیں جو گھر کی رونقوں کو دوبالا کرنے کے ساتھ ساتھ خود آدم خان کے دل میں بھی روشنی بکھیر دے اور پھر

وہ وقت بھی آئے جب وہ اپنے پوتوں پوتیوں سے کھیلیں۔ یہی کچھ سوچتے ہوئے ایک دن ماں اور باپ نے اسے اپنے پاس بٹھا کر بڑے پیار سے کہا۔

"بیٹا! اب تم جوان ہو اور ہمارے خاندان کی نسل تمہی سے چلے گی۔ ہم چاہتے ہیں کہ اب تمہاری شادی کر دی جائے"۔

"مگر آدم خان نے شادی سے انکار کر دیا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ اپنے تصور میں کسی خیالی محبوبہ کو بسائے ہوئے ہے جس کے لیے اس کے رباب سے نغمے نکلتے رہتے تھے۔ اس کے نغموں کے درد اور سوز کے پیچھے کوئی ان دیکھا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ اس کے انکار سے ماں اور باپ ذرا پریشان تو ضرور ہوئے تھے لیکن پھر انہوں نے سوچا۔

"چلو' آج نہیں تو کل' خود ہی راضی ہو جائے گا۔ آخر ایک نہ ایک دن اسے شادی تو کرنی ہی ہے۔"

اور یہی کچھ سوچ کر انہوں نے شادی پر زیادہ زور نہ دیا۔ ادھر آدم خان بدستور اپنی دھن میں مست رباب نوازی میں کھویا رہا اور اپنی اس خیالی محبوبہ کو دل میں بسائے نغمے بکھیرتا رہا جس کو نہ اس نے کبھی دیکھا تھا اور نہ ہی جانتا تھا کہ وہ کون ہے' کہاں ہے' اور کیسی ہے۔؟

ایک روز کا ذکر ہے' آدم خان اپنے گھر میں خیالات میں گم بیٹھا تھا کہ اچانک اس نے سنا تو گھر میں کوئی راز کی بات ہو رہی تھی۔ اس نے چوکنا ہو کر کان لگا کر سنا تو ان کے گھر میں قریب کے گاؤں "بازدرہ پایاں" کی ایک بڑھیا آئی ہوئی تھی جو اس وقت اپنے گاؤں کے ایک سردار طاؤس خان کی اکلوتی بیٹی درخانئ کے حسن و جوانی کی تصویر کھینچ رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"ملک طاؤس خان کی بیٹی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ تم لوگ دیکھو تو دیکھتے ہی رہ جاؤ گے۔ میں نے اس قدر حسین و جمیل لڑکی پورے قبیلے میں نہیں دیکھی۔"

اس سے پہلے بھی آدم خان کئی ایک لڑکیوں کے بارے میں اس قسم کی باتیں سن چکا تھا

لیکن نہ جانے کیوں درخانئی کا نام اور اس کے بارے میں بڑھیا کی باتیں سن کر وہ چونک گیا۔ اسے یوں لگا جیسے یہی اس کے خیالوں میں آنے والی محبوبہ ہے' یہی وہ چہرہ ہے جس کے لیے اس کے نغمے بے تاب رہتے ہیں اور اسی سے اس کے ٹپوں میں سرجاگتے ہیں۔ اس کا دل اسے یقین دلا رہا تھا کہ یہی وہ اس کی خیالی محبوبہ ہے جس کی اسے تلاش ہے۔ اس نے بڑھیا کو اپنے پاس بلا کر پوچھا۔

"کیا اس کے بائیں رخسار پر تل ہے۔؟"

"ہاں۔ اس کے بائیں رخسار پر تل ہے۔"

"کیا اس کی پیشانی پر زخم کا ایک ہلکا سا نشان ہے۔؟"

"بالکل ہے!"

بڑھیا حیران تھی کہ یہ سب کچھ آدم خان کو کیسے معلوم ہوا۔؟ وہ اس سے کہنے لگی۔

"بیٹا! اس کا مطلب تو یہ ہے کہ تم نے اسے دیکھا ہے۔؟"

جواب میں اس نے بتایا۔

"نہیں اماں۔۔ میں نے آج تک اسے نہیں دیکھا۔۔ پہلی بار تم سے اس کا ذکر سنا ہے۔"

پھر اس نے خود ہی اسے بتایا۔

"دراصل یہی میرا خواب ہے اور یہی میرے خیالوں میں اس کا ناک نقشہ ہے۔ یہی وہ چہرہ ہے جس کی محبت کے لیے میرے رباب میں نغمے تڑپتے ہیں۔"

اس پر بڑھیا نے بڑے افسوس کے لہجے میں کہا۔

" تمھیں شاید یہ معلوم نہیں کہ درخانئی کی منگنی پایاؤ سے ہو چکی ہے۔"

جب آدم خان نے بڑھیا سے یہ سنا تو اسے ایسے لگا جیسے کسی نے اس کے سینے میں خنجر گھونپ دیا ہو۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ درخانئی کی منگنی کا سن کر اس کا خیال چھوڑ دیتا لیکن وہ اس کے لیے اور بھی دیوانہ ہو گیا۔ اس نے اپنی ان دیکھی اور خیالی محبوبہ کے خدوخال کے بارے میں بڑھیا سے تصدیق کر لی تھی۔ اس کا خیال حقیقت بن گیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو

رہا تھا جیسے وہ اسی کو تلاش کر رہا تھا۔ اس کے رباب میں اور بھی درد بھر گیا اور اس کے نغموں اور ٹپوں میں سوز کی لہریں اور بھی گہری ہو گئیں۔

کہتے ہیں عشق کی آگ ایک طرف نہیں جلتی' اس کی تپش دونوں طرف ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بڑھیا واپس اپنے گاؤں گئی تو اس نے درخانئی سے سارے حالات بیان کیے اور بتایا کہ آدم خان **تمھارے** عشق میں دیوانہ ہوا جا رہا ہے اور **تمھیں** دیکھے بغیر اسے **تمھارے** چہرے کے خدوخال تک کا علم ہے۔ **تمھارے** رخسار کے تل اور پیشانی پر زخم کے داغ کے بارے میں بھی اسے معلوم ہے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔؟"

جب درخانئی نے حیرت سے یہ کہا تو بڑھیا نے وہ سب کچھ بیان کر دیا جو اس کے ساتھ پیش آیا تھا۔ یہ سب کچھ سننا تھا کہ درخانئی کے دل میں عشق کی سلگتی ہوئی چنگاری ایک دم شعلے کی طرح بھڑک اٹھی۔ وہ آدم خان کے پرسوز نغموں کے بارے میں تو پہلے ہی بہت کچھ سن چکی تھی لیکن اسے اس بات کا علم نہ تھا کہ اس کے خیالوں میں بسنے والی ان دیکھی محبوبہ وہ خود ہے۔ اس وقت جب بڑھیا نے اسے آدم خان کی محبت کے بارے میں بتایا تو وہ بے تاب ہو گئی۔ اس نے بڑھیا سے اپنا خواب بیان کرتے ہوئے پوچھا۔

"اماں! میں نے آدم خان کو خواب میں دیکھا ہے' کیا وہ ایسا ہے۔۔؟ اس کا چہرہ ایسا ہے۔۔۔؟ کیا وہ اتنا خوبصورت ہے۔؟ کیا وہ اس طرح بات کرتا ہے۔؟"

اس کے ساتھ ہی اس نے آدم خان کی شکل و صورت اور اس کے انداز کے بارے میں بتایا تو بڑھیا نے اس کے ہر اندازے کی تصدیق کی کہ واقعی آدم خان ایسا ہی ہے جیسا تم نے بیان کیا ہے۔ اس تصدیق کے بعد تو درخانئی کی حالت بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اتنی دوری کے باوجود اس کے کانوں میں آدم خان کے سریلے نغمے رس گھولنے لگے تھے اور اس کے لبوں سے نکلے ہوئے ٹپوں کے بول اس کے دل میں گونج رہے تھے۔ وہ خیال ہی خیال میں اسے دیکھ رہی تھی اور اس کا خوبصورت چہرہ اس کی بڑی بڑی خمار آلود آنکھوں میں تصویر

بن گیا تھا، جس نے اس کی جوانی کی نیندیں اڑا دی تھیں۔ وہ راتوں کی تنہائی میں اس سے گھنٹوں باتیں کرتی۔ جیسے وہ ایک دوسرے کے قریب ہوں، جیسے وہ ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں۔

ایک روز آدم خان بیٹھا اپنے نغموں کی سروں میں ٹپوں کے ہار پرو رہا تھا کہ "بازدرۂ پایاں" کی وہی بڑھیا آئی جس نے اسے اس کی ان دیکھی محبوبہ درخانئ کی خبر دی تھی۔ اس نے آدم خان کو بتایا کہ درخانئ بھی تمھاری نادیدہ دیوانی ہو گئی ہے اور ہر وقت تمھاری یاد میں کھوئی رہتی ہے۔ اس نے پھولوں کا ایک گلدستہ پیش کرتے ہوئے کہا۔

"یہ اس کی محبت کا پیغام ہے جو تمھارے لیے بھیجا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے یہ خبر بھی سنائی کہ۔

"عنقریب درخانئ ایک شادی میں شرکت کرنے کے لیے تمھارے گاؤں آئے گی۔"

یہ خبر سن کر آدم خان اور بھی بے تاب ہو گیا۔ اب وہ اپنے خیالوں میں بسنے والی محبوبہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے گا۔ اپنے نغموں کی ملکہ کا دیدار کر سکے گا۔ یہی کچھ سوچ سوچ کر اس کی شیفتگی میں ہر لحظہ اضافہ ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ گاؤں میں ہونے والی شادی کا دن آ گیا۔ خوشی کی اس تقریب میں آدم خان کو بھی اپنی رباب نوازی کا جادو جگانا تھا، وہ بھی محفل میں گیا اور جب اس نے درخانئ کو دیکھا تو اسے ہو بہو ایسا ہی پایا جیسے اس کے تصور میں اس کی تصویر تھی۔ وہی حسن و شباب اور وہی دل میں کھب جانے والے خدوخال۔ اس کے سریلے نغمے تو پہلے ہی سننے والوں کے جذبات و احساسات میں ہلچل مچا دیتے تھے لیکن آج تو اس کا عالم ہی اور تھا جب اس نے اپنے رباب کے تاروں کو چھیڑا تو ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ سوز و درد میں بھرا ہوا تھا۔ اور پھر جب اس نے اپنی درد بھری آواز میں ٹپوں کا الاپ شروع کیا تو سننے والے بے خود سے ہو گئے۔ وہ سوچنے لگے۔

"آج آدم خان کے نغموں میں اس قدر درد کہاں سے آ گیا۔؟"

انھیں کیا معلوم تھا کہ یہ سارا سوز، یہ سارا درد درخانئ کی محبت کا اعجاز تھا جسے اس نے

آج پہلی بار اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ مدہوش ہوا اپنے نغمے بکھیر رہا تھا۔ اس کے نغموں کا ایک ایک سر اور ٹپوں کا ایک ایک لفظ لوگوں کے کانوں میں رس گھول رہا تھا اور درخانئی کے دل میں اتر رہا تھا۔ وہ دونوں خود بھی ایک ہی نغمے کے سر تھے' ایک ہی ٹپے کے بول تھے۔

شادی کی تقریب ختم ہو گئی' تمام مہمان بھی ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے اور درخانئی بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ اپنے گاؤں چلی گئی لیکن آدم خان کو ایسے محسوس ہوا جیسے جانے والے ساری خوشیاں اپنے ساتھ لے گئے ہیں اور اس کے لیے صرف ہجرو فراق کا دکھ درد باقی رہ گیا ہے۔ یوں تو وہ پہلے بھی درخانئی کی محبت کی آگ میں جل رہا تھا مگر اب اسے دیکھ لینے کے بعد تو اس کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ چند ہی روز میں جدائی کے غم میں اندر ہی اندر گھلتا چلا گیا۔ گھر والوں نے سمجھا شاید اسے کوئی بیماری لگ گئی ہے لیکن اس کی یہ بیماری بڑی انوکھی تھی جس کا علاج کسی وید حکیم کے پاس نہیں تھا' اس کا علاج تو صرف درخانئی کے پاس تھا اور اس تک پہنچنا اس کے بس میں نہ تھا۔ وہ نہ تو اسے اپنے پاس بلا سکتا تھا اور نہ ہی خود اس تک پہنچ سکتا تھا۔ جب اس کی حالت روز بروز بگڑنے لگی تو آدم خان کے دو رازدار دوستوں مہرو اور بالو نے آپس میں مشورہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہمیں اپنے دوست کے لیے کچھ کرنا چاہیے' ورنہ یہ تو واقعی پاگل ہو جائے گا!"

انھوں نے آپس میں ایک منصوبہ بنایا اور ایک رات آدم خان کو اندھیروں کی چادر میں چھپا کر اسے اس کے محبوب کے پاس پہنچا دیا۔ آگے درخانئی کو بھی بڑھیا نے اس کی آمد کی خبر کر دی تھی اور وہ بھی اس سے ملنے کے لیے تڑپ رہی تھی۔ اس نے جب یہ سنا کہ آدم خان اس سے ملنے کے لیے آ رہا ہے تو وہ بھی کسی نہ کسی طرح مقررہ جگہ پر پہنچ گئی تھی اس طرح دونوں محبت کے مارے ملے اور اپنے گلوں شکووں سے ہجرو فراق کا غم دور کرنے لگے۔

اگر آدم خان کے بس میں ہوتا تو وہ درخانئی کو اپنے رباب کے تاروں میں نغموں کی طرح چھپا لیتا اور اگر درخانئی کے اختیار میں ہوتا تو وہ اسے اپنی آنکھوں میں ان دیکھے خوابوں کی مانند

چھپا لیتی۔ اب دونوں سے ایک دوسرے کی جدائی برداشت نہ ہوتی تھی لیکن ان رکاوٹوں اور مشکلوں کا احساس بھی تھا جو ان کی راہ میں قدم قدم پر موجود تھیں۔

آدم خان نے کہا۔

" تمھاری تو منگنی ہو چکی ہے اور تم دوسرے کی ہو جاؤ گی۔۔۔ کیا میرے نغمے ہمیشہ کے لیے دم توڑ دیں گے۔۔۔؟"

جواب میں درخانئ بولی۔

"تم شاید بھول گئے ہو کہ تمھارے پاس رباب کے ساتھ بندوق بھی تو ہے جو تمھاری جرأت اور ہمت کا امتحان لے سکتی ہے۔۔۔ ہم دونوں ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہیں۔۔۔ رباب نہیں تو بندوق!"

ان کی ملاقات تو ہو گئی تھی مگر دونوں ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ رات کے اندھیرے میں ملے تھے اور رات کے اسی اندھیرے میں انھیں بچھڑ جانا تھا۔ ابھی صبح کے آثار پیدا نہیں ہوئے تھے کہ دونوں آنسو بھری آنکھیں لیے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

پہلے تو ایک آدم خان ہی کی حالت غیر ہو رہی تھی لیکن اس ملاقات کے بعد عشق کی آگ درخانئ کے دل میں کہیں زیادہ بھڑک اٹھی تھی۔ وہ بیمار ہو گئی اور چارپائی کی ہو کر رہ گئی۔ اسے اس خیال سے خوشی بھی تھی کہ ہو سکتا ہے اس طرح گھر والے اس کی شادی کا خیال چھوڑ دیں یا کچھ عرصہ کے لیے ملتوی کر دیں مگر اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ خاندان کی عمر رسیدہ خواتین کا کہنا تھا کہ شادی سے درخانئ کے صحت یاب ہو جانے کی توقع زیادہ ہے اس لیے جس قدر جلد ہو سکے اس کی شادی کر دینی چاہیے۔ اس نے بہتیرا بیماری کا بہانہ کیا، منت سماجت کی اور ماں کو سمجھایا لیکن اس کی کسی نے ایک نہ سنی اور چند روز بعد ڈولی میں ڈال کر اسے سسرال کی طرف رخصت کر دیا گیا۔ جب اسے باجوں گاجوں کے شور میں رخصت کیا جا رہا تھا تو ہر شخص خوشیاں منا رہا تھا مگر وہ ڈولی میں اس طرح پڑی تھی جیسے اس کا جنازہ لے جایا

جا رہا ہو۔

ماں باپ کے گھر میں تو درخانئ عشق کی بیمار تھی لیکن سسرال میں آ کر وہ واقعی بیمار ہو گئی اور بیماری بھی ایسی لگی جو روز بروز شدید ہوتی چلی گئی۔ یہ دیکھ کر اس کے سسرال والے بڑے پریشان ہوئے اور اس کے علاج کے لیے نئے نئے وید حکیم بلانے لگے مگر کسی کی سمجھ میں اس کی بیماری نہ آ سکی۔ جوں جوں اس کا علاج کیا جا رہا تھا' توں توں اس کی بیماری میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کے سسرال والوں کی پریشانی بھی بڑھ رہی تھی۔ انھوں نے اچھے سے اچھے وید حکیم بلائے' جس کسی کے بارے میں بتایا گیا اسے لے کر آئے لیکن سب بے سود ثابت ہو رہا تھا۔ اس طرح جب انھوں نے ہر تدبیر کر دیکھی اور اس کی بیماری میں کوئی افاقہ نہ ہو سکا تو آپس میں مشورہ کر کے درخانئ سے کہنے لگے۔

"بہتر یہی ہے کہ تمھیں تمھارے ماں باپ کے گھر بھیج دیا جائے' ہو سکتا ہے وہاں کی آب و ہوا میں تم صحت مند ہو جاؤ!"

اور پھر انھوں نے درخانئ کو اس کے ماں باپ کے گھر روانہ کر دیا۔

ادھر آدم خان تو درخانئ کی شادی اور اس کے سسرال چلے جانے ہی سے پریشان ہو رہا تھا' اوپر سے جب اس نے اس کی شدید بیماری کے بارے میں سنا تو وہ اور بھی زیادہ پریشان ہو گیا۔ پھر جب اسے اس بات کا علم ہوا کہ سسرال والوں نے اس کی بیماری سے مایوس ہو کر اسے واپس میکے بھیج دیا ہے جہاں وہ چند دنوں کی مہمان نظر آتی ہے تو اس کے کرب و اضطراب کی حد نہ رہی۔ اب تو وہ بالکل پاگل سا ہو گیا تھا اور اسے کسی بات کا ہوش تک نہ تھا۔ بیٹے کی یہ حالت دیکھ دیکھ کر اس کی ماں بیچاری بے حال ہوئی جا رہی تھی اور اس کی آنکھیں دن رات آنسوؤں سے بھیگی رہتی تھیں۔ اس کا باپ حسن خان ملک اگرچہ بڑے حوصلے کا آدمی تھا مگر بیٹے کی یہ حالت اس سے بھی دیکھی نہ جاتی تھی۔ وہ اس کی خوشیوں کی خاطر بڑے سے بڑا قدم اٹھانے کے لیے تیار تھا۔ اس کا ایک قریبی دوست تھا جس کا نام میرمائی تھا اس نے اس سے مشورہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"میرمائی! تم میرے ہمدرد اور خاص دوست ہو۔ تمھیں بھی اس بات کا علم ہے کہ آدم خان اب سمجھنے سمجھانے کی حد سے گزر چکا ہے اور اس کی یہ حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔۔۔ تم ہی کوئی مشورہ دو کہ کیا کریں۔؟"

اس پر میرمائی نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا۔ "میری رائے تو یہ ہے کہ ہمیں درخانئ کو زبردستی حاصل کرلینا چاہیے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے!"

حسن خان ملک نے بھی اس کی رائے سے اتفاق کیا پھر انھوں نے اپنے چند مسلح آدمی ساتھ لیے بڑی رازداری سے گاؤں "بازدرہ پایاں" گئے اور وہاں جا کر درخانئ کے باپ طاؤس خان کے گھر پر حملہ کر دیا۔ طاؤس خان اس اچانک حملے سے بے خبر تھا' وہ اور اس کے ساتھی گھبرا گئے لیکن پھر بھی انھوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا تاہم چونکہ وہ پہلے سے تیار نہ تھے اس لیے اس لڑائی میں ان کا جانی نقصان بہت ہوا۔ اس طرح حسن خان اور اس کے ساتھیوں نے اس کشت و خون کے بعد کامیابی حاصل کرلی اور وہ درخانئ کو زبردستی اٹھا کر اپنے ساتھ لے آئے۔ درخانئ کے آنے کی خبر سن کر آدم خان کے جسم میں نئے سرے سے زندگی دوڑ گئی۔ اس کی اداسیاں ختم ہو گئیں اور چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ اس کے رباب میں مرجانے والے نغمے پھر سے زندہ ہو گئے اور اس کے لبوں پر ٹپوں کا الاپ ناچنے لگا۔ ایک آدم خان ہی کو نئی زندگی نہیں ملی تھی بلکہ اس کے ساتھ درخانئ بھی پھر سے زندہ ہو گئی تھی۔ اس کی بیماری ختم ہو رہی تھی اور اس کے چہرے پر سرخیاں نمودار ہو گئی تھیں۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی محبت کو منزل مل گئی ہے۔ اسے اس کا آدم خان مل گیا ہے۔ اب وہ اس کے پاس بیٹھ کر اس کے سریلے نغمے سنا کرے گی اور اس کے رس بھرے نغموں کے ساتھ ساتھ درخانئ کے دلکش قہقہے بھی وادیوں میں گونجا کریں گے۔ یہی کچھ سوچ کر اس کے جسم میں نئی زندگی کی لہر دوڑنے لگی تھی۔

اس طرف تو یہ ہو رہا تھا اور دوسری جانب قسمت ان پر ہنس رہی تھی آنے والا وقت ان کے خلاف کونسا جال بن رہا تھا؟ آدم خان اور درخانئ اس سے بالکل بے خبر تھے۔ طاؤس

خان شکست کھانے کے بعد غصے اور انتقام میں تلملا رہا تھا۔ حسن خان ملک اور اس کے ساتھیوں نے ان کے سارے قبیلے کی عزت خاک میں ملا دی تھی اور اب وہ سب اپنا انتقام لینے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ انھوں نے یہ تو جان لیا تھا کہ جنگ وجدل اور زبردستی درخانئ کو واپس لانا ان کے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن ہے اس لیے وہ کوئی دوسری چال چلنے کا سوچ رہے تھے۔ طاؤس خان کہنے لگا۔

"حسن خان ملک پر فتح حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے دوست میرمائی کو اپنے جال میں پھنسایا جائے۔ اگر ہم اسے اپنے فریب میں گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو حسن خان ملک کو زیر کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہے گی۔"

اگرچہ میرمائی کوئی تنگ دست یا غریب آدمی نہیں تھا لیکن پھر بھی وہ دولت کے لالچ میں آگیا اور اس نے اپنے سب سے اچھے اور قریبی دوست حسن خان ملک کو دھوکا دے کر درخانئ کو ایک بار پھر واپس طاؤس خان کے پاس پہنچانے کا بندوبست کر دیا۔ اس طرح درخانئ جو اپنی نئی زندگی کے لیے ابھی خواب ہی بن رہی تھی ایک بار پھر سے اپنے باپ کی قید میں پہنچ گئی۔ اس کی صحت جو سنبھلنے لگی تھی پھر سے بیماری کی گرفت میں آگئی اور وہ کمزور سے کمزور تر ہونے لگی۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ اپنی زندگی ہی سے مایوس ہوتی جا رہی تھی۔ کہنے کو تو وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں تھی لیکن وہ گھر اس کے لیے کسی قید خانے سے کم نہ تھا۔ وہ دن بھر بیٹھی آدم خان کی یاد میں آنسو بہاتی اور اپنی بدقسمتی پر آہیں بھرتی رہتی تھی۔ ادھر آدم خان کی حالت بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی۔ اس کی محبت کے رباب کے تار ٹوٹ گئے تھے اور اس کے سریلے نغموں نے دم توڑ دیا تھا۔ اسے تو کسی بات کا ہوش تک نہ رہا تھا اور ماں باپ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتے اور چھپ چھپ کر آنسو بہاتے تھے۔ اس طرح سب اپنی اپنی جگہ مایوس تھے لیکن اس وقت کوئی پر امید تھا تو وہ آدم خان کے دو قریبی دوست میرو اور بالو تھے۔ انھیں امید ہی نہیں بلکہ یقین تھا کہ وہ آدم خان کے رباب کے ٹوٹ ہوئے تار جوڑ کر ان میں پھر سے نغمے بھر دیں گے۔ انھیں آدم خان کی زندگی اپنے سے زیادہ

عزیز تھی۔ انھوں نے آپس میں بیٹھ کر منصوبہ بنایا اور آدم خان کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔
"آدم خان! جی مت ہارو۔۔۔ درخانئ تمھاری ہے اور تمھاری ہی رہے گی۔۔۔ ہم اسے ضرور واپس لائیں گے۔"

انھوں نے آدم خان کو بھی اپنا منصوبہ بتایا اور تینوں نے فقیروں ملنگوں کا بہروپ بھرا اور چپکے سے اپنے گاؤں سے نکل کر درخانئ کے گاؤں کی جانب روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر گاؤں سے باہر شہید مزار پر دھونی رما کر بیٹھ گئے اور فقیروں کی طرح الکھ کی صدائیں لگانے لگے۔ آنے جانے والوں نے جب تین فقیروں کو دھونی مارے بیٹھے دیکھا تو ایک دوسرے کو بتانے لگے۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ خبر گاؤں بھر میں پھیل گئی۔ لوگ ایک دوسرے سے کہنے لگے۔

"یقیناً یہ کوئی پہنچے ہوئے درویش ہیں جنھوں نے شہید مزار پر ڈیرے ڈالے ہیں۔ دنیا کو تیاگنے والے اللہ لوگ معلوم ہوتے ہیں۔"

اس خبر کا پھیلنا تھا کہ جوق در جوق لوگ ان کے پاس آنے لگے اور اپنی حاجتوں کے لیے دعائیں کرانے لگے اور ساتھ ہی ساتھ تعویز گنڈے بھی حاصل کرنے لگے۔ آدم خان، میرو اور بالو درویشوں کے روپ میں لوگوں کے حق میں دعائیں کرنے لگے۔ کرنا خدا کا دیکھیے کہ بعض لوگوں کی حاجتیں پوری بھی ہونے لگیں جس سے ان کی فقیری کے چرچے اور بھی پھیلنے لگے۔ لوگ کھانے لانے لگے، نذر نیاز پیش کرنے لگے اور چڑھاوے چڑھنے لگے۔ ان کے عقیدت مندوں میں وہ بڑھیا بھی شامل تھی جس نے پہلی بار آدم خان سے درخانئ کا ذکر کیا تھا اور بعد میں انھیں ملوایا تھا۔ اگرچہ وہ ان کی عقیدت میں وہاں نہیں آتی تھی بلکہ وہ ان کی رازدار تھی۔ ایک روز اس نے آدم خان کے کان میں کہا۔
"گھبراؤ نہیں، میں تمھیں درخانئ کے گھر بلواؤں گی مگر تمھیں بڑا محتاط رہنا ہو گا۔ اگر تمھارا راز کھل گیا تو بہت برا ہو گا۔"
وہ طاؤس خان کے پاس گئی اور اس سے کہنے لگی۔

"طاؤس خان! تم نے بھی سنا ہو گا' ہمارے گاؤں میں چند خدا رسیدہ فقیر آئے ہیں اور شہید مزار پر آ کر ٹھہرے ہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ درویش بہت پہنچے ہوئے ہیں۔ جس کے حق میں دعا کرتے ہیں اس کی مراد پوری ہو جاتی ہے اور بیماروں کو شفا ہو جاتی ہے۔"

"ہاں۔۔۔ سنا تو میں نے بھی ہے۔"

طاؤس خان نے کچھ سوچتے ہوئے آہستہ سے جواب دیا جس پر بڑھیا بولی۔

"میری مانو تو درخانئ کے لیے ان درویشوں سے دعا کراؤ۔ ہو سکتا ہے ان کی دعا سے ہماری بچی صحت مند ہو جائے اور اسے دوبارہ زندگی مل جائے۔"

طاؤس خان فوراً راضی ہو گیا۔ وہ تو یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح اس کی بیٹی صحت یاب ہو جائے۔ بڑھیا نے جب دیکھا کہ طاؤس خان راضی ہے تو جلدی سے درخانئ کے پاس گئی اور اسے خوشخبری سناتے ہوئے کہا۔

"بیٹا مبارک ہو آدم خان تمھارے پاس درویش کے روپ میں آئے گا۔ دیکھنا محتاط رہنا' کسی کو شک نہیں ہونا چاہیے۔ اگر اس بار گلاب کا یہ پھول تمھارے ہاتھ سے گر گیا تو پتی پتی ہو کر بکھر جائے گا اور اگر ایسا ہوا تو تمھارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ اس پھول کو احتیاط سے اپنے بالوں میں سجا لینا۔"

اس کے بعد وہ بھاگی بھاگی شہید مزار پر گئی اور آدم خان سے کہا۔

"جلدی چلو میرے ساتھ۔ تمھاری قسمت کا بند دروازہ کھلنے والا ہے۔ جس بدقسمتی نے تمھیں گھیرا ہوا تھا اس کے اندھیرے چھٹنے والے ہیں۔"

اس نے آدم خان کو جو درویش کے روپ میں تھا' اپنے ساتھ لیا اور طاؤس خان کے گھر لے آئی۔ اس وقت درخانئ آنکھیں بند کیے غنودگی کے عالم میں بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا پھول سا چہرہ مرجھایا ہوا تھا مگر جونہی آدم خان اس کے پاس گیا' اس نے اس کے پاؤں کی چاپ سنی تو اس کا دل اس قدر زور سے دھڑکنے لگا جیسے ابھی اچھل کر سینے سے باہر آ جائے گا۔ آدم خان کی نظریں تو اسی پر جمی ہوئی تھیں آگے سے درخانئ نے بھی آنکھیں کھول کر

اس کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں، انھوں نے آنسوؤں سے ایک دوسرے کا استقبال کیا کیونکہ لبوں پر تو مہریں لگی ہوئی تھیں۔ وہ نہ تو ایک دوسرے کا حال پوچھ سکتے تھے اور نہ اپنا حال بتا سکتے تھے۔ اس موقع پر آدم خان نے جب درخانئ کی حالت دیکھی تو وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اس طرح اس کا بہروپ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ طاؤس خان جو قریب کھڑا تھا سارا معاملہ سمجھ گیا۔ وہ غضب ناک ہو کر آگے بڑھا تاکہ تلوار کے ایک ہی وار سے اس کا کام تمام کر دے لیکن اس وقت بھی بڑھیا ہی کام آئی۔ اس نے اسے ایسا کرنے سے روکا اور کہا۔

"طاؤس خان ہوش سے کام لو۔ کیوں اپنی بدنامی کا خود ہی بندوبست کر رہے ہو۔"

پھر وہ اسے سمجھانے کے سے انداز میں بولی۔

"کوئی ایسا طریقہ اختیار کرو جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

بڑھیا کا مشورہ اپنی جگہ دانشمندانہ تھا، اسی لیے طاؤس خان بھی رک گیا۔ اور پھر جب آدم خان کو ہوش آیا تو اس نے دیکھا وہاں منظر ہی اور تھا۔ طاؤس خان آگ بگولا بنا اس کے قریب کھڑا تھا اور بڑھیا قریب ہی دبکی ہوئی اسے خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے ہی آدم خان نے آنکھیں کھولیں طاؤس خان گرج کر بولا۔

"اے مکار! تمھارا سارا فریب کھل گیا ہے۔ جی تو چاہتا ہے ابھی، اسی وقت تمھیں ٹکڑے ٹکڑے کر دوں مگر مجھے تمھارے ساتھ ساتھ اپنی بیٹی پر بھی رحم آتا ہے۔"

پھر اس سے حتمی انداز میں کہا۔

"اب تمھاری خیریت اسی میں ہے کہ اسی وقت ہمارے گاؤں سے چلے جاؤ ورنہ!"

اس کی یہ ورنہ یقیناً آدم خان کے لیے موت کا پیغام تھی اس لیے اب اس کا وہاں رکنا واقعی اپنی موت کو خود دعوت دینا تھا۔ اس نے حسرت بھری نظروں سے بستر پر پڑی درخانئ کی طرف دیکھا اور واپس شہید مزار آ گیا جہاں اس کے دونوں دوست اس کا انتظار کر رہے تھے کہ وہ آئے اور اس سے ساری روداد سنیں لیکن جب آدم خان نے دوستوں کو جا کر اپنے

ساتھ بیتی بیان کی تو وہ بھی پریشان ہو گئے۔ اب ان کے لیے یہی مناسب تھا کہ جس قدر جلد ہو سکے وہاں سے رخصت ہو جائیں۔ آدم خان نے اپنے ساتھیوں کو ساتھ لیا اور گاؤں کی طرف واپس چل دیا۔ جب وہ جا رہا تھا تو اس کا جسم تو اس کے ساتھ تھا مگر روح وہیں رہ گئی تھی۔ رباب اس کے ہاتھوں میں تھا اور نغمے وہیں بکھر گئے تھے۔ اس کی روح' اس کا دل اور اس کے نغمے سب وہیں رہ گئے تھے۔

آدم خان اپنے گاؤں واپس آیا تو اس کا دل جیسے دنیا سے اچاٹ ہو گیا۔ اسے اپنی زندگی بے مقصد معلوم ہو رہی تھی۔ کسی کام میں جی نہ لگتا تھا اور کسی بات میں دلچسپی نہ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہر وقت درخانئ کی تصویر بسی رہتی تھی اور اس کے سانسوں میں بھی اسی کا نام رچا بسا تھا۔ اب اس کی جدائی برداشت کرنا اس کے بس میں نہ رہا تھا اور اس سے ملنے کی بھی کوئی امید دکھائی نہ دیتی تھی۔ اس کی حالت روز بروز بگڑتی چلی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے گھر والوں کی تشویش بھی بڑھتی گئی۔ وہ حسن خان ملک کا اکلوتا بیٹا تھا جو اپنے قبیلے کا سردار تھا۔ وہ رہ رہ کر یہی سوچتا۔

"آدم خان میرا وارث ہے۔ میرے بعد اسے قبیلے کا سردار بننا ہے۔ اگر اس کی حالت یہی رہی تو یہ سب کچھ کیسے ہو گا۔؟"

اس نے بیٹے کے علاج کے لیے ہر تدبیر کر دیکھی۔ جہاں بھی کوئی وید حکیم بتایا گیا' اس نے اسے بلایا' جو دوا کسی نے بتائی اسے آزمایا۔ یہاں تک کہ پیروں فقیروں سے بھی دعا دم کرایا' ان کے تعویز گنڈوں کو بھی آزما کے دیکھا لیکن آدم خان کی حالت میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس طرح جب وہ چاروں طرف سے مایوس ہو گیا تو اس کے کسی قریبی دوست نے مشورہ دیا۔

"کوئی ایسی تدبیر کرو جس سے کسی طرح یہ درخانئ کو بھول جائے۔ یہی اس کا علاج ہے۔"

حسن خان کو یہ مشورہ پسند آیا لہٰذا اس نے پہلے اپنے گاؤں کا جائزہ لیا اور پھر اپنے قبیلے کی سب سے حسین و جمیل لڑکی گلنار کا انتخاب کیا۔ گلنار کا حسن اپنی مثال آپ تھا۔ وہ جب اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں ہوتی تو ایسے لگتا جیسے چاند ستاروں میں گھرا ہوا ہے۔ وہ ہجوم

میں رہ کر سب سے الگ تھلگ نظر آتی تھی۔ اس کی آنکھیں ہرنیوں کی طرح تھیں اور جب اس کے بال لہراتے تو گھٹا کا دھوکا ہوتا تھا۔ اس کا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح کھلا ہوا تھا اور اس کی چال اس طرح تھی جیسے مور مستی میں گھوم جھوم رہا ہو۔ جو کوئی بھی اسے ایک نظر دیکھ لیتا تو دیکھتا ہی رہ جاتا۔ وہ قبیلے کے ہر جوان کی آرزو تھی۔ حسن خان ملک نے سوچا ہو سکتا ہے آدم خان اسے دیکھ کر درخانئی کو بھول جائے' شاید وہ پھر سے زندگی کی طرف لوٹ آئے لیکن یہ محض اس کی غلط فہمی تھی۔ آدم خان نے اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تو درخانئی بیٹھی ہوئی تھی' پھر وہاں دوسرا کون سما سکتا تھا۔

اس طرح حسن خان ملک اور اس کے دوستوں رشتہ داروں نے ہر وہ تدبیر کر دیکھی جو ان کے ذہن میں آئی مگر آدم خان کی حالت جوں کی توں رہی۔ بلکہ ہر آنے والے دن میں مزید خراب ہونے لگی۔ اس کا روگ تو درخانئی کا ہجر و فراق تھا اور اس کا علاج صرف وصال تھا درخانئی کا وصال۔۔ اور وہی اب ناممکن تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آدم خان کی وارفتگی بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ایک دن اس خبر نے تہلکا مچا دیا کہ۔

"آدم خان مر گیا!"

"بازدرہ کا نغمہ گر مر گیا!"

یہ خبر آگ کی طرح پھیلی اور گاؤں سے نکل کر پورے قبیلے میں اور پھر پوری وادی میں ہر شخص کی زبان پر یہی تھا۔ "آدم خان ایک سچا عاشق تھا۔ وہ عشق کا شہید ہے۔"

آدم خان کی موت کے ساتھ ہی اس کا رباب بھی ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اس کے نغموں نے دم توڑ دیا تھا۔ تمام وادی خاموش ہو گئی تھی۔ بلند و بالا پہاڑوں پر سکوت چھا گیا' درخت حیران کھڑے تھے اور سبزہ زار دم بخود ہو گئے تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے آدم خان کی موت کے ساتھ وہاں کی ہر چیز مر گئی تھی۔

دوسری طرف درخانئی آدم خان کی جدائی میں اپنی بیماری کو گلے لگائے پڑی رہتی تھی۔ وہ ہر وقت آدم خان کی آمد کے خواب دیکھتی رہتی تھی۔ اب اس کا کوئی ہمدرد بھی نہ رہا تھا۔

گھر والے تو پہلے ہی اس سے بدظن ہو گئے تھے کہ اس نے باپ داد کی عزت کو داغ لگا دیا تھا' پھر وہ اس کی زندگی سے بھی مایوس ہو گئے تھے اس لیے کوئی بھی اس کی طرف توجہ نہ دیتا تھا۔ ان حالات میں لے دے کر صرف ایک وہی بڑھیا تھی جو درخانئ کا دکھ بانٹتی تھی مگر وہ بیچاری بھی اپنی جگہ مجبور اور بے بس تھی لیکن پھر بھی ہر وقت درخانئ کے پاس بیٹھی اس کو تسلیاں دیتی رہتی تھی تاکہ اس کی ڈوبتی ہوئی زندگی کو سہارا مل سکے۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ اب درخانئ کی زندگی کا سہارا وہی بڑھیا تھی۔ یا پھر چند وہ خواب تھے جنھوں نے اس کی نیندیں چھین لی تھیں۔ ایک روز اس نے ایک خواب دیکھا جو کچھ اس طرح تھا۔

ایک نہایت خوبصورت باغ ہے جہاں وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ سیر کر رہی ہے۔ اس نے سنا تو یکایک باغ کے ایک گوشے سے رباب کے نغمے پھوٹنے لگے۔ درخانئ نے حیران ہو کر اس طرف دیکھا تو ایک تالاب میں چاندی کی کشتی پر سوار آدم خان رباب کی دھن پر اس کی محبت کا گیت گا رہا تھا۔ جونہی اس نے درخانئ کو دیکھا' اپنی بانہیں اس طرح پھیلا دیں جیسے اسے بھی آغوش میں لینا چاہتا ہو۔ اور اس کے ساتھ ہی درخانئ پانی کی لہروں پر تیرتی ہوئی اس کی آغوش میں چلی گئی۔ پھر پلک جھپکتے میں تالاب ایک سمندر میں تبدیل ہو گیا جس میں ایک خوفناک طوفان آیا اور کشتی بری طرح ہچکولے کھاتی ہوئی ڈوبنے لگی۔ یہ دیکھ کر درخانئ نے چیخ ماری اور آنکھ کھلی تو دیکھا' اس کے پاس بڑھیا بیٹھی اسے تسلی دے رہی تھی۔ وہ دیوانہ وار بڑھیا سے لپٹ گئی اور روتے ہوئے پوچھا۔

"اماں! آدم خان کی کشتی ڈوبی تو نہیں۔؟"

جواب میں بڑھیا نے آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! تمھارا آدم خان اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ اس نے تمھاری محبت میں جان دے دی ہے۔"

یہ سنتے ہی درخانئ نے چیخ ماری اور اس کے منہ سے نکلا۔

"آدم خان۔۔۔ تم کہاں ہو۔؟"

اور اس کے ساتھ ہی اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ بڑھیا نے گھبرا کے اسے ہلایا اور جب اس کے جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی تو اسے جھنجھوڑا لیکن درخانئی اب اس دنیا میں نہ رہی تھی۔ وہ ایک خاموش نغمہ بن کر اپنے آدم خان کے پاس پہنچ گئی تھی۔

داستان نگار شاعروں نے لکھا ہے کہ جب درخانئی کی میت قبر میں اتاری گئی تو لوگوں نے محسوس کیا جیسے قبر میں دو میتیں ہیں۔ یہ دوسری میت آدم خان کی تھی۔ درخانئی اور آدم خان کا مزار آج بھی موجود ہے جہاں لوگ عشق کے ان شہیدوں کو عقیدت و محبت کے پھول پیش کرتے ہیں۔ یہ بھی روایت ہے کہ اس مزار کے پاس جو درخت ہے اس کی لکڑی سے مضراب بنایا جائے تو رباب کے نغموں میں کہیں زیادہ سوز و درد اور سریلا پن پیدا ہو جاتا ہے۔

یوسف کڑہ مار

صوبہ سرحد کی اس عوامی داستان کا تعلق بھی مغلیہ دور سے ہے اور یہ پٹھانوں کے مشہور قبیلے یوسف زئی کے ایک نوجوان، اس کی محبوبہ اور اس کی بہن کے گرد گھومتی ہے۔ یہ سچا پیار کرنے والوں کی داستان ہے لیکن عام طور پر اپنے ایک مرکزی کردار کے نام سے معروف ہے۔ ویسے یہ یکہ یوسف شیر بانو کے نام سے بھی جانی پہچانی جاتی ہے۔ اس کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب وہ دونوں ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔ یوسف زئی قبیلے کا ایک صاحب ثروت شخص تھا جس کا نام حسین تھا لیکن لوگ اسے حسین کاکا کے نام سے پکارتے تھے۔ اس کی اپنی سرسبز و شاداب چراگاہیں تھیں، بھیڑوں کے گلّے تھے اور کاشت کاری کے لیے زمین تھی۔ اس کے کھیت دور دور تک پھیلے ہوئے تھے اور پھلوں سے لدے ہوئے باغات تھے مگر یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ ہر وقت اداس اور مغموم رہتا تھا کیونکہ اس کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ اور اس کی بیوی دولتمند ہوتے ہوئے بھی حقیقی خوشیوں کے لیے ترستے تھے۔ دونوں میاں بیوی دن رات اللہ کے حضور دعائیں مانگتے کہ۔

"اے اللہ! تو نے ہمیں سب کچھ دیا ہے۔ ہمارے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے، اب ایک اولاد

کی دولت بھی عطا کر دے تاکہ ہمارے بعد ہمارا نام زندہ رہے۔"

حسین کاکا جب اپنے کھیتوں، چراگاہوں اور باغات پر نظر ڈالتا تو اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی۔ وہ سوچتا، یہ سب کچھ کس کام کا۔۔۔ میرے مرنے کے بعد اس کا وارث کون ہو گا۔؟ میاں بیوی اولاد کی خواہش میں دن رات دعائیں کرتے۔ پیروں فقیروں کی خدمت میں حاضری دیتے اور نذر نیاز پیش کرتے، مزاروں پر جاتے اور منتیں مانتے مگران کی یہ محرومی بدستور قائم رہی۔ وہ اپنے آنگن میں کسی ننھے منے بچے کے رونے ہنسنے کی آواز سننے کے لیے ترستے رہے۔ اپنی اسی آرزو میں جب وہ گاؤں میں چھوٹے چھوٹے بچے کھیلتے کودتے دیکھتے تو تڑپ تڑپ جاتے۔ پھر وہ اپنے آپ کو تسلی دینے کے لیے کہتے۔

"اللہ کی یہی مرضی ہے اس کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے وہ جب چاہے گا اس کا کرم ہو جائے گا۔"

اور پھر وہ وقت بھی آ گیا جب اللہ نے ان کی دعا سن لی۔ حسین کاکا کی بیوی امید سے ہوئی اور اب وہ اس گھڑی کا انتظار کرنے لگے جب ان کے گھر میں کسی ننھے بچے کی آواز گونجے۔ حسین کاکا اور بیوی کی خوشیوں کا ٹھکانا نہ تھا۔ اب وہ دن گن رہے تھے۔ یہاں تک کہ ایک دن ان کے سونے سونے گھر میں بچے کی آواز سنائی دی۔ یہ لڑکی تھی لیکن حسین کاکا اور اس کی بیوی اتنے ہی خوش تھے جتنے وہ لڑکا پیدا ہونے پر ہوتے۔ انھوں نے بچی کا نام بندگی رکھا اور جی بھر کے خوشیاں منائیں۔ رشتہ داروں اور ملنے جلنے والوں کی دعوت کی اور اس طرح سب کو اپنی خوشیوں میں شریک کیا۔ اللہ ان پر اتنا مہربان ہوا کہ اگلے سال ان کو ایک بیٹا بھی عطا کر دیا۔ جو کوئی بھی اسے دیکھتا، دیکھتا ہی رہ جاتا۔ وہ انتہائی حسین تھا اور اس کی اسی خوبصورتی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کا نام یوسف رکھا گیا۔ حسین کاکا نے بیٹے کی پیدائش پر بیٹی سے بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر خوشیاں منائیں کیونکہ اب اس کا وارث پیدا ہوا تھا۔ رشتہ دار، دوست احباب، ملنے جلنے والے یہاں تک کہ اپنے پرائے سبھی حسین کاکا کی خوشیوں میں برابر کے شریک تھے، کیونکہ حسین کاکا یوسف زئی قبیلے اور گاؤں ترلا ندی کی مقبول اور معزز

شخصیت تھا۔ اس کو اللہ نے جس طرح دنیا کی دولت سے نوازا تھا اسی طرح وہ دل کی دولت سے بھی مالا مال تھا یہی وجہ تھی کہ اس کا حجرہ ہمیشہ مہمانوں اور ملنے والوں سے بھرا رہتا تھا اور وہ ہر ایک کی خاطر تواضع کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا تھا۔ جب سے اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تھا' اس وقت سے اس کی مہمان نوازی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ جو بھی اس کے حجرے میں آتا وہ اسے اپنا بیٹا دکھاتا اور خوش ہو کر کہتا۔

"اللہ نے مجھے یہ چاند عطا کیا ہے۔۔۔ چاند سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔"!

دکھ میں وقت بڑی مشکل سے گزرتا ہے لیکن خوشیوں میں اس کے بیتنے کا پتا بھی نہیں چلتا۔ حسین کاکا کو بھی وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا اور بندئی اور یوسف جوان ہو گئے۔ شروع شروع میں تو یوسف اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا تھا مگر بعد میں اس نے سارا کام کاج خود سنبھال لیا تھا کیونکہ حسین کاکا اب بوڑھا ہو چکا تھا اس کا حجرہ پہلے ہی مہمان نوازی میں مشہور تھا' اب یوسف کے حسن اخلاق سے اسے اور بھی شہرت اور مقبولیت حاصل ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے باپ کی روایت کو قائم رکھا تھا بلکہ اس کو مزید آگے بڑھایا تھا۔ ایک حسین نوجوان جب آشنا اور اجنبی مہمانوں کی خاطر تواضع کرتا تو اس کے حجرے میں آنے والے بہت خوش ہوتے۔ ان کے گاؤں ترلاندی سے کڑہ مار شکار گاہ تین چار میل کے فاصلے پر واقع تھی۔ اس لیے جو لوگ وہاں شکار کھیلنے جاتے تو راستے میں یوسف کے حجرے میں ضرور پڑاؤ کرتے جس کے دروازے سب کے لیے کھلے رہتے تھے اور ہر ایک کو خوش آمدید کہا جاتا تھا۔

وقت گزر رہا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ حسین کاکا کی زندگی کا مقصد پورا ہو چکا ہے اور اس کی رخصت کی گھڑی آ پہنچی ہے مگر وہ آخری وقت یہ سوچ کر خوش تھا کہ اس کا جوان بیٹا اور بیٹی موجود ہیں جو اس کے بعد اس کا نام زندہ رکھیں گے۔ یہ بات ٹھیک بھی تھی' یوسف تو باپ کی زندگی ہی میں اپنی کھیتی باڑی کی دیکھ بھال کرنے لگا تھا اس لیے حسین کاکا کی موت سے صرف اتنا فرق پڑا کہ اس کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا تھا اور اس کی ذمہ داری بڑھ گئی تھی۔ پہلے تو اس کا بوڑھا باپ کچھ نہ کچھ اس کا ہاتھ بٹاتا تھا' اس کے تجربے اور مشورے رہنمائی کرتے

تھے لیکن اب سارا کام کاج صرف اسی کے کندھوں پر تھا جس نے اسے سنجیدہ بنا دیا تھا۔ اب اپنے لاابالی دوستوں سے اس کا ملنا جلنا کم ہو گیا تھا اور وہ اکثر کسی گہری سوچ میں کھویا رہنے لگا تھا۔ اس کی اسی تنہائی پسندی کو دیکھتے ہوئے اس کے یار دوست اسے یکہ یوسف کے نام سے پکارنے لگے تھے۔

اپنی مصروفیات کے باوجود یوسف نے اپنے حجرے میں آنے والے مہمانوں کی خاطر تواضع اور مہمان نوازی میں کوئی کمی نہ آنے دی تھی کیونکہ کڑہ مار شکار گاہ میں جانے والے شکاری ترلاندی میں اسی کے حجرے میں پڑاؤ کرنا پسند کرتے تھے اور وہ اپنے باپ کی اس روایت کو ختم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگرچہ اس میں اس کے کام کاج میں حرج ہوتا تھا لیکن اسے اس کی پرواہ نہ تھی۔ وہ ہر آنے والے کا مسکراہٹوں سے استقبال کرتا اور مسکراہٹوں سے رخصت کرتا اور لوگ اس کے حسن اخلاق سے بڑے متاثر تھے۔ پڑاؤ کرنے والے وہاں صرف رات ہی بسر نہیں کرتے تھے بلکہ یوسف کی مہمان نوازی سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔ یوسف خود بھی مہمانوں سے گھل مل جاتا اور ان سے شکار کے واقعات اور تجربات کے بارے میں قصے کہانیاں سنتا۔ ہر آدمی اپنے اپنے انداز میں اپنے تجربات سناتا اور یوسف بڑے شوق سے سنتا۔ اس کی اس بڑھتی ہوئی دلچسپی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے دل میں بھی شکار کھیلنے کی امنگ پیدا ہو گئی چنانچہ اس نے اپنا شوق پورا کرنے کی غرض سے دو چست چالاک شکاری کتے حاصل کیے، چند روز تک انھیں سدھاتے ہوئے اپنے آپ سے مانوس کیا اور پھر ایک دن اپنے دونوں کتوں کو ساتھ لے کر کڑہ مار شکار کی طرف چل دیا۔ شکاری بننے اور شکار کھیلنے کے سلسلے میں یہ اس کا پہلا دن تھا جو بعد میں معمول بن گیا۔

یوسف اپنے کتوں کی بڑی دیکھ بھال کرتا تھا۔ اس نے ان کے گلے میں گھنگرو باندھے ہوئے تھے جو چلتے میں چھنچھناتے تھے اور ان سے سریلی آوازیں نکلتی تھیں۔ جب وہ شکار کے لیے کڑہ مار شکار گاہ کی طرف جاتا تو اس کے کتوں کے گھنگروؤں کے آواز سن کر لوگ سمجھ جاتے کہ یوسف شکار کھیلنے جا رہا ہے۔ وہ راستے میں لوگوں سے علیک سلیک کرتا، کسی سے

ہاتھ ملاتا اور کسی کی خیر خیریت اشارے سے دریافت کرتا ہوا کڑہ مار کی جانب چلا جاتا۔ لوگ اس کے حسن اخلاق کے ساتھ ساتھ اس کی خوبصورتی اور بھرپور جوانی کی بھی تعریفیں کرتے۔ اس پورے علاقے میں اس جیسا حسین جوان اور کوئی نظر نہ آتا تھا۔ اسی طرح جب شام کو وہ شکار کھیل کے واپس آتا تو اس وقت بھی لوگ اس کے کتوں کے گھنگروؤں کی آواز سن کر جان لیتے کہ یوسف واپس ترلاندی جا رہا ہے۔ یہی اس کا معمول بن گیا تھا اور بندگی اپنی جگہ پریشان تھی کہ اس نے شکار کے شوق میں کام کاج چھوڑ دیا تھا اور کھیتوں اور بھیڑوں کی دیکھ بھال کو بالکل ہی فراموش کر دیا تھا۔ بھلا وہ بیچاری اکیلی کیا کر سکتی تھی بوڑھی ماں نے کئی بار اسے سمجھایا بھی کہ۔

"تم صرف شکار کے ہو کے رہ گئے ہو' ذرا کام کاج کی طرف بھی توجہ دو۔ اس طرح کب تک چلے گا۔؟ کاشت کاری سمٹ رہی ہے' بھیڑیں کم ہوتی جا رہی ہیں' چراگاہیں ویران ہوتی جا رہی ہیں۔!"

مگر یوسف کے سر پر تو صرف شکار کی دھن سوار تھی۔ ماں جب بھی اسے کچھ کہتی تو وہ ہوں ہاں کہہ کے اسے ٹال دیتا اور اس کی روش میں کوئی خاص فرق نہ آیا۔

ترلاندی سے کڑہ مار شکار گاہ کی طرف جاتے ہوئے راستے میں ایک گاؤں آتا تھا جس کا نام سکندر آباد تھا۔ اس گاؤں کے ملک کی ایک بیٹی تھی جس کا نام شیربانو تھا۔ یہ اس کی اکلوتی بیٹی تھی اور خوبصورتی میں صرف سکندر آباد ہی میں نہیں بلکہ ارد گرد کے علاقوں میں بھی اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ایک روز اس کی سہیلیوں نے اسے بتایا کہ۔

"ترلاندی کا ایک نوجوان اپنے کتوں کے ساتھ روزانہ شکار کھیلنے جاتا ہے' اس کی خوبصورتی اور جوانی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔!"

"کیا واقعی وہ اتنا خوبصورت ہے جتنا تم بتا رہی ہو۔؟"

شیربانو نے قدرے حیران ہو کر سہیلیوں سے سوال کیا جس پر انھوں نے جواب دیا۔

"اگر یقین نہ آئے تو کسی روز خود دیکھ لو۔ وہ ہر روز صبح ہی صبح یہاں سے گزرتا ہے اور شام کو

واپس بھی ہمارے گاؤں ہی کے پاس سے جاتا ہے۔"

اب تو شیربانو کا بھی دل چاہا کہ وہ یوسف کو دیکھے۔ وہ بار بار سوچتی تھی کہ کیا وہ واقعی اتنا خوبصورت ہے جتنی اس کی تعریف کی جا رہی ہے۔؟ لہٰذا ایک روز وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ گاؤں کے باہر وہاں جا کر کھڑی ہو گئی جہاں سے یوسف گزرتا تھا۔ ابھی اسے وہاں کھڑے ہوئے زیادہ وقت نہیں ہوا تھا کہ اتنے میں دور سے گھنگروؤں کی ہلکی ہلکی آواز آنا شروع ہو گئی جو اس بات کا پتا دے رہی تھی کی یوسف آ رہا ہے۔

"سنو! گھنگروؤں کی آواز بس اب یوسف آنے ہی والا ہے۔"

سہیلیوں نے شیربانو کو ہوشیار کیا اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد اس نے دیکھا تو ایک سروقد خوبصورت جوان اپنے دو کتوں کے ساتھ آ رہا تھا۔ وہ جوں جوں قریب آتا جا رہا تھا توں توں شیربانو کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ جب وہ اتنی قریب آ گیا جہاں سے وہ اس کا چہرہ اور چہرے کے خدوخال صاف دیکھ سکتی تھی تو دم بخود رہ گئی۔ اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ یوسف اس قدر حسین اور جوان ہو گا۔ وہ جیسے جیسے قریب آ رہا تھا شیربانو کو ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس کے دل میں اترتا چلا جا رہا ہو۔ وہ تو واقعی اس کے خوابوں کا شہزادہ تھا۔ اس نے ایسے ہی نوجوان کے لیے خوابوں کی دنیا بسائی تھی۔ وہ برسوں سے جس خیالی چہرے کا تصور کیے ہوئے تھی وہ یوسف ہی تو تھا۔ ادھر یوسف اپنے دھیان میں اپنے کتوں کے ساتھ آیا اور قریب سے یوں گزر گیا جیسے ہوا کا جھونکا گزر جائے لیکن شیربانو ابھی تک بت بنی کھڑی تھی۔ جیسے اس پر جادو کر دیا گیا ہو۔ وہ تو اس وقت چونکی جب اسے ایک سہیلی نے ہلکا سا جھنجوڑ کر کہا۔

"وہ تو جا بھی چکا۔۔ تم کہاں کھوئی ہوئی ہو"۔؟

اس نے جلدی سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ یوسف دور جا رہا تھا اور گھنگروؤں کی ہلکی آوازیں اس کے کانوں میں رس گھول رہی تھیں۔

اس روز جب وہ واپس گھر آئی تو اس کی آنکھوں میں یوسف ہی کا چہرہ تصویر بنا ہوا

تھااور گھنگروؤں کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی جو اس کی نس نس کو جھنجھنا رہی تھی۔ اس رات وہ ایک پل کے لیے بھی نہیں سو سکی اور پوری رات جاگ کر کاٹ دی۔ اس کے بعد اس کا یہ معمول بن گیا تھا کہ روز صبح یوسف کے آنے کا انتظار کرتی اور جب وہ قریب سے گزرتا تو اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی اور جب وہ دور چلا جاتا تو دھڑکتے دل کے ساتھ واپس آجاتی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ یوسف بھی اس کی طرف دیکھے' اسے پتا چل جائے کہ کوئی اس کا انتظار کرتا ہے مگر یوسف اپنی دھن میں مست آتا اور چلا جاتا۔ وہ کئی لوگوں سے سلام دعا کرتے ہوئے گزرتا تھا لیکن ایک معزز خاندان کا ہونے کی وجہ سے عورتوں کی طرف دیکھے بغیر نکل جاتا تھا' اس کی یہی بے توجہی شیربانو کی تشنگی اور بڑھا دیتی تھی۔ وہ اس کی اس ادا پر بھی فدا ہو جاتی تھی اور دن رات اسی کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔

ایک روز دوپہر کے وقت اپنے خیالات میں گم لیٹی ہوئی تھی کہ اتنے میں کسی نے ان کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کون ہو سکتا ہے۔؟"

اس نے یہ جملہ اس طرح کہا جیسے اپنے آپ سے پوچھ رہی ہو۔ چند لمحوں بعد دوبارہ دروازے پر دستک ہوئی تو اس نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ دیکھا تو باہر ایک نوجوان لڑکی کھڑی تھی جس کے ہونٹ بری طرح خشک تھے اور چہرہ مرجھایا ہوا تھا' اس کے باوجود وہ مسکرا رہی تھی۔ شیربانو نے اسے دیکھ کر اندازہ کر لیا کہ یہ ان کے گاؤں کی لڑکی نہیں ہے۔

"بہن تم کون ہو۔۔۔؟ کیا کام ہے۔؟"

پیشتر اس کے کہ وہ کوئی جواب دیتی شیربانو خود ہی بول پڑی۔

"آؤ بہن اندر آجاؤ۔۔۔ آؤ بیٹھو!"

لڑکی آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی اندر آگئی اور دھیمے لہجے میں بولی۔

"بہن میں پیاسی ہوں۔۔۔ مہربانی کر کے مجھے پانی پلا دو۔!"

شیربانو نے اس کی آواز سے اندازہ کیا کہ پیاس سے لڑکی کا حلق خشک ہو رہا ہے۔ وہ

جلدی سے کمرے میں گئی اور لسی کا بھرا ہوا پیالہ لا کر اس کو دیا۔ لڑکی نے لسی پی تو اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر رونق آ گئی۔ اس نے ممنون نظروں سے شیربانو کی طرف دیکھتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا اور جانے کی اجازت چاہی مگر شیربانو نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

"تم تھکی ہوئی لگتی ہو۔۔۔ چند لمحے ستا لو' پھر چلی جانا۔؟"

اور جب وہ اس کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گئی تو شیربانو نے دریافت کیا۔

"بہن تم اس قدر نڈھال کیوں ہو؟ کہاں سے آ رہی ہو۔۔۔؟ تمہارا نام کیا ہے اور کہاں جانا ہے۔۔۔؟"

جواب میں لڑکی نے بتایا۔

"میرا نام بندئی ہے۔ میرا بھائی یوسف ہر روز شکار کے لیے کڑہ مار جاتا ہے اور میں دوپہر کو اس کا کھانا لے کر جاتی ہوں۔ میں ابھی ابھی وہیں سے آ رہی ہوں۔ مجھے شدید پیاس لگ رہی تھی' مجبور ہو کر تمہارے دروازے پر دستک دی۔۔۔۔"

یہ سنتے ہی شیربانو کا دل اس زور سے دھڑکا جیسے ابھی سینے سے باہر آ گرے گا۔ اس نے پوچھا۔

"کون یوسف۔۔۔۔؟ وہی ترلاندی کے حسین کاکا مرحوم کا بیٹا جو روز گاؤں کے پاس سے گزرتا ہے اور جس کے ساتھ دو گھنگروؤں والے کتے ہوتے ہیں۔؟"

"ہاں۔۔۔ وہی میرا بھائی ہے اسے شکار کا بہت شوق ہے اور وہ روز کڑہ مار شکار گاہ جاتا ہے۔"

بندئی نے جب یہ بتایا تو شیربانو دل ہی دل میں خوش ہو گئی۔ اس نے سوچا' یوسف سے رابطے کا ایک ذریعہ تو ہاتھ آیا۔ بڑے پیار سے کہنے لگی۔

"بندئی بہن! یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ جب اپنے بھائی کو کھانا دے کر واپس جایا کرو تو چند گھڑیاں میرے پاس ٹھہر کے آرام کر لیا کرو۔۔۔ مجھے اپنی بہن ہی سمجھو۔"

اس کے بعد اس نے باتوں ہی باتوں میں یوسف کے بارے میں بہت کچھ معلوم کر لیا اور اسے اپنے بارے میں بھی بتایا۔ جب بندئی وہاں سے چلی گئی تو شیربانو خوشی میں پھولے نہ

سما رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یوسف سے ملاقات ہو گئی ہو۔ اس کے بعد ہر دوپہر کو بندئی جب اپنے بھائی یوسف کو کھانا دے کر آتی تو جاتے وقت سکندر آباد میں شیربانو کے ہاں کچھ دیر ضرور آرام کر کے آگے جاتی۔ شیربانو کو بھی موقع مل جاتا اور وہ زیادہ سے زیادہ یوسف ہی کے بارے میں باتیں کرتی۔ ایک دن بندئی نے اپنے بھائی کو بتایا کہ سکندر آباد کے ملک کی بیٹی اس کی سہیلی بن گئی ہے اور وہ آتے میں روز اس کے پاس کچھ دیر ٹھہر کے آتی ہے۔ اس نے بھائی سے شیربانو کے حسن اخلاق کی بہت تعریف کی اور یہ بھی بتایا کہ وہ بہت حسین ہے۔ پھر اس نے یہ بھی بتایا کہ۔

"شیربانو زیادہ وقت تمھارے بارے میں باتیں کرتی رہتی ہے اور روزانہ تم جب کڑہ مار جاتے ہو تو وہ تمہیں دیکھنے کے لیے انتظار کرتی رہتی ہے۔"

"اچھا۔۔۔ ایسا ہے۔؟"

یوسف نے حیرانی سے بندئی کی طرف دیکھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کوئی لڑکی اس کا انتظار کر سکتی ہے اور وہ بھی سکندر آباد کے ملک کی بیٹی۔۔۔؟ اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا اور زندگی میں پہلی بار احساس ہوا کہ اسے کوئی چاہنے والا بھی موجود ہے۔ اس رات وہ شیربانو ہی کے متعلق سوچتا رہا۔ حالانکہ اس نے اسے دیکھا تک نہیں تھا لیکن پھر بھی اس نے اپنے تصور میں اس کے چہرے کے خدوخال بنا لیے تھے۔ اس نے بہن سے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ شیربانو کس جگہ اس کا انتظار کرتی ہے لہٰذا دوسری صبح جب وہ شکار کو گیا تو اس کے قدم تیز تیز اٹھ رہے تھے تا کہ وہ جلد سے جلد سکندر آباد پہنچ جائے۔ گاؤں کے قریب جا کر اس کی بے تاب اور مشتاق نظریں ادھر ادھر شیربانو کو تلاش کرنے لگیں۔ جب وہ بہن کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچا تو دیکھا' وہاں تین چار لڑکیاں کھڑی تھیں جن میں ایک انتہائی خوبصورت تھی اور وہ بڑے اشتیاق سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل نے فوراً گواہی دی کہ یہی شیربانو ہے۔ اس نے مسکرا کے اس کی طرف دیکھا جس کا جواب شیربانو نے بھی مسکراہٹ سے دیا۔ اس طرح دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو محبت

کا پیغام دیا۔ انھیں ایسے محسوس ہوا جیسے وہ برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں جیسے وہ پیدا ہی ایک دوسرے کے لیے ہوئے ہیں۔ اس طرح روزانہ شکار کھیلنے والا شکاری یوسف خود شکار ہو گیا تھا۔ اس کے برعکس شیربانو شکاری بھی تھی اور شکار بھی خود تھی۔ اب یہ ان کا روز کا معمول بن گیا تھا، صبح جب یوسف کڑہ مار جاتا تو آگے شیربانو کو اپنا منتظر پاتا۔ دونوں مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کا استقبال کرتے اور دوسروں سے نظریں بچا کے اشاروں ہی اشاروں میں سلام کرتے اور جدا ہو جاتے۔

ایک دن کا ذکر ہے۔ یوسف معمول کے مطابق شکار کے لیے گیا، راستے میں روز کی طرح سکندر آباد میں شیربانو سے نظروں سے ملاقات کرتے ہوئے کڑہ مار پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر وہ شکار کی تلاش میں ادھر ادھر گھوم رہا تھا کہ اچانک ایک پتھر سے اس کا پاؤں پھسلا اور وہ نیچے ایک گہری کھائی میں لڑھک گیا۔ اس نے بہتیرا اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن کوئی سہارا ایسا نہ ملا جو اسے نیچے گرنے سے روک لیتا۔ نیچے کھائی بہت گہری تھی، اگر وہ اس میں گر جاتا تو اس کی موت یقینی تھی۔ اتفاق سے نیچے پتھروں میں ایک ایسا درخت اگا ہوا تھا جو چٹان کو چیر کے باہر نکل آیا تھا اور اس کی ٹہنیاں ادھر ادھر پھیلی ہوئی تھیں۔ یوسف نے جلدی سے درخت کی ایک مضبوط شاخ کو پکڑ لیا اور اس طرح وہ گہری کھائی میں گرنے سے بچ گیا لیکن اس وقت اس کی حالت یوں تھی کہ اس نے انتہائی مضبوطی سے شاخ کو پکڑا ہوا تھا اور فضا میں معلق تھا۔ اس نے اپنی مدد کے لیے لوگوں کو پکارا، آوازیں دیں مگر اس جنگل میں اس کی آواز سننے والا کوئی نہ تھا۔ شام ہو رہی تھی، چاروں طرف اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ اور یوسف شاخ کے سہارے لٹکا ہوا زندگی اور موت کے درمیان تھا۔

دوسری طرف شیربانو یوسف کی واپسی کی منتظر تھی لیکن اس کا دور دور تک پتہ نہ تھا حالانکہ اس کے لوٹنے کا وقت گزر چکا تھا اور اب شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بڑی پریشان تھی کہ اللہ خیر کرے، ابھی تک وہ کیوں نہیں آیا۔۔؟ اب تک تو اسے گزر جانا چاہیے تھا۔۔ وہ دل ہی دل میں اس کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ اس وقت اس کا دل بری طرح

دھڑک رہا تھا۔ اتنے میں اس نے دور سے آتی ہوئی گھنگروؤں کی آواز سنی تو وہ بڑے اشتیاق سے اس جانب دیکھنے لگی کیونکہ روزانہ یہی آواز یوسف کے آنے کی خبر دیتی تھی مگر یہ آج کیا ہوا۔؟ اس نے دیکھا تو کتوں کے ساتھ یوسف نہیں تھا اور کتے پاگلوں کی طرح بھاگتے ہوئے آ رہے تھے۔ شیربانو کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ اور بھی پریشان ہو گئی۔

"یوسف کتوں کے ساتھ کیوں نہیں۔۔۔؟ وہ کہاں گیا۔؟"

کتے بھاگتے ہوئے آئے اور بے تحاشا دوڑتے ہوئے ترلاندی گاؤں کی طرف چلے گئے۔ شیربانو کے ذہن میں طرح طرح کے خیال آنے لگے۔ کہیں یوسف کو کچھ ہو نہ گیا ہو۔؟ اس کی کسی سے لڑائی نہ ہو گئی ہو۔؟ اس پر کوئی جنگلی جانور حملہ آور نہ ہو گیا ہو۔؟ اس پر کوئی مصیبت نہ آ گئی ہو۔؟ وہ اسی قسم کے خیالات میں الجھی ہوئی واپس گھر چلی گئی۔ اس رات وہ اپنے خیالات میں کھوئی کروٹیں بدلتی رہی۔ اس نے پوری رات اس طرح کاٹی جیسے کانٹوں پر لیٹی ہو۔ یوسف کا واپس نہ آنا اس کے لیے ایک معما بن چکا تھا جسے وہ حل نہیں کر سکتی تھی۔

دوسری صبح ہوئی تو وہ جاگ رہی تھی۔ اس نے پوری رات آنکھوں میں کاٹی تھی۔ اس روز وہ مقررہ وقت سے پہلے ہی جا کر یوسف کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا کہ اتنے میں دور سے گھنگروؤں کی آواز آئی۔ اس کا دل خوشی اور خوف کے ملے جلے جذبات میں دھڑک رہا تھا۔ آواز آہستہ آہستہ قریب آتی گئی۔ یہاں تک کہ اس نے دیکھا آج کتوں کے ساتھ یوسف کی بجائے اس کی بہن بندئی اور اس کی بوڑھی ماں دونوں بھاگتی ہوئی آ رہی تھیں۔ جب وہ اس کے قریب آئیں تو اس نے بڑھ کر بندئی سے پوچھا۔

"بندئی کیا ہوا۔۔۔؟ یوسف کہاں ہے۔؟"

"وہ رات گھر نہیں آیا۔۔۔ میں اور ماں اسے ڈھونڈنے جا رہی ہیں۔"

بندئی نے ہانپتے کانپتے جواب دیا اور ماں بیٹی رکے بغیر آگے بڑھ گئیں۔ اس وقت شیربانو کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور وہ بھی ان کے پیچھے دوڑنے لگی۔ اس طرح وہ تینوں کتوں کے پیچھے پیچھے بھاگی چلی جا رہی تھیں۔ کتے انھیں جنگل میں اس

جگہ لے گئے جہاں یوسف کھائی کے کنارے درخت کی شاخ پکڑے لٹکا ہوا تھا۔ اس طرح اسے موت اور زندگی کے درمیان لٹکا ہوا دیکھ کر تینوں کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ انہوں نے پاگلوں کی طرح اپنے بال نوچ لیے اور شور کرتی ہوئے ادھر ادھر بھاگنے لگیں لیکن ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ رو بھی رہی تھیں اور یوسف کو تسلیاں بھی دے رہی تھیں۔ اتنے میں شیربانو کے ذہن میں ایک ترکیب آئی' اس نے اپنی چادر اتار کر یوسف کی طرف پھینکی اور ایک سرا تینوں نے بڑی مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اگرچہ لٹکے ہوئے یوسف کے لیے بہت دشوار تھا کہ وہ شاخ کو چھوڑ کے چادر کو تھامتا کیونکہ کل شام سے شاخ کو پکڑے پکڑے اس کے ہاتھ شل ہو چکے تھے لیکن اس نے ہمت سے کام لیا اور کسی نہ کسی طرح چادر کا سرا پکڑ لیا۔ اس کے بعد ان تینوں نے پوری طاقت صرف کر کے اسے باہر کھینچ لیا جب وہ باہر آیا تو وہ تینوں دیوانہ وار اس سے لپٹ گئیں۔

اس واقعہ سے جہاں یوسف کو نئی زندگی ملی تھی' وہاں اس سے دونوں خاندانوں کی جان پہچان بھی ہو گئی تھی۔ اور جہاں تک شیربانو اور یوسف کا تعلق تھا' وہ دونوں تو ایک دوسرے کے ہو کر رہ گئے تھے۔ اس طرح ان دونوں خاندانوں کے تعلقات اس قدر بڑھ گئے کہ ایک وقت ایسا آیا جس کا یوسف اور شیربانو کو انتظار تھا۔ یوسف کی ماں سکندر آباد کے ملک کے پاس اپنے بیٹے کے لیے شیربانو کا رشتہ مانگنے گئی اور اس سے کہنے لگی۔

"ملک صاحب! آپ حسین کاکا مرحوم کے جاننے والے ہیں۔ آپ نے میرے بیٹے یوسف کو بھی دیکھا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو جو یوسف اور شیربانو کا رشتہ ہو جائے۔ ہم اسے اپنی خوش بختی سمجھیں گے۔؟"

شیربانو کے باپ ملک نے بھی سوچا' یہ رشتہ دونوں کے لیے موزوں ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ یوسف کا خاندان قبیلے میں نیک نام اور باعزت ہے' خود یوسف میں بھی کوئی برائی نہیں ہے' ماشاء اللہ جوان بھی ہے' خوبصورت بھی ہے' چنانچہ اسے بھی یہ رشتہ پسند آیا۔ اس طرح دونوں جانب سے اس رشتے پر رضامندی ہو گئی تھی مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ شیربانو

کے چچیرے بھائی تھے جو شروع ہی سے اس پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ سکندر آباد کے ملک کی اکلوتی بیٹی پر قبضہ کر کے اس کی ساری جائیداد کے مالک بن جائیں۔ جب انھیں یہ پتا چلا کہ ان کا چچا یوسف کے لیے شیربانو کے رشتے پر راضی ہو گیا ہے تو وہ بڑے تلملائے اور اپنے چچا سے کہنے لگے۔

شیربانو یوسف زئیوں میں عورتوں کا وقار ہے۔ ہم معمولی قیمت پر اس کی شادی نہیں کرنے دیں گے۔"

انھوں نے قبیلے کی رسم کے مطابق شیربانو کی جو قیمت مقرر کی وہ اتنی زیادہ تھی کہ یوسف کی پہنچ سے باہر تھی۔ اس نے اپنے شکار کے شوق میں اپنی کھیتی باڑی اور دوسرے کام کاج کو بالکل ختم کر دیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ جو جائیداد حسین کاکا چھوڑ کے گیا تھا وہ بھی پوری سلامت نہیں رہی تھی اسی لیے اب شیربانو کی قیمت ادا کرنا اس کے بس میں نہیں تھا مگر اس میں کوئی کچھ نہ کر سکتا تھا کیونکہ یہ قبیلے کی رسم تھی جو صدیوں سے چلی آ رہی تھی جس کا احترام کرنا اور اسے تسلیم کرنا قبیلے کے ہر فرد کا فرض تھا۔ اس طرح شیربانو کے چچازاد بھائیوں نے اس کی اور یوسف کی محبت کے درمیان رسم و رواج کی دیوار کھڑی کر دی تھی جو صرف مال و دولت ہی سے گرائی جا سکتی تھی اور یوسف کے پاس اتنی دولت نہیں تھی۔ وہ دونوں اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ سب کچھ کس کا کیا کرایا ہے مگر دونوں اپنی اپنی جگہ مجبور تھے۔ اس کے چچازاد بھائیوں کا خیال تھا کہ اس طرح یہ رشتہ ختم ہو جائے گا لیکن یوسف اپنی محبت کا سچا اور اپنے ارادے کا پکا تھا۔ اس نے حوصلہ نہ ہارا اور شیربانو سے کہا۔

"شیربانو! تم فکر نہ کرو۔ میں تمھیں حاصل کرنے کے لیے یہ شرط ضرور پوری کروں گا۔ میں اتنی دولت ہر حالت میں پیدا کر کے رہوں گا۔ میری محبت سچی ہے۔ بس تم حوصلہ نہ ہارنا اور میرا انتظار کرنا۔!"

پھر اس نے اپنی ماں اور بہن کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"تم دونوں گھبرانا نہیں میں بہت جلد لوٹ آؤں گا۔"

اس طرح یوسف اپنی بوڑھی ماں، بہن اور شیربانو کو آنسو بہاتا چھوڑ کر چلا گیا اور جا کر شہنشاہ اکبر کی فوج میں شامل ہو گیا۔ وہ نوجوان اور بہادر تو تھا ہی چند ہی دنوں میں اس نے فوج میں نام پیدا کر لیا۔ ہر ایک اس کی دلیری و بہادری کی تعریف کرتا نظر آنے لگا اور اس طرح اس نے بہت جلد ترقی کر کے فوجی عہدہ حاصل کر لیا لیکن وہ اس بات سے بے خبر رہا کہ پیچھے اس کی بوڑھی ماں اور جوان بہن کن حالات سے گزر رہی ہیں۔ جب تک وہ ترلانڈی میں موجود رہا اس کے قریبی رشتہ دار خاموش اور دبے ہوئے رہے مگر جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ وہ کہیں چلا گیا ہے تو انھوں نے اس کی زمین اور جائیداد پر قبضہ کرنے کے لیے طرح طرح کی سازشیں شروع کر دیں۔ پھر کچھ دنوں بعد انھوں نے یہ مشہور کر دیا کہ یوسف کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس خبر سے بوڑھی ماں اور بہن کا برا حال ہو گیا رشتہ داروں نے تو یہ خبر ہی اس لیے مشہور کی تھی کہ ان کی ساری امیدیں دم توڑ دیں اور وہ یوسف کے واپس آنے کی آس چھوڑ دیں، اس طرح ماں بیٹی کو مجبور و بے بس دیکھ کر انھوں نے ان کی زمین اور دوسری جائیداد پر قبضہ کر لیا۔ صرف قبضہ ہی نہیں کیا بلکہ ماں بیٹی کو گھر سے بھی نکال دیا، جن کا اب کوئی پرسان حال نہیں تھا اور وہ لوگوں کے گھروں میں کام کر کے زندگی گزارنے لگیں۔

ادھر شیربانو بھی یوسف کی جدائی میں بے حال ہو رہی تھی۔ اوپر سے ایک ستم یہ ہوا کہ اس کا باپ مر گیا اور اس کی رہی سہی امیدوں نے بھی دم توڑ دیا۔ یہ دیکھتے ہی اس کے چچیرے بھائیوں کو موقع ہاتھ آ گیا، اس کی ماں بھی اپنی جگہ مجبور تھی۔ عورت ذات خاندان والوں کا مقابلہ کیسے کر سکتی تھی۔؟ مگر شیربانو نے اپنے دل میں عہد کیا تھا کہ اگر اس کی شادی کسی اور سے کی گئی وہ تو زندہ نہیں رہے گی۔ اس نے اپنی ماں سے بھی صاف صاف کہہ دیا تھا کہ۔

"بابا نے اپنی زندگی میں میری شادی یوسف سے طے کی تھی اس لیے میں یوسف کی امانت ہوں اگر میرا ہاتھ زبردستی کسی اور کے ہاتھ میں دیا گیا تو میں زہر کھا لوں گی۔"

لیکن اب اس گھر میں اس سے ہمدردی کرنے والا کون تھا۔؟ آخر وہ وقت بھی آ گیا جب شیربانو کی شادی طے کر دی گئی اور اس کا گھر سے باہر آنا جانا بند کر دیا گیا۔ شادی کی تاریخ

مقرر ہو چکی تھی اور بڑے زور شور سے تیاریاں شروع کر دی گئی تھیں۔ اس طرح شیر بانو کی ساری امیدیں ختم ہوتی جا رہی تھیں اور اس کا جینا مرنے سے بدتر ہو رہا تھا۔ بہتیرا سوچا' غور کیا مگر بچنے کی کوئی راہ سجھائی نہ دیتی تھی۔ اس نے کسی طرح بندئی تک یہ پیغام پہنچایا کہ مجھے آ کر مل جاؤ' بندئی بیچاری کی تو حالت اس سے بھی بری تھی' جب وہ آئی تو اس کا پھول سا چہرہ مرجھایا ہوا دیکھ کر اسے بہت دکھ ہوا۔ دونوں ایک دوسرے سے گلے لگ کے دیر تک روتی رہیں۔ پھر جب دل کی بھڑاس نکال چکیں تو شیر بانو نے بندئی سے کہا۔

"بندئی بہن! اب تیرے سوا میرا کوئی ہمدرد نہیں رہا۔۔ میری زبردستی شادی کی جا رہی ہے جب کہ میں تمہارے بھائی یوسف کی امانت ہوں۔ میں نے اس سے محبت کی ہے اور مرتے دم تک اسی کی رہوں گی۔ میں اپنے عہد کی سچی ہوں' کبھی اس سے بے وفائی نہیں کروں گی خواہ میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔۔۔ اب تم ہی میری مدد کر سکتی ہو۔!"

وہ مسلسل بول رہی تھی اور بندئی خاموش بیٹھی سن رہی تھی۔ ایسے لگتا تھا کہ شیر بانو دکھوں سے بھری بیٹھی تھی' اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ بندئی بھی رو رہی تھی۔ اس وقت بندئی کا اپنا دل بوجھل ہو رہا تھا۔ اس نے غمگین لہجے میں کہا۔

"تم میری بہن ہو' بتاؤ میں تمہارے کس کام آ سکتی ہوں۔۔؟"

یہ سن کر شیر بانو نے اسے اپنا سونے کا پنیروان دیا اور بولی۔

"میرا یہ پنیروان کہیں بیچ دو اور اس کے بدلے میں مجھے کہیں سے زہر خرید کر لا دو تا کہ میں یوسف کی محبت پر قربان ہو جاؤں۔؟ میں بے وفا نہیں کہلوانا چاہتی۔۔۔!"

بندئی نے پنیرواں تو ہاتھ میں لے لیا لیکن ایک نظر شیر بانو کو دیکھتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"بہن! تم نے میری مشکل بھی آسان کر دی ہے۔ تم نہیں رہو گی' بھائی یوسف نہیں ہے' بوڑھی ماں آج کل کی مہمان ہے' تو پھر میں بھی جی کر کیا کروں گی۔۔۔؟ میں بھی اب

زندہ رہنا نہیں چاہتی۔۔۔ میں بھی تمہارے ساتھ اس دکھوں بھری دنیا کو چھوڑ دوں گی!"

اس نے زہر لانے کا وعدہ کیا اور سسکیاں بھرتی ہوئی چلی گئی۔

وہ شیربانو سے مل کے آئی تھی اور اب اس کے لیے زہر حاصل کر کے لے جانا تھا لیکن وہ جس گھر میں ملازم تھی ان کے ہاں آج مہمانوں کا ہجوم تھا' دیگیں چڑھی ہوئی تھیں' ڈھول تاشے بج رہے تھے' ربابوں اور سرنوں کے نغمے گونج رہے تھے کیونکہ ان کے ہاں سے شیربانو کی بارات جانے والی تھی۔ بندئی وہاں کام میں مصروف تھی اور پانی بھر بھر کر لا رہی تھی۔ اتفاق سے اس کے ہاتھ سے گھڑا سرک گیا اور گر کے ٹوٹ گیا۔ یہ دیکھ کر باورچی نے اسے بری طرح ڈانٹا جس پر اس کا دل بھر آیا۔ کہاں تو وہ دن تھے کہ وہ ناز و نعم میں زندگی گزارتی تھی اور گھر بھر کی پیاری تھی' باپ' ماں' بھائی' سب اس کے ناز اٹھاتے تھے اور کہاں یہ دن آ گیا تھا کہ اسے گھروں میں ملازمت کرنا پڑ رہی تھی اور ایک باورچی اسے ڈانٹ رہا تھا۔ یہ کچھ سوچ کر وہ ایک طرف جا کر کھڑی ہو کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ عین اس وقت اسے یاد آیا کہ اسے شیربانو کے لیے زہر بھی لے جانا ہے۔ یہ یاد آتے ہی اس نے اپنے دل میں خود سے کہا۔

"اچھا ہے۔۔۔ میں بھی شیربانو کے ساتھ خود کو ختم کر لوں گی۔"

وہ اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ اتنے میں اسے کسی نے پکارا۔

"بندئی بہن۔۔۔؟!"

وہ چونک پڑی۔ یہ آواز تو جانی پہچانی تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو سامنے اس کا بھائی یوسف کھڑا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ گیا اور وہ روتی ہوئی بھاگ کر اپنے بھائی سے لپٹ گئی۔ یوسف حیران و پریشان کھڑا تھا کہ اس کی بہن کو کیا ہوا ہے؟ یہ اس کی کیا حالت ہے۔۔۔؟ اس نے سامنے مہمانوں کی طرف دیکھا۔۔۔ پکتی ہوئی دیگوں پر نظر ڈالی اور تعجب سے پوچھنے لگا۔

"بندئی بہن! یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔۔۔ تم نے اپنی حالت کیا بنا رکھی ہے۔۔۔؟ یہ کس

کی شادی ہو رہی ہے۔۔۔۔؟"

جواب میں بندی نے ہچکیاں لیتے ہوئے بتایا۔

"تمہاری بہن اور حسین کاکا کی بیٹی اب وہ بندی نہیں رہی جسے تم چھوڑ کے گئے تھے۔ اب وہ اس گھر کی ملازمہ ہے اور یہ سب کچھ شیربانو کی بارات کی تیاریاں ہیں۔ یہاں سے اس کی بارات جائے گی۔!"

یوسف نے یہ سنا تو چند لمحوں کے لیے پریشان ہو گیا لیکن پھر بندی کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔

"بہن! تم فکر نہ کرو میں آگیا ہوں' سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب تمہارا بھائی صرف یوسف یکہ اور ایک شکاری نہیں ہے بلکہ اکبر اعظم کی فوج کا ایک افسر ہے۔ میں چھٹی لے کر آیا ہوں اور میرے ساتھ مسلح سپاہیوں کا دستہ بھی ہے۔"

پھر اس نے بندی سے کہا۔

"تم ابھی جاؤ اور جا کر شیربانو کو بتاؤ کہ میں آگیا ہوں۔۔۔ وہ بالکل نہ گھبرائے۔"

اس کے بعد ہوا یہ کہ سکندر آباد میں شیربانو کی بارات آگئی تھی' ہر طرف باجوں گاجوں کا شور تھا' رباب اور سرنے نغمے بکھیر رہے تھے۔ باراتی اور بارات کا استقبال کرنے والے خوشیوں کے اظہار کے لیے ہوائی فائر کر رہے تھے اور فضا میں مسلسل گولیاں چلنے کی آوازیں گونج رہی تھیں کہ اسی شور اور ہنگامے میں یوسف نے اپنے مسلح سپاہیوں کے ساتھ بھرپور حملہ کر دیا۔ پہلے تو باراتیوں اور دوسرے مہمانوں نے یہی سمجھا کہ خوشی میں فائرنگ ہو رہی ہے مگر جب انھوں نے فوجیوں کو کئی لوگوں کو ہلاک کرتے دیکھا تو بھگدڑ مچ گئی اور سب اپنی اپنی جان بچانے کے لیے ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے اور کون کر رہا ہے۔؟ یوسف بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ بے گناہوں کا خون کرے لیکن وہ اپنے دشمنوں اور مخالفوں سے انتقام ضرور لینا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے دشمنوں کو چن چن کر موت کے گھاٹ اتارا اور جب شیربانو کے سامنے پہنچا تو وہ اسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی۔ وہ بت بنی اسے دیکھ رہی تھی' اس کے سب خاموش تھے مگر اس کی برستی ہوئی آنکھوں نے سب کچھ

کہہ دیا تھا۔ یوسف نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"میں شرمندہ ہوں کہ بہت دیر سے میں آیا ہوں۔ دراصل میں اتنی دولت کما کے لانا چاہتا تھا کہ قبیلے کی رسم پوری کر کے تمہیں اپنی بیوی بنا سکوں۔۔۔۔ اب میں اس قابل ہو گیا ہوں اور اب تمہارے لیے میری بارات آئے گی۔"

وہ اپنے گاؤں ترلاندی گیا تو لوگوں نے اسے خوش آمدید کہا۔ وہ خوش تھے کہ حسین کاکا کا اجڑا ہوا گھر پھر سے آباد ہو رہا ہے۔ یوسف گاؤں کے بزرگوں سے مشورہ کر کے دوسرے روز بارات لے کر سکندر آباد گیا اور اپنی منگیتر شیربانو کو بیاہ کر لایا جس کی آمد کی خوشی سب سے زیادہ بندئی کو تھی۔ اسے بچھڑا ہوا بھائی بھی مل گیا تھا اور شیربانو جیسی بھابھی بھی حاصل ہو گئی تھی۔ کڑہ مار شکار گاہ جہاں کبھی وہ شکار کھیلنے جایا کرتا تھا اس نے وہاں اپنا گھر بنا لیا تھا اور وہیں رہنے لگا تھا۔ ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ بندئی بیمار پڑ گئی اور چند ہی روز میں اللہ کو پیاری ہو گئی۔ اس کی عزیز بہن' جس نے اس کے لیے بے پناہ دکھ جھیلے تھے' اس سے جدا ہو گئی تھی اور اس کے غم میں یوسف کی بری حالت تھی۔ ابھی بندئی کو مرے ہوئے چند ہی روز بیتے تھے کہ ایک دن شیربانو شدید بیمار ہو گئی ہر طرح کا علاج کرنے کے باوجود ٹھیک نہ ہو سکی اور ایک روز وہ بھی بندئی کے پاس چلی گئی۔ یوسف کی دنیا اندھیر ہو گئی اسے ایسے محسوس ہوا جیسے وہ کڑہ مار کی کھائی میں پھر معلق ہو گئی ہے اور اب اسے بچانے والا کوئی نہ تھا وہ دیوانہ وار گھومنے لگا اور دنیا تیاگ کے شیربانو کی قبر پر مجاور بن کے بیٹھ گیا۔ اس کی حالت مجذوبوں کی سی ہو گئی تھی۔ اور پھر اس کی دیوانگی اس طرح ختم ہوئی کہ وہ بھی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

کہا جاتا ہے' کڑہ مار میں دو قبریں ہیں۔ یوسف اور شیربانو کی قبریں۔ اس مقام کو اب "شیر غونڈ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جہاں عشق کے دو شہید ابدی نیند سوئے ہیں۔

موسیٰ خان گل مکئی

موسیٰ خان اور گل مکئی کی عوامی داستان بھی صوبہ سرحد کی مقبول و معروف کہانیوں میں سے ایک ہے اور اس کا تعلق مردان اور صوابی کے علاقے سے ہے۔ یہ اس دور کی کہانی ہے جب موجودہ صوابی کے علاقے پر عیسیٰ خان نام کا ایک شخص حکومت کرتا تھا۔ عیسیٰ خان پٹھانوں کے مشہور قبیلے یوسف زئی کا سردار تھا اور اس دور میں یہاں یوسف زئی قبیلے ہی کے لوگ آباد تھے اس لیے اس علاقے پر اسی کا حکم چلتا تھا۔ اس کی حکومت صرف اسی علاقے تک محدود نہ تھی بلکہ دور دور تک پھیلی ہوئی تھی اور اس کے دارالحکومت کا نام تواترین تھا جو اس دور میں ایک خوبصورت قصبہ تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ ماضی میں تواترین وہاں آباد تھا جہاں آج کل تحصیل صوابی ضلع مردان میں ایک غرو مبک نام کا گاؤں آباد ہے۔ قصبہ تواترین ماضی کے کسی دور میں تباہ و برباد ہو گیا تھا اور پھر اسی کے کھنڈروں پر غرو مبک آباد ہوا جو آج بھی موجود ہے۔

عیسیٰ خان اپنے قبیلے کا سردار اور امیر آدمی تھا۔ اسے اللہ نے ناموری بھی دی تھی اور دولت و عزت سے بھی نوازا تھا۔ اس طرح اس کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ تھا' اگر کمی تھی تو

صرف ایک چیز کی۔ اور وہ چیز تھی اولاد۔ جسے وہ دولت و عزت سے نہیں خرید سکتا تھا۔ وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھا اور اس کے لیے دن رات اللہ سے دعائیں کرتا تھا کہ۔

"اے خدا! تم نے مجھے دنیا کی ہر نعمت سے نوازا ہے۔ دولت' شہرت اور دنیاوی طاقت' سب کچھ دیا ہے لیکن میں ابھی تک اولاد کے لیے ترس رہا ہوں۔!

اس کی بیوی بھی بیچاری ہر نماز کے بعد گڑگڑا کر خدا کے حضور عرض کرتی۔

"اے دنیا اور آخرت کے مالک! ہماری یہ تمنا بھی پوری کردے۔ تیرے گھر میں کس چیز کی کمی ہے۔ میری گود ہری کردے۔!"

وہ اپنی اس آرزو کی تکمیل کی خاطر پیروں فقیروں کے پاس بھی جاتے اور جہاں کسی خدا رسیدہ بزرگ کا پتا چلتا اس کی خدمت میں حاضر ہوتے تاکہ وہ ان کے لیے دعا کرے۔ اسی زمانے میں ایک پہنچے ہوئے بزرگ کی کرامات کا بہت چرچا تھا جس کا نام رحمکار تھا اور جو کاکا صاحب کے نام سے مشہور تھا۔ اس بزرگ کے عقیدت مندوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا اور لوگ دور دور سے اپنی حاجتیں پوری کرنے کے لیے اس کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس بزرگ کی دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔ عیسیٰ خان نے بھی ایک روز اپنی بیوی سے کہا۔

"ہمیں بھی کاکا صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا چاہیے۔؟"

بیوی تو شوہر سے بھی زیادہ اولاد کو ترسی ہوئی تھی۔ اس کی ممتا تو اس آس میں تڑپ رہی تھی کہ اس کی گود میں بھی کوئی بچہ ہنسے روئے اور شرارتیں کرے۔ اس نے تو خود کئی بار سوچا تھا کہ عیسیٰ خان سے کاکا صاحب کے پاس چلنے کو کہے لیکن وہ اس کی سخت طبیعت کی وجہ سے خاموش ہو جاتی تھی لیکن اب جب کہ اس نے خود ہی یہ بات کہی تھی تو اس نے فوراً اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

"ہمیں ان کے پاس ضرور چلنا چاہیے۔ ان کی کرامتوں کا چرچا ہر کوئی کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے انھی کی دعا سے اللہ ہماری سن لے اور میری گود ہری ہو جائے۔"

پھر ایک روز وہ دونوں اسی ارادے سے کاکا صاحب کے آستانے پر پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر عیسیٰ خان نے بڑی عاجزی اور انکساری سے سلام کیا اور پھر عرض کی۔

"حضور! میرے حق میں دعا کیجیے تا کہ اللہ مجھے اولاد کی نعمت عطا کر دے۔ میں ابھی تک اس سے محروم ہوں۔ اور اسی لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں کہ آپ میرے لیے دعا کریں۔"

یہ کہہ کر وہ دونوں ایک طرف بیٹھ گئے۔ اتنے میں ہوا یہ کہ کاکا صاحب کا ایک مرید آپ کے لیے انجیر کے چند دانے لے کر آیا تو انھوں نے یہ انجیریں عیسیٰ خان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لیجیے۔ آپ بھی چکھیے---!"

عیسیٰ خان نے ہاتھ بڑھا کر ان میں سے دو دانے اٹھا لیے اور کہا۔

"حضور گرمی کا موسم ہے میرے لیے دو دانے ہی کافی ہیں--- شکریہ---"

اس پر حضرت کاکا صاحب نے فرمایا۔

"چلو جی آپ کی مرضی--- دو کافی ہیں تو دو ہی سہی۔"

اس کے بعد انھوں نے عیسیٰ خان کے لیے اللہ کے حضور میں دعا کی جو قبول ہوئی۔ عیسیٰ خان اور اس کی بیوی کاکا صاحب کو سلام کر کے رخصت لے کر چلے آئے اور چند ہی روز میں اس کی بیوی امید سے ہو گئی۔ پھر وہ وقت بھی آ گیا جب ان کے ہاں ایک خوبصورت بیٹا پیدا ہوا جس کے آتے ہی عیسیٰ خان کی امیدوں کے ویران چمن میں گویا بہار آ گئی۔ خوب خوشیاں منائی گئیں اور پورے قبیلے کی دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ اپنے سردار کی خوشیوں میں ہر شخص شریک تھا اور بڑی دھوم دھام سے بچے کی پیدائش پر جشن منایا گیا۔ عیسیٰ خان نے اپنے بیٹے کا نام موسیٰ خان رکھا اور یہ داستان اسی موسیٰ خان اور اس کی محبوبہ کے گرد گھومتی ہے جسے صوبہ سرحد کے لوگ آج بھی رات کو حجروں میں بیٹھ کر سنتے سناتے ہیں۔

موسیٰ خان ذرا بڑا ہوا تو عیسیٰ خان کو اس کی تعلیم و تربیت کی فکر ہوئی۔ یوں تو اس کے

اپنے علاقے میں اساتذہ اور علما کی کمی نہ تھی' ایک سے ایک بڑھ کے عالم و فاضل موجود تھا لیکن عیسیٰ خان چاہتا تھا کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو کسی ایسے عالم کی شاگردی اور سرپرستی میں دے جو علم و فضل میں یکتا ہو۔ جس کے علم' عظمت اور وقار کا ہر کوئی معترف ہو۔ اس نے کچھ روز تک ادھر ادھر کے علاقوں کا جائزہ لیا' اپنی زیر حکومت علاقے میں رہنے والے علماء کے بارے میں غور کیا مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس طرح جب وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا تو اس نے مصاحبوں سے مشورہ کیا تو سب نے یہی رائے دی کہ۔

"موسیٰ خان کو ملا شمس الاسلام کے مدرسے میں بھیجا جائے۔"

یہ مدرسہ اس زمانے میں مشہور درس گاہ تھی اور ملا شمس الاسلام ایک مشہور عالم دین تھے جن کے علم و فضل کا بڑا شہرہ تھا اور ہر جگہ لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔ ان کے مدرسے میں دین اور دنیا دونوں علوم کی تعلیم دی جاتی تھی جہاں پڑھنے کے لیے دور دور سے لڑکے اور لڑکیاں آتے تھے۔ اس درسگاہ کی اتنی شہرت تھی کہ ہر ماں باپ اپنے بچوں کو وہاں تعلیم دلوانے کی تمنا رکھتے تھے۔ یہ مدرسہ اس علاقے میں واقع نہیں تھا جس پر عیسیٰ خان کی حکومت تھی بلکہ وہاں ایک دوسرے سردار شاہ مست خان کی حکمرانی تھی اور اس کا دارالحکومت سپین ترین تھا۔ یہ دونوں سلطنتیں ساتھ ساتھ واقع تھیں اور لوگ اپنی ضرورتوں کے لیے ادھر سے ادھر آتے جاتے تھے۔ ویسے بھی دونوں طرف کے لوگوں میں آپس کی دوستیاں اور رشتہ داریاں تھیں چنانچہ اس نے اپنے چہیتے بیٹے موسیٰ خان کو ملا شمس الاسلام کے مدرسے میں ڈال دیا تاکہ وہ تعلیم کے زیور سے اچھی طرح آراستہ ہو جائے۔ اس کے ساتھ اس کے دو تین دوستوں کو بھی وہاں داخل کرا دیا اور اس طرح موسیٰ خان اکیلا مدرسہ جانے کی بجائے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کے پڑھنے کے لیے جانے لگا۔ دوست ایک ساتھ مدرسہ میں جاتے اور اکٹھے واپس آتے۔ وہ روزانہ صبح سپین ترین چلے جاتے اور دوپہر بعد جب مدرسے میں چھٹی ہوتی تو واپس آ جاتے۔ پھر جب موسیٰ خان جوانی کی منزل کے قریب پہنچنے والا تھا تو اس کے باپ نے اسے گھڑسواری' شمشیرزنی اور سپہ گری کے علاوہ دیگر فن

سکھانے کا انتظام کر دیا' اس طرح وہ تعلیم بھی حاصل کر رہا تھا اور سپہ گری بھی سیکھ رہا تھا کیونکہ وہ حکمران سردار کا اکلوتا بیٹا تھا اور آگے چل کر اسے اپنے باپ کی جگہ لینی تھی۔

جس مدرسے میں موسیٰ خان پڑھتا تھا اسی میں گل مکئی بھی داخل تھی اور دوسرے لڑکے لڑکیوں کے ساتھ وہ بھی وہاں زیر تعلیم تھی۔ گل مکئی سپین ترین کی حسین ترین لڑکی تھی۔ وہ صرف حسین ہی نہیں بلکہ ذہین بھی تھی۔ وہ وہاں کے حکمران سردار شاہ مست خان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ یوں تو اس مدرسے میں بہت سے طالب علم تھے اور ایک سے ایک خوش شکل بھی تھا لیکن گل مکئی کے دل میں موسیٰ خان گھر کر گیا تھا۔ وہ اپنی چال ڈھال اور اپنے انداز میں سب سے الگ تھلگ نظر آتا تھا۔ جب بات کرتا تو گل مکئی اسے دیکھتی رہ جاتی اور اس کا دل چاہتا' اسی طرح باتیں کرتا رہے۔ اسے ہنستا ہوا دیکھ کر اس کے دل میں ہزاروں جذبے جاگ اٹھتے تھے۔ کچھ یہی حال موسیٰ خان کا بھی تھا۔ وہ وقت بے وقت گل مکئی کو دیکھتا رہتا تھا اور کسی نہ کسی بہانے اس سے بات کرنے کی کوشش میں رہتا تھا۔ گل مکئی کا حسن اس کے دل و دماغ کو مسحور کیے ہوئے تھا۔

اسی مدرسے میں ایک اور نوجوان بھی پڑھتا تھا جس کا نام سہیل تھا۔ وہ گل مکئی کا چچا زاد تھا اور اس کا منگیتر بھی تھا لیکن منگیتر ہونے کے باوجود گل مکئی کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تو ہر وقت موسیٰ خان کی تصویر رہتی تھی اور وہ اسی کے تصور میں کھوئی رہتی تھی۔ سہیل اپنے طور پر بڑی کوشش کرتا تھا کہ اس کی توجہ اپنی طرف کرے کیونکہ وہ اس کا منگیتر تھا اور اس کا خیال تھا' ایک نہ ایک روز گل مکئی اسی کی ہوگی اس لیے وہ اس سے بڑی محبت سے پیش آتا تھا مگر اس کی یہ کوششیں بے فائدہ ثابت ہوتی تھیں۔ گل مکئی اس کی طرف قطعی توجہ نہ دیتی تھی بلکہ وہ جس قدر اس سے محبت کا اظہار کرتا' یہ اسی قدر اس سے نفرت کرتی تھی' تاہم وہ اس کا رشتہ دار بھی تھا اور منگیتر بھی تھا اس لیے وہ کھل کے اپنی نفرت کا اظہار نہیں کر سکتی تھی حالانکہ وہ دونوں ایک ہی قبیلے اور ایک ہی خاندان سے تھے' پھر بھی دونوں کے درمیان دوری تھی۔ سہیل یہ بات بھی اچھی طرح سمجھتا تھا کہ گل مکئی اور موسیٰ

خان ایک دوسرے کی طرف مائل ہیں، مائل ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتے ہیں لیکن وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ موسیٰ خان یوں بھی مدرسے میں سب سے زیادہ مقبول طالب علم تھا، پھر وہ گل مکئی کا محبوب نظر بھی تھا اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کا دوست بنا ہوا تھا۔ وہ تینوں اکثر اکٹھے گھومتے نظر آتے تھے اور سپین ترین کے ساتھ بہنے والی ندی کے کنارے چہل قدمی کرتے تھے۔ ایک روز وہ تینوں ندی کے کنارے گھوم رہے تھے کہ اچانک گل مکئی کا پاؤں پھسلا اور دیکھتے ہی دیکھتے ندی کی تیز رو لہروں میں جا گری اور شور کرنے لگی۔

"بچاؤ۔ بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔!"

اس وقت بجائے اس کے کہ سہیل گل مکئی کو ڈوبنے سے بچانے کی کوشش کرتا، اس نے بچاؤ بچاؤ کا شور کرتے ہوئے لوگوں کو مدد کے لیے پکارنا شروع کر دیا لیکن جیسے ہی موسیٰ خان نے دیکھا کہ گل مکئی ندی کی تیز لہروں میں غوطے کھاتے ہوئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے تو اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور ندی میں کود گیا۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے تیرتا ہوا گل مکئی کے پاس پہنچ گیا اور تھوڑی ہی دیر میں اسے ندی سے نکال کے باہر لے آیا۔ ادھر سہیل تھا کہ ابھی تک لوگوں کو مدد کے لیے پکار رہا تھا جب کہ موسیٰ خان اپنی جان پر کھیل کر اسے ندی سے نکال بھی لایا تھا۔ اتنے میں وہاں بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے جن میں گل مکئی کا باپ سردار شاہ مست خان بھی شامل تھا۔ وہ بھی شور سن کر گھبرایا ہوا آ گیا تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس کی بیٹی صحیح سلامت ہے تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ موسیٰ خان کی بہادری پر بڑا خوش ہوا اور آگے بڑھ کے اسے گلے سے لگا کر کہنے لگا۔

"شاباش بہادر بیٹے۔۔۔ تم نے میری بیٹی کو نئی زندگی دی ہے۔"

ایک شاہ مست خان ہی نہیں اس وقت وہاں پر موجود ہر شخص موسیٰ خان کی ہمت اور بہادری کی تعریف کر رہا تھا جسے سن سن کر سہیل ندامت سے ڈوبا جا رہا تھا۔ وہ تو پہلے ہی اپنے دل ہی دل میں اس سے نفرت کرتا تھا اور اب جب کہ اس کی بہادری کی ہر کوئی تعریف کر رہا تھا تو اس کی نفرت اور بڑھ گئی تھی۔ موسیٰ خان اسے بری طرح کھٹکنے لگا تھا۔ وہ دل میں کوئی

ایسی تجویز سوچنے لگا جس سے موسیٰ خان کو شکست دے کر اپنی خفت کم کر سکے۔ یہی کچھ سوچ کر ایک روز وہ اس سے کہنے لگا۔

"تمہاری نشانہ بازی کی بڑی شہرت ہے۔۔۔ ذرا مجھ سے مقابلہ کر کے دیکھو۔؟"

"مجھے تمہاری دعوت منظور ہے۔"

یہ موسیٰ خان کا جواب تھا، جس پر سہیل بولا۔

"اڑتی چڑیا کو غلیل سے مار گرانا ہو گا۔؟"

"ٹھیک ہے۔۔۔۔ وقت اور دن طے کر لو!"

موسیٰ خان نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ چنانچہ اسی وقت سے اس بات کا چرچا ہونے لگا کہ سہیل اور موسیٰ خان کے درمیان اڑتی چڑیا کو غلیل سے مار گرانے کا مقابلہ ہو گا۔ پھر ایک روز مقررہ وقت پر مدرسے کے تمام طلبہ اور دوسرے لوگ ایک میدان میں جمع ہو گئے۔ ہر شخص منتظر تھا کہ دیکھیں دونوں میں سے برتری کسے حاصل ہوتی ہے۔؟ موسیٰ خان نے سہیل سے کہا۔

"چونکہ مقابلے کی دعوت تم نے دی ہے اس لیے پہلے تم میدان میں آؤ؟"

"جیسے تمہاری مرضی۔"

یہ کہتے ہوئے سہیل آگے بڑھا۔ وہ تو پہلے ہی سے تیار کھڑا تھا۔ اس نے اسی وقت اپنی غلیل سنبھالی اور اس میں ایک پتھر رکھ کر اڑتی ہوئی چڑیا کی طرف چلایا مگر نشانہ خالی گیا۔ یہ دیکھ کر اس نے قدرے خفت سے غلیل میں دوسرا پتھر جمایا اور فضا میں اڑتی ہوئی ایک چڑیا کا نشانہ باندھ کر چھوڑا۔ بدقسمتی سے وہ بھی خالی گیا۔ یہ دیکھ کر ارد گرد کھڑے لوگ ہنسنے لگے۔ اب تو سہیل واقعی بہت شرمندہ ہو رہا تھا اور اسے اپنے آپ پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ اس نے تلملا کر تیسری بار غلیل میں پتھر جمایا اور ایک اڑتی ہوئی چڑیا کا نشانہ تاک کر چھوڑ دیا۔ اسے یقین تھا کہ اس بار تو اس کا نشانہ خطا نہیں جائے گا لیکن وہ پتھر بھی چڑیا کے نہ لگا اور چڑیا اڑتی ہوئی فضا میں غائب ہو گئی۔ یہ دیکھ کر مجبوراً سہیل نے موسیٰ خان سے کہا۔

"تو اب تمہاری باری ہے۔"

اس کے ساتھ ہی تمام لوگوں کی نظریں موسیٰ خان پر لگ گئیں۔ خاص طور پر گل مکئی کا دل تو بری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں موسیٰ خان کی کامیابی کے لیے دعائیں مانگ رہی تھی۔ مدرسے کے دوسرے طلبہ جو وہاں جمع تھے' ان میں سے بھی زیادہ تر کی یہی تمنا تھی کہ موسیٰ خان کو کامیاب دیکھیں کیونکہ وہ ان سب کا اچھا دوست تھا۔ ادھر جب سہیل نے اسے غلیل چلانے کی دعوت دی تو وہ آہستہ سے آگے بڑھا' پتھر غلیل میں جمایا اور ایک اڑتی ہوئی چڑیا دیکھ کر اس پر چلا دیا۔ پھر لوگوں نے دیکھا کہ پلک جھپکتے میں فضا میں اڑتی ہوئی چڑیا پھڑپھڑاتی ہوئی زمیں پر آگری اور تڑپنے لگی۔ پھر کیا تھا' داد تحسین کے نعروں میں دوسرے طالب علموں نے موسیٰ خان کو کندھوں پر اٹھالیا۔ اس وقت یوں تو سارے خوش تھے لیکن پھر بھی گل مکئی کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تیر رہے تھے۔

سہیل کی اس شکست کے بعد تو موسیٰ خان سے اس کی رقابت دشمنی میں بدل گئی اور اب وہ کسی نہ کسی طرح اس سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ جب اسے اور کوئی صورت نظر نہ آئی تو اس نے اپنی ماں کو موسیٰ خان اور گل مکئی کے عشق کے بارے میں بڑھا چڑھا کر بتایا اور پھر کہا۔

"اسے یہ تو سوچنا چاہیے تھا کہ گل مکئی میری منگیتر ہے۔ اگر یہ نہیں تو شاہ مست خان کی عزت و ناموس کا خیال تو کرنا ہی چاہیے تھا۔؟"

اس کی ماں تو جیسے پہلے ہی منتظر بیٹھی تھی' وہ سنتے ہی بولی۔

"اچھا۔۔۔یہ بات ہے۔؟"

وہ اسی وقت اٹھی اور سیدھی گل مکئی کی ماں کے پاس پہنچ گئی۔ وہاں جا کر اس نے اس کی ماں کو یہ باتیں مزید مرچ مسالا لگا کر بتائیں اور اسے خوب بھڑکایا۔ ادھر جب رات کو شاہ مست خان گھر آیا تو اس کی بیوی نے جو باتیں سنی تھیں' وہ اس کو بھی بتائیں جنھیں سن کر شاہ

مست خان آگ بگولا ہو گیا اور غصے میں کہا۔

"اسے ماں باپ کی عزت کا بھی خیال نہیں۔۔۔؟ لعنت ہے ایسی اولاد پر۔!"

پھر وہ فیصلہ کن انداز میں بولا۔

"بس کل سے گل مکئ مدرسے نہیں جائے گی۔ اسے گھر سے باہر جانے کی بھی اجازت نہیں ہو گی۔"

اس طرح گل مکئ کا مدرسہ جانا بند کر دیا گیا اور وہ بے پر پرندے کی طرح گھر میں بند تڑپنے لگی۔ ادھر جب موسیٰ خان کو اس کا پتا چلا تو وہ بہت پریشان ہوا۔ اب کیا کرے۔؟ دونوں کی ملاقات کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس کا دل مدرسہ سے اچاٹ ہو گیا۔ وہ تو مدرسہ میں جاتا ہی گل مکئ کے لیے تھا اور جب وہی نہ رہی تو پھر وہاں جانے سے کیا فائدہ۔؟ وہ ہر وقت کھویا کھویا سا رہنے لگا اور گل مکئ سے ملاقات کی کوئی سبیل نکالنے کی سوچنے لگا مگر مجبوری نے اسے چاروں طرف سے بری طرح گھیر لیا تھا۔ دوسری طرف گل مکئ کے لیے باپ کا گھر قید خانہ بن گیا تھا۔ وہ نہ کہیں آجا سکتی تھی اور نہ کوئی اس سے مل سکتا تھا۔ اس صورت میں اس سے ملاقات کیونکر ہو سکتی تھی۔؟ یہ تو اس کی خوش قسمتی تھی کہ ایک روز گل مکئ کی ملازمہ سلارو اسے مل گئی۔ پہلے تو اس نے گل مکئ کا حال دریافت کیا اور پھر اسے اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اس کا خط گل مکئ تک پہنچا دے۔ پہلے تو وہ شاہ مست خان کے خوف کی وجہ سے راضی نہ ہوئی اور خط لے جانے سے انکار کر دیا لیکن بعد میں اس نے ہامی بھر لی کیونکہ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ گل مکئ بھی بری طرح تڑپ رہی ہے۔ وہ اسے بہت چاہتی تھی اور اس کی حالت دیکھ دیکھ کر پریشان تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خط لے جانے پر راضی ہو گئی اور پھر جب اس نے وہ خط لے جا کر گل مکئ کو دیا تو اس میں گویا نئی زندگی آ گئی۔ وہ خوشی میں دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔ اور پھر اسی طرح دونوں میں خط و کتابت کا سلسلہ چل نکلا۔

کہتے ہیں، خوش بختی اور بدقسمتی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب آ جائے گی۔ کبھی کبھی مہربان وقت بھی انسان کے لیے بے رحم بن جاتا ہے اور یہی کچھ موسیٰ خان کے

ساتھ ہوا۔ ایک روز اس نے گل مکئی کے نام خط لکھ کر اپنی کتاب میں رکھ لیا کیونکہ اس روز اسے سلارو کے ملنے کی امید تھی۔ اس نے خط کتاب میں اس لیے رکھ لیا تھا کہ وہ ملے گی تو اسے دے دے گا لیکن پوری احتیاط کے باوجود مدرسہ میں آتے وقت وہ خط کہیں گر گیا اور سہیل کے ہاتھ لگ گیا۔ اسے اور کیا چاہیے تھا۔؟ وہ تو خط دیکھ کر خوشی میں اچھل پڑا۔

"اب کہاں بچ کے جائے گا۔"

وہ اسی وقت بھاگا بھاگا شاہ مست خان کے پاس گیا اور اسے وہ خط پیش کرتے ہوئے بولا۔

"یہ دیکھیے بابا۔ موسیٰ خان اور گل مکئی کیا گل کھلا رہے ہیں۔؟!"

پھر وہ مشورے کے انداز میں کہنے لگا۔

"جلدی کوئی قدم اٹھائیے۔ ورنہ قبیلے میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے؟"

شاہ مست خان تو پہلے ہی تپا ہوا بیٹھا تھا' اس نے گل مکئی کے نام موسیٰ خان کا عشقیہ خط دیکھا تو اور بھی مشتعل ہو گیا۔ غصے میں دانت پیستے ہوئے آہستہ سے بولا۔

"اب واقعی اس کا کچھ کرنا پڑے گا۔۔ یہ تو حد سے بڑھ چکا ہے۔"

دونوں نے ایک دوسرے سے مشورہ کیا اور طے یہ پایا کہ فلاں دن جب موسیٰ مدرسے سے چھٹی کر کے جائے تو اس کا کام تمام کر دیا جائے اور اس طرح یہ ٹنٹا ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ انھوں نے آپس میں یہ بھی طے کیا کہ اس کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن اتفاق سے اس وقت گل مکئی کی ملازمہ سلارو قریب ہی کھڑی تھی' اس نے ان کی باتیں سن لیں اور اسے ان کے اس منصوبے کی خبر ہو گئی' وہ موقع پا کر موسیٰ خان کے پاس گئی اور اسے شاہ مست خان اور سہیل کے ارادوں کے بارے میں سب کچھ بتا دیا اور تاکید کرتے ہوئے کہا۔

"اس دن تمہیں پوری طرح ہوشیار رہنا ہو گا۔۔"

"تم بے فکر رہو!"

یوں تو موسیٰ خان پہلے ہی بہت چوکنا رہتا تھا مگر سلارو کی اطلاع کے بعد وہ اور بھی

ہوشیار رہنے لگا۔ پھر جب مقررہ دن آیا تو وہ وقت سے بہت پہلے ہی چھٹی کر کے مدرسے سے چلا گیا۔ ادھر شاہ مست خان اور سہیل اپنے چند آدمیوں کے ساتھ جب مدرسہ پہنچے اور انھیں یہ علم ہوا کہ موسیٰ خان مدرسے سے جا چکا ہے تو وہ بڑے تلملائے اور ناکامی میں ہاتھ ملتے رہ گئے۔

"اب کیا کرنا چاہیے۔؟ وہ تو نکل گیا!!!"

انھوں نے آپس میں مشورہ کیا' کچھ دیر غور و فکر کرنے کے بعد ایک تاریخ مقرر کی تا کہ موسیٰ خان پر شب خون مارا جائے لیکن کسی نہ کسی طرح یہ خبر بھی اس تک پہنچ گئی چنانچہ جب وہ رات آئی اور شاہ مست خان اور سہیل اپنے ہمراہیوں کے ساتھ شب خون مارنے گئے تو یہ دیکھ کر حیران و پریشان ہو گئے کہ آگے موسیٰ خان اپنے لشکر کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے مستعد کھڑا تھا۔ اس طرح شب و خون کی نوبت تو نہ آ سکی البتہ دونوں طرف سے جنگ چھڑ گئی۔ شاہ مست خان کے ذہن میں تو یہ تھا کہ وہ اچانک شب خون ماریں گے اور موسیٰ خان کو ہلاک کر کے چلے آئیں گے مگر ان کا یہ منصوبہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔ یہاں تک کہ انھوں نے پسپائی اختیار کی اور وہاں سے بھاگ نکلے۔ اس افراتفری اور آپا دھاپی میں سہیل گرفتار ہو گیا جسے موسیٰ خان نے قتل کرنا چاہا لیکن اس نے ہاتھ پاؤں جوڑ کے اپنی جان بخشی کرالی اور وعدہ کیا کہ۔

"میں تمہارا وفادار دوست رہوں گا۔"

موسیٰ خان کشادہ دل آدمی تھا' اس نے سہیل کے اس وعدے پر اسے چھوڑ دیا مگر اس کے دل میں کچھ اور تھا اور لبوں پر جھوٹے الفاظ تھے۔ وہ موسیٰ خان سے رہائی پانے کے بعد بھی اس کا اسی طرح دشمن تھا بلکہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ تھا۔

یہ واقعہ پیش آئے عرصہ بیت گیا تھا اور دونوں قبیلوں کے درمیان جو دشمنی پیدا ہو گئی تھی وہ روز بروز بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ کئی بار صلح کی کوشش ہوئی مگر بے سود گئی۔ آخر جب بڑے بوڑھوں نے یہ دیکھا کہ دونوں طرف سے مفاہمت ہونے کی کوئی امید نہیں تو وہ

درمیان میں پڑے۔ انھوں نے شاہ مست خان اور عیسیٰ خان کے درمیان صلح صفائی کرادی۔ اس طرح دونوں قبیلوں میں صلح تو ہو گئی لیکن موسیٰ خان اور گل مکئی کی ملاقات کے سلسلے میں کوئی سبیل پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھنے کے لیے اسی طرح تڑپ رہے تھے۔

ایک دن ہوا یہ کہ موسیٰ خان کا ایک چرواہا بکریاں چراتا ہوا بے دھیانی میں شاہ مست خان کے علاقے کی حدود میں چلا گیا اور وہاں اپنی بکریاں چرانے لگا۔ اتفاق سے ادھر سے سہیل کا گزر ہوا تو اس نے اسے دیکھا۔ وہ آگے بڑھا اور اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"تم ہمارے علاقے میں بکریاں کیوں چرا رہے ہو۔؟"

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے دو چار آدمیوں کو بلایا اور چرواہے کو خوب مارا پیٹا۔ پھر اسے اپنے علاقے سے نکال دیا اور تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔

"آئندہ اگر تم ہمارے علاقے میں آئے تو زندہ واپس نہیں جاؤ گے!"

چرواہا بیچارہ روتا پیٹتا موسیٰ خان کے پاس گیا اور اسے ساری روداد سنائی جسے سن کر وہ طیش میں آگیا اور غصے میں مٹھیاں بھینچ کر بولا۔

"اس بزدل کی یہ ہمت کہ میرے آدمی کو مارے۔!؟"

وہ غصے میں بھرا ہوا اسی طرف چل دیا جہاں چرواہے کو پیٹا گیا تھا۔ اتفاق کی بات کہ سہیل ابھی تک وہیں ادھر ادھر گھوم پھر رہا تھا۔ موسیٰ خان اسے للکارتے ہوئے' آگے بڑھا اور اس کے قریب پہنچ کر تلوار سونت لی۔ جیسے ہی سہیل نے اسے اس طرح غیض و غضب میں دیکھا تو سمجھ گیا کہ موسیٰ خان اسے نہیں چھوڑے گا۔ اس نے فوراً چالاکی سے کام لیا آگے بڑھ کے دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور قسم کھاتے ہوئے کہنے لگا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ چرواہا آپ کا ہے۔ ادھر چونکہ خواتین آتی جاتی ہیں اس لیے میں نے اسے بھگا دیا تھا"۔

پھر وہ بڑی نرمی سے بولا۔

"یہ سب کچھ غلط فہمی میں ہوا۔ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں"۔

موسیٰ خان بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ نیک طبیعت کا مالک بھی تھا' اس نے جب یہ دیکھا کہ سہیل اپنے کیے پر پچھتا رہا ہے اور معافی بھی مانگ رہا ہے تو اسے معاف کر دیا۔ یہ ٹھیک ہے اس نے سہیل کو معاف کر دیا تھا لیکن اس واقعہ سے دونوں طرف کی دبی ہوئی دشمنی ایک بار پھر ابھر کر سامنے آ گئی۔ شاہ مست خان تو پہلے ہی اپنی پرانی شکست کا بدلہ لینے کے لیے موقع کا منتظر تھا اور کسی ایسے بہانے کی تلاش میں تھا جس کے سہارے اپنی تمنا پوری کر سکے چنانچہ جب سہیل نے جا کر اسے اس تازہ واقعہ کے بارے میں بتایا تو وہ اور بھی کھول گیا لیکن اس نے حکمت عملی سے کام لینے کا منصوبہ بنایا۔ سہیل 'گل مکئ کا منگیتر تو تھا ہی' اس نے فوراً دونوں کی شادی کی تاریخ مقرر کر دی اور شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے چند اپنے خاص آدمیوں کے ساتھ یہ طے کیا کہ۔

"موسیٰ خان کو بھی شادی میں بلایا جائے گا' جب بارات کے ہنگامے میں خوشی سے ہوائی فائر کیے جائیں تو اسی میں موسیٰ خان کو ختم کر دیا جائے۔ اس طرح کسی کو پتا بھی نہیں چل سکے گا کہ وہ کس کی گولی سے ہلاک ہوا ہے"۔

ادھر گل مکئ اپنی شادی کا سن کر بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ اسے ایسے لگ رہا تھا جیسے اس کی موت کا سامان کیا جا رہا ہے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے اور کدھر جائے۔ امید کا ہر دروازہ بند ہوتا جا رہا تھا۔ مایوسی کے اسی عالم میں ایک روز سلا رو نے آ کر اس کے کان میں کچھ کہا جسے سنتے ہی گل مکئ کے تن بدن میں نئی زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ اس کی بجھی بجھی آنکھوں میں روشنی کی چمک آ گئی۔

پھر بہت جلد وہ وقت بھی آ گیا جب گل مکئ کی بارات آ گئی۔ شاہ مست خان کے گھر کے اندر باہر ایک ہنگامے کا عالم تھا۔ خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ ڈھول تاشوں کی آوازیں گونج رہی تھیں' ٹپے گائے جا رہے تھے' شہنائیاں بج رہی تھیں اور رباب بجانے والے اپنی اپنی دھنیں بکھیر رہے تھے لوگ ٹولیوں میں بٹے ادھر ادھر بیٹھے تھے اور حقے کا دور چل رہا تھا۔ شاہ

مست خان کا حجرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جس میں بیٹھے ہوئے لوگ حقہ پی رہے تھے اور نسوار کی ڈبیا پر ڈبیا خالی کر رہے تھے۔ انہی مہمانوں میں موسیٰ خان بھی شامل تھا جو حجرے میں ایک طرف بیٹھا ہوا تھا۔ شاہ مست خان کا خیال تھا کہ وہ اکیلا ہے اس لیے اس کا کام تمام کر دینا آسان ہو گا مگر موسیٰ خان بھی کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا۔ وہ اپنے ساتھ کئی آدمی بھی لایا تھا جو جنگ و جدل میں ماہر تھے اور یہ سارے جانباز پوری طرح مسلح تھے۔ لوگ حجرے میں آنے کی بجائے بستی سے باہر کھیتوں میں چھپے بیٹھے تھے اور اس بات کے منتظر تھے کہ کب انھیں اشارہ ملے اور وہ دشمن پر ٹوٹ پڑیں۔ ادھر تو یہ لوگ ہوشیار چھپے بیٹھے تھے اور دوسری جانب موسیٰ خان شادی کے ہنگامے میں شریک تھا لیکن وہ بھی کسی آنے والے وقت کے انتظار میں حجرے کے ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ پھر جب رقص و سرود کی محفل اپنے عروج پر پہنچی تو وہ خاموشی سے اٹھا اور سب کی آنکھ بچا کر حجرے سے نکل گیا۔ لوگ اس وقت شادی کی خوشیوں میں برپا ہونے والی رقص و سرور کی محفل میں اس قدر محو تھے کہ کسی کو خبر تک نہ ہو سکی کہ موسیٰ خان وہاں سے چلا گیا ہے۔ وہ حجرے سے نکلا اور لوگوں کی نظروں سے بچتا بچاتا شاہ مست خان کے مکان کے پچھواڑے پہنچ گیا۔ وہاں جا کر اس نے دیکھا تو گل مکئی اس کی منتظر کھڑی تھی اور قریب ہی سلا رو ایک گھوڑے کی باگ پکڑے ہوئے تھی۔ موسیٰ خان کو دیکھتے ہی گل مکئی دیوانہ وار اس کی طرف لپکی مگر سلا رو آہستہ سے بولی۔

”یہ وقت باتیں کرنے اور حال بیان کرنے کا نہیں ہے۔“

پھر اس نے موسیٰ خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

موسیٰ خان گھوڑا تیار ہے۔ جس قدر جلد ہو سکے گل مکئی کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔“

اور پھر، چند ہی لمحوں بعد شاہ مست خان کے مکان کے پچھواڑے تاریکی کے سوا کچھ نہ تھا۔ دوسری جانب شادی کے ہنگامے کی محفل زوروں پر تھی کہ اچانک گھر میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ پھر یہی چہ میگوئیاں شور میں بدل گئیں۔ ہر ایک کے لب پر یہی تھا۔

”دلہن غائب ہو گئی۔۔۔ گل مکئی کہیں چلی گئی۔“

بجتے ہوئے ڈھول تاشے خاموش ہو گئے' شہنائیوں کا گلا گھٹ گیا اور ربابوں کے جیسے تار ٹوٹ کر بکھر گئے۔ ساری محفل پر سکتہ آ گیا۔ ہر شخص حیران و پریشان ہو کر ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ سہیل نے حجرے کا جائزہ لیا تو موسیٰ خان غائب تھا۔ یہ دیکھتے ہی وہ ساری بات سمجھ گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"فوراً اٹھو ابھی وہ زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔ ہماری عزت پر ہاتھ ڈالنے والے کو زندہ نہیں رہنا چاہیے۔"

موسیٰ خان کا خیال تھا کہ وہ گھوڑا سرپٹ دوڑاتا ہوا بہت جلد پیین ترین کی حدود سے باہر نکل جائے گا اور ان کا تعاقب کرنے والے انھیں پکڑ نہ سکیں گے لیکن یہاں بھی ایک بار پھر بدقسمتی اس کے آڑے آ گئی۔ رات ہو چکی تھی اور چاروں طرف اندھیرا پھیل گیا تھا جس کی وجہ سے راستہ صحیح طور پر بجھائی نہ دیتا تھا۔ وہ گھوڑا تیزی سے دوڑاتے چلا جا رہا تھا کہ اچانک گھوڑے کو ایک پتھر سے ٹھوکر لگی اور وہ چکرا کے گر پڑا۔ صرف گرا ہی نہیں بلکہ گرنے کے ساتھ ہی اس نے تھوڑی دیر تک ہاتھ پاؤں مارے' چند لمحے تڑپا اور اس کے بعد دم توڑ دیا۔

"افوہ خدایا! یہ تو بہت برا ہوا۔!"

گل ملئ گھبرا گئی۔ اس وقت موسیٰ خان بھی فکر مند تھا کیونکہ ان کا تعاقب ہونا یقینی بات تھی۔ وہ پریشان کھڑے تھے کہ انھوں نے دور سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنی جو لحہ بہ لحہ قریب آ رہی تھی۔ اس وقت موسیٰ خان کی سمجھ میں اور تو کچھ نہ آسکا' اس نے جلدی سے گل ملئ کو ایک درخت کی آڑ میں چھپایا اور خود اس نئی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ابھی زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ شاہ مست خان اور سہیل آن پہنچے اور انھوں نے للکارتے ہوئے موسیٰ خان پر حملہ کر دیا اس عرصہ میں موسیٰ خان بھی سنبھل چکا تھا اور تلوار سونتے ہوئے تیار کھڑا تھا' وہ بھی ڈٹ کے مقابلے پر آ گیا۔ اس وقت وہ اکیلا تھا اور بڑی بہادری اور دلیری سے مقابلہ کر رہا تھا مگر کب تک تن تنہا ان سے لڑتا رہتا۔؟ آخر اسے

سہیل کی ایک ایسی کاری ضرب لگی کہ وہ زمین پر گر پڑا اسے گرتے دیکھ کر سہیل بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھا تا کہ گرے ہوئے موسیٰ خان پر تلوار کا وار کر کے اسے ختم کر دے لیکن اس وقت دو سچے عاشقوں پر قدرت مہربان ہو گئی' عین اسی لمحے گل مکئی نے ایک پتھر اٹھایا اور درخت کی آڑ سے سہیل پر دے مارا۔ یہ اچانک حملہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا للذا جیسے ہی اسے بھاری پتھر لگا اس کے ہاتھ سے تلوار گر گئی اس کے ساتھ ہی گل مکئی بڑی پھرتی سے آگے بڑھی اور اس کی تلوار اٹھا کر گرجتی ہوئی بولی۔

"اب تمہیں کوئی نہیں بچا سکتا!"

اس کے ساتھ ہی اس نے سہیل پر ایسا بھرپور وار کیا کہ وہ زمین پر گر کے بری طرح تڑپنے لگا۔ اسی اثنا میں موسیٰ خان بھی سنبھل چکا تھا اور اس کے وہ ساتھی بھی وہاں پہنچ گئے تھے جنھیں اس نے گاؤں کے باہر کھیتوں میں چھپایا تھا۔ شاہ مست خان نے جب یہ دیکھا کہ موسیٰ خان کے ساتھی بھی پہنچ گئے ہیں تو اس نے جان لیا کہ اب ان کا مقابلہ کرنا بہت مشکل ہے۔ یہی سوچ کر اس نے اپنے آدمیوں کو ساتھ لیا اور جان بچا کر بھاگ نکلا۔ اس طرح موسیٰ خان گل مکئی کو لے کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس گاؤں آ گیا جہاں اس کی مرہم پٹی کی گئی کیونکہ وہ زخمی ہو گیا تھا۔

دو چار دن کے بعد جب موسیٰ خان تندرست ہو گیا تو اب مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ وہ گل مکئی کو شادی کے بغیر تو گھر میں رکھ نہیں سکتا تھا۔ یہ دونوں خاندانوں کی عزت اور پٹھانوں کی روایات کے خلاف تھا اس نے اس سلسلے میں گل مکئی سے بات کی تو اس نے کہا۔

"تمہیں شادی کے لیے میرے باپ کو راضی کرنا ہو گا۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔"

"لیکن کیا وہ مان جائے گا۔؟"

موسیٰ خان کے اس سوال پر وہ بولی

"کچھ بھی ہو' یہ تو کرنا ہی پڑے گا۔ شادی کے بغیر تو ہم اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ یہ دونوں قبیلوں کی

عزت کا مسئلہ ہے۔"

دونوں نے اس سلسلے میں غور کیا تو انھیں اندازہ ہوا کہ گھر والوں کو راضی کیے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا چنانچہ موسیٰ خان نے بڑی مشکلوں سے اپنے باپ کو منایا، اپنی ماں کو بھی راضی کیا اور ان کی منت کرتے ہوئے کہا۔

"جو کچھ ہوا سو ہوا۔ اب ہم دونوں کی خوشیاں آپ کے ہاتھ میں ہیں۔ اگر ہم دونوں کی شادی نہ ہوئی تو ہم زندہ نہیں رہیں گے۔"

ماں باپ اپنے اکلوتے بیٹے کے آگے مجبور تھے، انھیں اس کی خوشیوں کی خاطر جھکنا پڑا۔ عیسیٰ خان نے اپنے قبیلے کے چند بوڑھوں کو بلا کر ان سے مشورہ کیا اور پھر چند بزرگوں پر مشتمل ایک جرگہ ترتیب دیا گیا جو شاہ مست خان کے پاس پہنچ گیا۔ انھوں نے اس سے کہا۔

"شاہ مست خان! یہ ٹھیک ہے، موسیٰ خان اور گل مکئی سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے لیکن نوجوانی میں ایسی غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ اب یہ ہم سب کی عزت کا مسئلہ ہے۔"

اتنے بزرگوں کی بات نہ ماننا شاہ مست خان کے لیے بھی مشکل تھا۔ وہ جرگے کی بات رد نہ کر سکتا تھا۔ ادھر جب عیسیٰ خان نے شاہ مست خان کو نرم پڑتے دیکھا تو آگے بڑھ کے بولا۔

"شاہ مست خان! میں تم سے موسیٰ خان اور گل مکئی کی زندگی کی بھیک مانگنے آیا ہوں۔ میری درخواست ہے کہ موسیٰ خان کو اپنی فرزندی میں قبول کر لو!۔"

شاہ مست خان بھی اس وقت مجبور تھا، اس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ مسئلہ زر اور زمین کا نہیں تھا، اس کی اپنی اکلوتی بیٹی کا معاملہ تھا۔ پھر جرگہ کے اتنے بزرگ بھی اصرار کر رہے تھے تو ان کے کہے کا پاس رکھنا بھی ضروری تھا۔ اس نے چند لمحوں تک سوچا، ایک نظر سب کی طرف دیکھا، آہستہ سے اٹھا اور آگے بڑھ کر موسیٰ خان کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

شہی توردلئی

یوسف زئی اور مندڑ پٹھانوں کے دو مشہور قبیلے ہیں اور صوبہ سرحد کی اس عوامی داستان شہی تور دلئی کا تعلق انھی دونوں قبیلوں سے ہے۔ یہ داستان دلے شہی اور تو ردل شہی کے ناموں سے بھی معروف ہے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب برصغیر پر مغلوں کی حکمرانی تھی اور شہنشاہ اکبر کے راج کا دور دور تک ڈنکا بج رہا تھا۔ اگرچہ پورے ہندوستان میں لوگ امن چین کی زندگی بسر کر رہے تھے اور امیر و غریب سبھی اکبر شہنشاہ کے گن گاتے تھے لیکن پشتونوں کے ان دو قبیلوں یوسف زئی اور مندڑ کے درمیان شدید دشمنی تھی۔ یہ دشمنی نئی نہ تھی بلکہ پشت در پشت سے چلی آ رہی تھی جس کے نتیجے میں کئی بار ان میں لڑائیاں ہو چکی تھیں اور متعدد بار خون خرابا ہوا تھا جس میں اب تک بہت سے لوگ مارے جا چکے تھے۔ کئی بار دونوں جانب کے بڑے بوڑھوں نے درمیان میں پڑ کے صلح صفائی کرانا چاہی بلکہ دو چار بار اس کے اچھے نتائج بھی سامنے آئے اور آپس کی اس جنگ و جدل کا سلسلہ ختم ہونے کے امکانات پیدا ہو گئے لیکن اس میں کامیابی نہ ہو سکی۔ کچھ دن امن و امان رہتا اور پھر وہی ایک دوسرے پر حملے اور قتل و غارت کا بازار گرم ہو جاتا۔ اس طرح شہنشاہ اکبر کے عہد

حکومت میں بھی یہ دشمنی چل رہی تھی۔

یہ داستان کچھ اس طرح ہے کہ یوسف زئی قبیلے سے تعلق رکھنے والے دو افراد ایک دوسرے کے چچیرے بھائی تھے جن میں سے ایک کا نام تور دلئی تھا اور دوسرے کا منور تھا۔ یہ دونوں چچیرے بھائی تو تھے ہی مگر ان میں بڑی گہری دوستی بھی تھی اور دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ دونوں ہر وقت ایک ساتھ نظر آتے۔ اکٹھے آتے جاتے اور اکٹھے گھومتے پھرتے۔ جو بھی دیکھتا ان کی دوستی اور محبت کی تعریف کرتا۔ پورے قبیلے میں ان کی دوستی ایک مثال بنی ہوئی تھی۔ انھوں نے آپس میں طے کیا تھا کہ خواہ کچھ بھی ہو زندگی بھر دوستی نبھائیں گے لیکن ان کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔ ایک وقت ایسا آیا جب ان کی اس دوستی میں وقت دیوار بن کے کھڑا ہو گیا۔ یہی نہیں بلکہ ان کی وہی دوستی جس کی لوگ مثال دیا کرتے تھے اب دشمنی میں بدل گئی تھی۔ اب وہ ایک دوسرے کے صرف مخالف ہی نہیں، دشمن بن گئے تھے۔ ایک زمانہ تو وہ تھا جب انھیں ایک ساتھ دیکھ کر لوگ کہتے تھے۔

"کاش! ایسی دوستی اور محبت سب میں پیدا ہو جائے۔"

اور کہاں اب یہ وقت آیا تھا کہ جب لوگ انھیں ایک دوسرے کے مدمقابل دیکھتے تو افسوس کرتے ہوئے کہتے۔

"ان کی دوستی کو کسی کی نظر کھا گئی ہے۔ کہاں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے اور کہاں اب ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آتے ہیں۔"

دونوں کے درمیان اس دشمنی کا سبب زمین کا بٹوارا تھا۔ جب تک ان کے والدین زندہ رہے خاندان میں اتحاد قائم رہا اور یہ دونوں بھی محبت کی زنجیروں میں بندھے رہے مگر جونہی والدین اللہ کو پیارے ہوئے تو جائیداد کی تقسیم پر اختلافات نے سر اٹھایا اور آہستہ آہستہ ان اختلافات نے دشمنی کا روپ دھار لیا۔ ان کے دلوں میں محبت اور برادرانہ پیار کی جگہ کدورتوں اور نفرتوں نے لے لی۔ لوگ ان میں اس تبدیلی پر حیران تھے لیکن جائیداد اور زمین کا مسئلہ ہی ایسا ہوتا ہے جو انسانوں میں دوریاں پیدا کر دیتا ہے۔ وہ تو چچیرے بھائی تھے

جائیداد تو سگے بھائیوں میں بھی جدائی ڈال دیتی ہے۔

تور دلئی جی دار نوجوان تھا جو سپہ گری میں بھی بڑی مہارت رکھتا تھا۔ اسے شکار کا بہت شوق تھا اور زیادہ تر وقت اپنے اسی شوق میں گزارتا تھا۔ اس کے چند قریبی دوست تھے جنھیں وہ ساتھ لے کر اکثر جنگل میں نکل جاتا' پہاڑوں میں گھومتا اور شکار کی تلاش میں گھنٹوں مارا مارا پھرتا۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی دلچسپی یہی تھی۔ اس طرح ایک روز وہ معمول کے مطابق شکار کی خاطر پہاڑوں میں گیا اور شکار کا پیچھا کرتے کرتے ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں راستے میں ایک چراہ گاہ پڑتی تھی اور یہ چراگاہ مندڑ قبیلے کے لوگوں کی ملکیت تھی۔ تور دلئی کا تعلق یوسف زئی قبیلے سے تھا اور ان دونوں میں پرانی دشمنی چلی آ رہی تھی اس لیے مندڑوں کی چراگاہ میں سے گزرنا اپنی موت کو دعوت دینا تھا۔ یہی دیکھ کر اس کے ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ۔

"مندڑوں کی چراگاہ میں سے گزرنا ہمارے لیے مناسب نہیں ہے۔"

جس پر تور دلئی نے جواب دیا۔

"ہم ان کی چراگاہ میں اپنے مویشی تھوڑے چرا رہے ہیں صرف گزرنا ہے اور گزرنے میں کیا حرج ہے؟"

دوستوں نے اسے سمجھایا کہ۔

"دونوں قبیلوں میں پہلے سے دشمنی چلی آ رہی ہے' اگر ہم ان کی چراگاہ میں سے گزرے تو انھیں لڑائی کا بہانہ مل جائے گا۔"

مگر تور دلئی نہ مانا۔ وہ جوانی کے گھمنڈ میں تھا۔ کہنے لگا۔

"دیکھا جائے گا۔۔۔ وہ ہمارا کیا کرلیں گے۔"

جب وہ اپنی ضد پر اڑا رہا اور سمجھانے پر بھی باز نہ آیا تو اس کے کئی ساتھیوں نے واپس چلے جانا ہی مناسب سمجھا اور وہ اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ صرف دو چار بہت قریبی دوست اس کے ساتھ رہ گئے تھے۔ پھر جب وہ مندڑوں کی چراگاہ میں سے گزر رہے تھے تو

وہاں چند چرواہے اپنے مویشی چرا رہے تھے وہ بھاگے بھاگے گئے اور اپنے قبیلے والوں کو بتایا کہ۔

"یوسف زئیوں نے ہماری چراگاہ پر دھاوا بول دیا ہے۔"

پھر کیا تھا۔۔۔؟ مندڑ قبیلے میں جنگ کا نقارہ بج گیا اور ہر شخص مسلح ہو کر چراہ گاہ کی طرف دوڑ پڑا۔ جوان' بوڑھے سبھی نکل آئے ادھر عورتوں نے پانی کے مشکیزے اٹھائے اور وہ بھی اس طرف چل دیں تاکہ جنگ میں زخمی ہونے والوں کی مرہم پٹی کر سکیں اور انھیں پانی پلا سکیں۔ اس وقت مندڑ قبیلے کا ہر شخص للکارتا ہوا گاؤں سے نکل آیا تھا اور کہہ رہا تھا۔

"یوسف زئیوں کو ایسا سبق سکھایا جائے کہ وہ زندگی بھر یاد رکھیں۔"

توردلئی اور اس کے ساتھیوں نے جب یہ دیکھا کہ ان پر مندڑ حملہ کر رہے ہیں تو انھوں نے بھی اپنی تلواریں نکال لیں اور اس طرح تھوڑی ہی دیر میں ہر بھری چراگاہ میدان کار زار بن گئی۔ تور دلئی اور اس کے ساتھی بڑی بہادری سے لڑ رہے تھے۔ انھوں نے مندڑوں کے کئی آدمی موت کے گھاٹ اتار دیے تھے لیکن آخر کب تک وہ چند آدمی اتنی بڑی تعداد کے لوگوں کا مقابلہ کرتے۔؟

چنانچہ توردلئی بھی لڑتے لڑتے زخمی ہو چکا تھا اور ایک جگہ زمین پر گرا ہوا تھا۔ اس وقت شدید پیاس سے اس کا حلق خشک ہو رہا تھا اور زبان پر کانٹے پڑ چکے تھے۔ اتنے میں ایک نوجوان لڑکی پانی کا مشکیزہ لیے اس کے قریب سے گزری تو بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

"پانی۔ میں پیاسا ہوں۔ پانی!"

لڑکی نے اس کی آواز سنی تو رک گئی۔ اس وقت ایسا سماں تھا کہ اپنا پرایا سوچنے کی مہلت نہ تھی۔ لڑکی نے یہ جانے بغیر کون پانی مانگ رہا ہے' جلدی سے مشکیزہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ جیسے ہی وہ مشکیزہ دینے کے لیے آگے بڑھی اور توردلئی کی نظر لڑکی کے چہرے پر پڑی تو اس کے ہاتھوں سے مشکیزہ گرتے گرتے رہ گیا۔ اس کے سامنے ایک ایسی حسین و جمیل دوشیزہ کھڑی تھی جو اس کے وہم و گمان میں نہ آ سکتی تھی۔ اس نے اس قدر خوبصورت لڑکی

کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اگرچہ اس وقت وہ زخموں سے چور تھا اس کے باوجود سب کچھ بھول کر ہکا بکا ہو کر اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ یہی دیکھ کر لڑکی نے کہا۔

"نوجوان! تمہارے ہاتھوں میں تو مشکیزہ تھامنے کی طاقت نہیں ہے' پھر تلوار کیسے چلاؤ گے۔۔۔"

وہ یہ جان گئی تھی کہ جس زخمی نوجوان کو وہ پانی پلا رہی ہے' وہ مندڑ نہیں ہے لیکن اس وقت وہ محض انسانی ہمدردی کے جذبے سے پانی پلا رہی تھی۔

"میں نے تم سے پانی اس لیے نہیں مانگا کہ بزدل ہوں۔۔۔ میں یوسف زئی قبیلے کا ایک بہادر نوجوان ہوں۔"

توردلئی نے قدرے کراہتے ہوئے کہا جس پر دوشیزہ نے کہا۔

"مجھے یوسف زئی کے نام سے نفرت ہے مگر میں بہادر دشمن کی قدر کرتی ہوں۔ میں نے تمہیں پانی اس لیے پلایا ہے کہ تمہاری پیٹھ پر زخم نہیں ہے۔!"

پھر وہ جلدی سے بولی۔

"جلدی سے پانی پی لو۔۔۔ مجھے دوسرے زخمیوں کو بھی پانی پلانا ہے۔"

جب توردلئی پانی پی چکا تو مشکیزہ واپس کرتے ہوئے کہا۔

"کیا میں مہربان دوشیزہ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔۔۔؟"

اس کے اس سوال کے جواب میں دوشیزہ نے جلدی سے مشکیزہ اٹھایا اور کہنے لگی۔

"میرا نام شہی ہے۔۔۔ مندڑوں کے سردار مستجاب خان کی اکلوتی بیٹی۔۔۔ شہی۔!"

جاتے جاتے اس نے ایک بار مڑ کے توردلئی کی طرف دیکھا اور یہ کہتے ہوئے چلی گئی۔

"نوجوان! تم کس قدر بے خبر ہو۔۔۔ مجھے نہیں جانتے۔۔؟ شہی کو نہیں جانتے۔؟"

جب لڑائی ختم ہو گئی اور زخمی توردلئی ساتھیوں کے ساتھ واپس آ گیا تو ان سب کی مرہم پٹی کی گئی اور پھر چند روز میں ان کے زخم مندمل ہو گئے تو یوسف زئی قبیلے کے بزرگوں نے جرگہ طلب کیا تاکہ اس لڑائی کے اسباب معلوم کیے جا سکیں اور اس بات کا پتا چلایا جائے

کہ یہ لڑائی پہلے شروع کس نے کی۔؟ جرگہ یہ چاہتا تھا کہ اس لڑائی میں یوسف زئی قبیلے کے جو نوجوان ہلاک اور زخمی ہوئے ہیں' ان کے بارے میں فیصلہ کیا جا سکے کہ اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔؟ اس موقع پر توردلئی کے چچیرے بھائی منور کو موقع مل گیا کہ وہ اپنے دشمن توردلئی کے خلاف سازش کر کے اسے سزا دلا سکے۔ توردلئی تو پہلے ہی لوگوں سے زیادہ ملتا جلتا نہیں تھا اور زیادہ وقت شکار کھیلنے میں گزارتا تھا' اس کے برعکس منور کا گاؤں کے ہر آدمی سے ملنا جلنا تھا اور اسے سارے لوگ اچھی طرح جانتے پہچانتے تھے لہٰذا جب لڑائی کی ذمہ داری کا معاملہ جرگے میں پیش ہوا تو اس نے اپنے تعلقات سے فائدہ اٹھایا اور اثر و رسوخ سے کام لیتے ہوئے اس کا ذمہ دار توردلئی کو ٹھہرایا۔ اس نے جرگے کے بزرگوں کو قائل کر لیا کہ توردلئی ہی کی وجہ سے قبیلے کے نام کو بٹا لگا ہے اور اسی کی وجہ سے نوجوان ہلاک اور زخمی ہوئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جرگے نے اپنا آخری فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

"توردلئی نے قبیلے کی عزت کو نقصان پہنچایا ہے۔ اس کی سزا یہ ہے کہ اسے گاؤں سے نکال دیا جائے۔"

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور توردلئی کو گاؤں سے نکال دیا گیا۔ جو چند نوجوان اس کے دوست تھے انھیں جب اس کے گاؤں چھوڑنے کے فیصلے کا علم ہوا تو بہت افسردہ ہوئے لیکن وہ کچھ کر نہ سکتے تھے۔ قبیلے کے بڑے بوڑھوں اور جرگے کا فیصلہ تھا۔ وہ اور تو کچھ نہ کر سکے لیکن اتنا ضرور کیا کہ وہ بھی اس کے ساتھ چل دیے انھوں نے کہا کہ جہاں توردلئی جائے گا' وہ بھی اس کے ساتھ جائیں گے اور یوں گاؤں کے کئی نوجوان اس کے ساتھ ہو لیے. توردلئی نے انھیں بہت سمجھایا اور واپس جانے پر اصرار کیا لیکن وہ نہ مانے اور کہنے لگے۔

"ہم تمہارے ساتھ جائیں گے اور جہاں تم رہو گے وہیں ہم بھی رہیں گے۔"

اس طرح توردلئی اپنے چند دوستوں کے ساتھ گاؤں چھوڑ کر چلا گیا اور ان لوگوں نے پہاڑوں میں جا کر بسیرا کر لیا اور وہیں رہنے لگے وہ جانتے تھے کہ جرگے کا فیصلہ ناانصافی پر مشتمل ہے اور اس غیر منصفانہ فیصلے کے پیچھے منور کا ہاتھ ہے' یہ سب کچھ اسی کی وجہ سے ہوا

تھا اور اب وہ اس کا انتقام لینا چاہتے تھے۔ ان کے دلوں میں اس بے انصافی کے خلاف انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ ان کے پاس کھانے پینے کا کوئی ذریعہ تو تھا نہیں چنانچہ انھوں نے آپس میں فیصلہ کیا اور ادھر ادھر قریب کے علاقوں میں ڈاکے ڈالنے لگے۔ آتے جاتے لوگوں کو لوٹنا شروع کر دیا اور اس طرح اپنی روز مرہ کی ضروریات پوری کرنے لگے۔ ابتدا میں تو وہ اپنی گزر بسر کے لیے چھوٹی موٹی چوریاں کرتے تھے لیکن بعد میں ان کا دائرہ بڑھتا گیا اور وہ بڑے بڑے ڈاکے ڈالنے لگے آہستہ آہستہ پھر ایک وقت وہ آیا جب توردلئی ایک خطرناک ڈاکو بن گیا اور اس کا نام اور اس کے گروہ کا نام ہی سن کر لوگ دہلنے لگے۔ اس نے خاص طور پر منور کی زندگی دوبھر کر دی تھی کیونکہ اسی کی وجہ سے وہ گاؤں سے نکالا گیا تھا۔ منور نے اس کے جانے کے بعد اس کی جائیداد اور زمینوں پر بھی قبضہ کر لیا تھا اور اب وہ توردلئی سے اس قدر خوفزدہ رہتا تھا کہ اکیلا گاؤں سے زیادہ دور بھی نہیں جاتا تھا۔ ادھر توردلئی اب ڈاکو توردلئی بن چکا تھا۔ اس کا گروہ ڈاکے ڈالتا' لوٹ مار کرتا' اور قتل و غارت کے بعد واپس پہاڑوں میں اپنے ٹھکانے پر آ کر جشن مناتا۔ وہ اپنی ان سرگرمیوں میں سارے رشتے ناتے بھول گئے تھے اور انھیں کسی اپنے پرائے کی پرواہ نہ رہی تھی لیکن ایک چہرہ اب بھی اس کے دل کے افق پر چاند کی طرح روشن تھا۔ وہ اسے نہیں بھولا تھا' اور وہ تھی مستجاب خان کی بیٹی شہی۔ جو اب بھی اس کے خیالات پر چھائی ہوئی تھی۔ اس نے جب میدان کار زار میں اسے پانی پلایا تھا تو پانی کے گھونٹ گھونٹ کے ساتھ خود بھی اس کے دل میں اتر گئی تھی۔ توردلئی جب بھی فرصت کے لمحات میں ہوتا' جب بھی تنہائی میں بیٹھتا تو شہی اس کے تصور میں انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتی۔ اسے اس کی ایک ایک بات ابھی تک یاد تھی جب بھی اس کی یاد آتی تھی تو توردلئی کے ذہن میں اس کے الفاظ گونجنے لگتے۔ اس نے ایک بار نہیں کئی بار ارادہ کیا کہ شہی سے ملے۔

"مگر کیسے ملا جائے۔۔۔؟ کہاں ملا جائے۔؟"

اس قسم کے کئی سوال اس کے سامنے آ جاتے۔ ان سوالوں کا اس کے پاس کوئی جواب اور کوئی حل نہ تھا کبھی کبھی اس کے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ کسی طرح شہی کو اغواء کر کے

لے آئے مگر یہ بھی ممکن نہ تھا۔ سوچنا آسان تھا' اس پر عمل کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ مندڑوں کا مقابلہ کرنا اور انھیں شکست دینا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ پھر وہ شہی تک کیسے پہنچے۔؟ اسے کیسے حاصل کرے۔؟ وہ یہی کچھ سوچ سوچ کر پریشان رہتا تھا۔ جوں جوں سوچتا توں توں شہی اور یاد آتی۔ اس طرح اب اس کی جدائی برداشت کرنا اس کے اختیار سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔

ایک روز توردلئ انھی خیالوں میں کھویا ہوا بیٹھا تھا' اچانک اس کے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ اٹھ کے مندڑوں کے گاؤں کی طرف چل دیا اور وہاں پہنچ کر سیدھا مستجاب خان کے حجرے میں چلا گیا۔ آگے جیسے ہی مستجاب خان نے اپنے حجرے میں ایک اجنبی کو دیکھا تو پٹھانوں کی روایت کے مطابق اسے خوش آمدید کہا۔ اسے اپنے برابر چارپائی پر جگہ دی اور نوکر سے اس کی خاطر تواضع کرنے کے لیے کہا پھر جب توردلئ لسی پی کر چند لمحے ستا چکا تو مستجاب خان نے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"نوجوان مہمان! تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟"

"خان بابا! میں صرف آپ کو سلام کرنے آیا ہوں۔"

"ہمیں یہ تو بتاؤ کہ تمہارا نام کیا ہے اور تم کون ہو۔؟"

"مستجاب خان نے اس سے دوبارہ سوال کیا جس پر توردلئ نے ڈرتے ڈرتے آہستہ سے کہا۔

"خان بابا! میرا نام توردلئ۔۔!"

ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ یکایک مستجاب خان اچھل کر چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"توردلئ۔۔؟ بدنام ڈاکو۔۔؟ خونی لٹیرا میرے حجرے میں۔۔؟"

پھر وہ گرج کر پوچھنے لگا۔

"بتاؤ تم کس نیت سے یہاں آئے ہو۔۔؟ اگر اس وقت تم میرے حجرے میں نہ ہوتے اور مجھے اپنی مہمان نوازی کا پاس نہ ہوتا تو میں ابھی تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا۔"

جواب میں توردلئ دھیمے انداز میں بولا۔

"یہ ٹھیک ہے، میں ڈاکو ہوں لیکن اس وقت ایک مظلوم فریادی کی حیثیت سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ مجھے یقین ہے خان بابا ایک مظلوم کی مدد ضرور کریں گے۔؟"

یہ سن کر مستجاب خان کا غصہ قدرے ٹھنڈا پڑ گیا اور وہ دوبارہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں تک حجرے میں خاموشی چھائی رہی جس میں صرف حقے کے کش لگانے کی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں پھر مستجاب خان نے ایک نظر تورد لئی کی جانب دیکھا جو سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا اور کہا۔

"تمہیں کیا کہنا ہے کہو۔۔۔ مظلوم کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے، خواہ وہ ہمارا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔؟"

اب تو تورد لئی کو بھی ہمت ہو گئی تھی، اس نے عرض کیا۔

"خان بابا! یہ بات یقیناً آپ جانتے ہوں گے کہ میں خاندانی ڈاکو نہیں ہوں اور نہ ہی چوری اور ڈاکہ زنی میرا پیشہ اور عادت ہے۔ مجھے تو حالات نے ڈاکو بننے پر مجبور کر دیا ورنہ میری رگوں میں شریف ماں باپ کا خون ہے۔"

جب وہ یہ باتیں کر رہا تھا اس وقت مستجاب خان بڑے غور سے سن رہا تھا۔ تورد لئی نے اپنی جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"والدین کے مرنے کے بعد میرا چچیرا بھائی میرے خلاف ہو گیا اور اس نے طرح طرح کی سازشیں شروع کر دیں۔ پھر اس نے جرگے کے بزرگوں کو اپنی غلط بیانی اور دروغ گوئی سے میرے خلاف کر کے مجھے گاؤں سے نکلوا دیا اور اس طرح میری جائیداد اور میری زمینوں پر قابض ہو گیا۔ خان بابا! آپ ہی بتایئے میں کیا کرتا۔۔۔؟ زندہ کیسے رہتا۔۔۔؟ حالات نے مجھے اس قدر مجبور کر دیا کہ ڈاکو بننا پڑا۔۔۔۔ آپ ہی فیصلہ کریں اس میں میرا کتنا قصور ہے۔"

مستجاب خان جو تھوڑی دیر پہلے غصے میں تھا، تورد لئی کی باتیں سن کر اس پر مہربان ہو گیا تھا اسے اس پر ترس آ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"مجھے تو آج تک تمہارے بارے میں کچھ اور ہی بتایا جاتا رہا ہے۔ اگر تمہاری یہ باتیں سچ ہیں تو واقعی تم پر زیادتی ہوئی ہے۔ تور دلئی مجھے تم سے دلی ہمدردی ہے۔ بتاؤ' میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔ کسی مظلوم کی مدد کر کے مجھے خوشی ہو گی۔؟"

تور دلئی نے جب دیکھا کہ مستجاب خان کا دل پسیج گیا ہے اور وہ اس پر مہربان بھی ہے تو درخواست کے لہجے میں آہستہ سے بولا۔

"خان بابا! اس دنیا میں آپ کے سوا میرا کوئی نہیں ہے۔۔۔ میں چوری چکاری سے تائب ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں' میری درخواست ہے کہ مجھے اپنی فرزندی میں قبول کر لیں۔۔۔۔ میں زندگی بھر آپ کے قدموں میں رہوں گا۔؟"

تور دلئی نے بہت بڑی بات کہہ دی تھی جسے سن کر ایک بار پھر مستجاب خان کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا تھا۔ وہ ذرا تیز لہجے میں بولا۔

"تور دلئی' تم اپنے ہوش و حواس میں ہو۔؟ تم یوسف زئی اور ہم مندڑ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔؟"

تور دلئی نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور سر جھکائے بیٹھا رہا۔ مستجاب خان کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔ وہ اپنے دل میں سوچنے لگا' یوسف زئی اور مندڑوں میں رشتہ کیسے ہو سکتا ہے۔؟ اگر میں قبیلے کا سردار ہو کر ایسا کروں گا تو جرگے کے آگے کیا جواب دوں گا۔؟ لیکن وہ تور دلئی کی مدد کرنے کا وعدہ بھی کر چکا تھا اور اسے یہ بھی احساس تھا کہ تور دلئی ایک خوبصورت نوجوان ہونے کے علاوہ بہادر اور غیرت مند بھی ہے' پھر وہ چوری ڈاکہ زنی سے توبہ بھی کر چکا ہے' میری اکلوتی بیٹی شہی کے لیے اس سے بہتر رشتہ نہیں مل سکے گا۔ سب سے اچھی بات یہ ہو گی کہ وہ میرے پاس ہی رہے گا اور میری پیاری بیٹی مجھ سے دور بھی نہیں جائے گی۔ اگرچہ اس وقت اسے جرگے کی مخالفت کا خوف بھی تھا لیکن پھر بھی اس نے اٹل فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

"تور دلئی! اس کے لیے مجھے طرح طرح کی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑے گا' کئی قسم کی مشکلات

سے گزرنا ہوگا' اس کے باوجود میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہاری درخواست قبول کرلوں!"

یہ بات سنتے ہی تورلئی نے جھک کر مستجاب خان کے گھٹنے چھوئے۔ اسے یقین نہیں تھا کہ اس کے دل کی مراد اس قدر جلدی بر آئے گی اور مستجاب خان راضی ہو جائے گا۔ اس نے صدق دل سے چوری اور ڈاکہ زنی سے ہمیشہ کے لیے توبہ کرلی اور وہیں رہنے لگا۔

دوسری طرف جب اس بات کا علم منور کو ہوا تو وہ حیران و پریشان رہ گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر تورلئی کی شہی سے شادی ہو گئی اور وہ مستجاب خان کا داماد بن گیا تو اس کا طاقتور حریف بن جائے گا جو کسی بھی وقت اس سے انتقام لے سکے گا۔ اس کا علاج یہی ہے کہ اسے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ لہٰذا وہ موقع کی تلاش میں رہنے لگا۔ اور پھر ایک روز تورلئی کو جنگل میں اکیلا دیکھ کر اپنے آدمیوں کی مدد سے اس پر حملہ کر دیا۔ تورلئی بھی بزدل نہ تھا مگر اکیلا تھا' بھلا کئی آدمیوں کا کب تک مقابلہ کرتا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ادھر مستجاب خان کو پتا چل گیا اور وہ اپنے آدمیوں سمیت وہاں پہنچ گیا۔ اس طرح منور کا منصوبہ ناکام ہو گیا اور وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ وہاں سے فرار ہو گیا۔

جہاں تک شہی کا تعلق تھا وہ تو اسی روز سے تورلئی پر فریفتہ ہو گئی تھی جب اسے زخمی حالت میں پانی پلایا تھا۔ اسی روز اس نے اس کے زخموں کا درد خود محسوس کیا تھا اور وہ اسے پل بھر کے لیے بھی نہ بھولی تھی۔

جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اس کے باپ نے تورلئی سے اس کے رشتے کے لیے ہاں کر دی ہے تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ پہلے تو وہ یہ سوچتی تھی کہ تورلئی خطرناک ڈاکو ہے' لوگ اسے طعنے دیں گے مگر وہ تائب ہو چکا تھا اور اب ایک شریف نوجوان تھا۔ اسے یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ وہ ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتا ہے جو مجبوری اور انتقام میں ڈاکو بن گیا تھا۔ یہ ساری باتیں جان کے شہی کی خوشیاں دوبالا ہو گئی تھیں اور تورلئی کے لیے اس کی محبت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

ایک روز یہ خبر آئی کہ منور شہنشاہ اکبر کی فوج میں بھرتی ہو کر گاؤں چھوڑ کے چلا گیا ہے۔

اس خبر کے سنتے ہی مستجاب خان نے سوچا کہ اب توردلئی اور شہی کی شادی میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ اس نے بیوی سے مشورہ کر کے شادی کی تاریخ مقرر کردی اور اس کے ساتھ ہی اس سلسلے میں تیاریاں شروع کردی گئیں۔ ظاہر ہے' اس وقت سب سے زیادہ خوش تو شہی اور توردلئی تھے کیونکہ ان کی ان ہونی تمنا پوری ہو رہی تھی اور وہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہونے والے تھے۔ اس خوشی کا اظہار ان کی بات بات سے ہوتا تھا۔ ان کے چہروں پر ہر وقت مسکراہٹیں کھیلتی دکھائی دیتی تھیں۔ تاہم توردلئی کی خوشی کی انتہا نہ تھی' وہ شہی سے بھی زیادہ خوش تھا۔ اس کی تو برسوں کی مراد پوری ہو رہی تھی۔ ایک روز خوشی میں بیٹھا ہوا تھا کہ شہی آ گئی اور اس سے پوچھنے لگی۔

"آج بڑے خوش نظر آ رہے ہو۔۔۔ کیا کوئی خاص بات ہے۔۔۔؟"

اس پر توردلئی نے جواب دیا۔

"کیا اس سے بھی بڑی خوشی کی بات ہو سکتی ہے کہ ہم دونوں کی شادی ہونے والی ہے۔۔۔؟"

"اچھا۔۔۔ میں سمجھی تھی تم شادی کے تحفے میں میرے لیے شہنشاہ اکبر کی ملکہ کا ست لڑا ہار لے آئے ہو۔۔۔!"

شہی نے تو یہ جملہ مذاق کے طور پر کہا کیا تھا لیکن توردلئی نے اسے طنز سمجھ لیا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا اور اسے اس طرح سوچ میں ڈوبا دیکھ کر شہی مذاق میں بولی۔

"خیر' جلدی کیا ہے۔۔۔ ست لڑا ہار بعد میں لے آنا۔۔!"

ابھی تو وہ پہلے ہی جملے کی کاٹ محسوس کر رہا تھا کہ اس نے دوسرا جملہ کس دیا تھا۔ جس نے توردلئی کو واقعی شہنشاہ اکبر کی ملکہ کے ست لڑے ہار کے متعلق سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے شہی نے اس کا امتحان لیا ہے۔ بہادری کا امتحان' محبت کا امتحان۔ اس نے شہی سے کہا۔

"تم میرے نزدیک ملکہ کے ست لڑے ہار سے بھی کہیں زیادہ قیمتی ہو۔ پھر بھی تمہاری محبت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ست لڑا ہار ضرور لاؤں گا' چاہے کچھ بھی ہو جائے!"

پھر اس نے ایک نظر شہی پر ڈالی اور یہ کہتے ہوئے چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔

"شہی! اگر میں خدانخواستہ اس امتحان میں ناکام رہا تو مجھے معاف کر دینا۔ اگر قسمت نے میرا ساتھ دیا تو اب میں ہار لے کر ہی تمہارے پاس آؤں گا۔ خدا حافظ!"

شہی کو قطعی اندازہ نہ تھا کہ توردلئی مذاق کو اس قدر سنجیدگی سے لے گا۔ وہ اسے اس ارادے سے جاتے دیکھ کر بدحواس ہو گئی اور اسے روکنے کے لیے اپنی محبت کے واسطے دینے لگی۔ اس نے معافی مانگی اور اپنے الفاظ واپس لیے۔ کہنے لگی 'میں تو تم سے محض مذاق کر رہی تھی لیکن توردلئی نے پختہ عزم کر لیا تھا کہ اب وہ شہنشاہ اکبر کی ملکہ کا ست لڑا ہار لے کر ہی آئے گا۔ اس نے شہی کی ایک نہ سنی' اس کے رونے دھونے پر کوئی توجہ نہ دی اور اسے آنسو بہاتا چھوڑ کر چلا گیا۔ مستجاب خان کی شادی کی تیاریاں دھری کی دھری رہ گئیں۔ اسے جب اس واقعہ کا علم ہوا تو افسوس کرتے ہوئے شہی سے کہنے لگا۔

"بیٹی! تم نے بہت برا کیا۔ اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مار لی ہے۔ توردلئی اپنے ارادے کا پکا ہے' وہ یا تو اب ست لڑا ہار لائے گا یا پھر جان دے دے گا!"

اور ہوا بھی کچھ ایسے ہی۔ اس واقعہ کو بہت دن گزر چکے تھے۔ ایک رات جب چاروں طرف تاریکی اور سناٹا چھایا ہوا تھا اور پورا گاؤں گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا تو اچانک مستجاب خان کے گھر کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔ اس غیر متوقع دستک پر وہ گھبراہٹ اور تعجب میں اٹھا۔ اتنی رات گئے کون ہو سکتا ہے۔؟ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ اور پھر جب آگے بڑھ کے دروازہ کھولا تو ہکا بکا رہ گیا۔

"بھگوان داس! اتنے عرصہ کے بعد آئے ہو اور وہ اتنی رات گئے اچانک ۔۔۔ خیریت تو ہے۔؟"

"خان! پہلے مجھے بیٹھ لینے دو پھر میں اپنے آنے کا مقصد بتاتا ہوں۔"

بھگوان داس جو اٹک کے قلعے سے آیا تھا' اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور فکرمندی کے آثار تھے جنھیں چھپانے کی وہ ناکام کوشش کر رہا تھا۔ مستجاب خان بھی اس کی کیفیت بھانپ گیا تھا

اس لیے اس نے جلدی سے کہا۔

"مجھے ایسا لگتا ہے تم کوئی بری خبر لائے ہو۔۔۔ مجھے جلدی بتاؤ۔۔۔ میں ہر طرح کی خبر سننے کے لیے تیار ہوں۔؟"

جواب میں بھگوان داس نے بتایا۔

"خان بری خبر یہ ہے کہ تور دلئی کو شہنشاہ اکبر کے سپاہیوں نے اس وقت پکڑ لیا جب وہ شاہی محل میں نقب لگا رہا تھا اور شہنشاہ نے اس کے لیے سزائے موت کا حکم دیا ہے!"

اتنا سنتے ہی مستجاب خان تو سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ قریب ہی دوسرے کمرے میں شہی یہ باتیں سن رہی تھی وہ ایک زوردار چیخ مار کر بے ہوش ہو کے گر پڑی۔ پورے گھر میں کہرام مچ گیا۔ بھگوان داس نے دریافت کیا تو مستجاب خان نے بتایا کہ تور دلئی میری بیٹی شہی کا منگیتر ہے، اس نے مذاق میں اسے ست لڑا ہار لانے کے لیے کہا تھا اور اس نے اس بات کو سنجیدگی سے لے لیا۔ اسی لیے وہ شاہی محل میں گیا ہو گا۔ جواب میں بھگوان داس نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ تمہاری بیٹی شہی میری بھتیجی ہے میں اس کے منگیتر کو بچانے کے لیے اپنی جان تک لڑا دوں گا۔ پھر جب صبح کے وقت بھگوان داس جانے لگا تو شہی ضد کرنے لگی کہ اسے تور دلئی کے پاس لے چلو۔ بھگوان داس اور اس کے گھر والوں نے اسے سمجھایا کہ تمہارا جانا ٹھیک نہیں، لیکن وہ نہ مانی۔ اس کا تو یہی کہنا تھا کہ۔

"میں تور دلئی کے پاس ضرور جاؤں گی۔۔۔ اس پر ساری مصیبت میری وجہ سے آئی ہے!"

آخر مجبور ہو کر مستجاب خان نے شہی کو جانے کی اجازت دے دی اور خود بھی رخت سفر باندھنے لگا لیکن بھگوان داس نے اسے یہ کہہ کے روک دیا کہ تمہارا جانا مناسب نہ ہو گا۔ اس طرح بھگوان داس شہی کو اپنے ساتھ لے کر روانہ ہو گیا اور اٹک کا پر شور دریا پار کر کے وہ شہنشاہ اکبر کے قلعے میں پہنچ گئے۔ جب وہ وہاں پہنچے تو انھیں پتا چلا کہ دوسرے روز تور دلئی کو زمین میں گاڑ کے اس پر خونخوار کتے چھوڑے جائیں گے جو اس کی تکا بوٹی ایک کر دیں گے۔ جیسے ہی شہی نے یہ سنا تو اس کا برا حال ہو گیا، وہ غش کھا کر گرنے ہی والی تھی کہ بھگوان

داس نے اسے سنبھالا دیا اور کہا۔

"بیٹی ہمیں کوئی تدبیر سوچنی چاہیے۔ میں خان بابا کا دھرمی بھائی ہوں' میں تور دلئی کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا مگر تمہیں ہر مرحلے پر ہمت اور حوصلے سے کام لینا ہو گا۔"

اس کے ذہن میں کوئی تجویز آ گئی تھی' وہ اسی وقت شاہی کتوں کے نگہبان کے پاس گیا مگر اس نے مدد کرنے سے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔

"بھگوان داس! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ شہنشاہ اکبر کا حکم کوئی نہیں ٹال سکتا۔"

یہ سن کر بھگوان داس بھاگا بھاگا اپنے گھر گیا اور اپنی بیوی کے سونے کے کنگن لا کر کتوں کے نگہبان کو دیے۔ اس کی یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی اور کتوں کے نگہبان نے نہ جانے کیا کیا کہ اگلے روز جب تور دلئی پر کتے چھوڑے گئے تو وہ اسے صرف سونگھ کر واپس آ گئے۔ تماشائی بڑے حیران تھے کیونکہ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ جب یہ خبر شہنشاہ اکبر تک پہنچی تو اس نے حکم دیا۔

"مجرم کو مست ہاتھی کے پاؤں تلے کچلوا دیا جائے۔"

اس نئے حکم سے بھگوان داس بہت زیادہ پریشان ہوا لیکن اس نے امید کا دامن نہ چھوڑا اور نہ ہی ہمت ہاری۔ وہ شاہی مہاوت کے پاس گیا لیکن اس نے اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیا اور معزوری ظاہر کرتے ہوئے بولا۔

"بھگوان داس! تم خود جانتے ہو یہ اکبر اعظم کا حکم ہے۔۔۔؟ اس پر عمل کرنا ہی پڑے گا۔"

وہ بڑا اداس گھر لوٹ آیا اور جب اس نے اپنی ناکامی کے بارے میں بتایا تو اس کی بھولتا نے جلدی سے کہا۔

"آپ بے فکر رہیں۔ مہاوت کی بیٹی میری عزیز ترین سہیلی ہے' میں اس کے پاس جاتی ہوں تا کہ وہ اپنے باپ کو کہہ کے تور دلئی کو بچالے۔ وہ میری بات ضرور مان جائے گی۔"

واقعی مہاوت کی بیٹی نے اس کی بات مان لی۔ نہ صرف بات مانی بلکہ اپنے باپ کو بھی راضی کر لیا کہ وہ تور دلئی کی جان بچالے گا۔ چنانچہ دوسرے روز لوگ میدان میں جمع تھے۔

اتنے میں سب نے دیکھا کہ ایک ہاتھی چنگھاڑتا ہوا نمودار ہوا جسے دیکھ کر ہر شخص کا دل دہل گیا کہ یہ ابھی نوجوان کو اپنے پاؤں تلے کچل کے رکھ دے گا۔ سب کی نظریں ہاتھی پر لگی ہوئی تھیں جو جھومتا چنگھاڑتا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے توردلئی کے پاس جا کر اپنا پاؤں اٹھایا لیکن توردلئی پر رکھنے کی بجائے واپس زمین پر رکھ دیا۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

"یہ نوجوان ضرور کوئی جادوگر ہے۔۔۔ اسے خونخوار کتوں نے بھی چھوڑ دیا اور اب مست ہاتھی نے بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑا۔۔۔ یقیناً یہ کوئی کرامت والا ہے۔"

ادھر جب شہنشاہ اکبر نے سنا تو اسے بڑا تعجب ہوا۔ اس نے حکم دیا۔

"اس نوجوان کو مابدولت کے سامنے پیش کیا جائے۔"

حکم کی دیر تھی، فوراً توردلئی کو حاضر کر دیا گیا۔ اس وقت شہنشاہ کے محافظوں میں توردلئی کا چچیرا بھائی منور بھی شامل تھا۔ جونہی توردلئی کو پیش کیا گیا شہنشاہ نے شاہی رعب سے گرجدار آواز میں کہا۔

"اے بد قسمت نوجوان! ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تمہیں حرم سرا میں داخل ہونے کی جرأت کیسے ہوئی۔؟ کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ تم اپنی موت کو دعوت دے رہے ہو۔؟"

ادھر شہنشاہ اکبر کی گرجدار آواز گونجی اور اس کے ساتھ ہی بھگوان داس، شمی اور لتا رحم رحم پکارتے ہوئے دوڑے لیکن چوبداروں نے ان کا راستہ روک لیا۔ اتفاق سے شہنشاہ نے ان کا شور سن لیا تھا اس لیے اس نے حکم دیا۔

"فریادیوں کو ہمارے حضور پیش کیا جائے!"

اسی وقت تینوں کو پیش کر دیا گیا۔ بھگوان داس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر التجا کی۔

"ظل سبحانی۔ توردلئی کی جان بخشی کی جائے ورنہ ایک معصوم دوشیزہ کا سہاگ اجڑ جائے گا۔۔۔!؟"

"اس نے حرم میں داخل ہونے کا جرم کیا ہے۔ اسے اس کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔!"

شہنشاہ نے حتمی لہجے میں کہا۔ ابھی وہ تینوں کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ اتنے میں منور آگے بڑھا

اور کورنش بجالا کے عرض کی۔

”حضور والا! اس نوجوان کی جان بخشی کر دی جائے۔!“

”ہمیں تعجب ہے، تم تو اسے اپنا دشمن بتاتے تھے اور اب اس کی جان بخشی کی درخواست کر رہے ہو۔۔۔؟“

شہنشاہ نے حیرانی سے اپنے محافظ منور کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ جواب میں منور نے سر جھکا کر کہا۔

”مہابلی! میری دشمنی صرف میرے قبیلے تک ہے۔ یہاں یہ میرا مہمان ہے۔ میری قبائلی روایت اور قومی فرض مجھے مجبور کرتے ہیں کہ میں اس کی جان بچاؤں۔!“

”مگر تم یہ بھی جانتے ہو کہ مابدولت کا حکم اٹل ہے۔ ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ اپنے مہمان کا سر قلم کرو۔!“

اس پر منور نے دست بستہ عرض کیا۔

”ظل الٰہی! یہ میرے قومی وقار اور حمیت کا سوال ہے۔ پردیس میں اپنے بھائی کے خون سے میری تلوار رنگین نہیں ہو سکتی۔ میں حضور والا سے درخواست کرتا ہوں کہ توردلئی کو رہا کر دیا جائے اور جس ست لڑا ہار چرانے کے جرم میں اسے موت کی سزا دی گئی ہے، وہ ہار اس کی منگیتر کو عطا کر دیا جائے۔ اس کی جگہ میں اپنا سر پیش کرتا ہوں۔!“

اگرچہ یہ شہنشاہ اکبر جیسے باجبروت حکمران کے حضور حکم عدولی اور بہت بڑی گستاخی تھی لیکن شہنشاہ کو منور کی جرأت اور ایثار پسند آیا۔ اس نے حکم دیا۔

”توردلئی کو رہا کر دیا جائے اور ملکہ کا ست لڑا ہار اس کی منگیتر کو پہنا دیا جائے۔ اور توردلئی کے بدلے میں منور کو سرعام تختہ دار پر لٹکا دیا جائے۔“

منور جلدی سے توردلئی اور شمی کے پاس گیا اور دونوں کو گلے لگا کر بولا۔

”شمی بہن اور بھائی توردلئی! تم دونوں کو سہاگ مبارک ہو۔ میں نے تم دونوں کو بہت دکھ دیے ہیں۔ مجھے معاف کر دینا۔ میں اپنے گناہوں کے کفارے کے لیے اپنا خون دے رہا

ہوں۔ اللہ مجھے معاف کرے!"

رہائی کے بعد توردلئی اور شہی بھگوان داس اور اس کی بھولتا سے رخصت ہو کر اپنے گاؤں کی طرف چل دیے۔ انھوں نے کشتی میں دریائے اٹک پار کیا اور خیر آباد پہنچ کر کشتی سے اتر کر پیدل سفر کرنے لگے۔ جب وہ اکوڑے کے قریب پہنچے تو جنگل میں رات ہو گئی وہ وہاں ٹھہر گئے تاکہ صبح آگے چلیں گے لیکن نصف شب کے قریب شہی کو شدت سے پیاس لگی اور اس نے پانی مانگا مگر اس سنسان جنگل میں چاروں جانب اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ توردلئی کو تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ پینے کے لیے پانی کہاں سے ملے گا۔؟ تاہم وہ شہی کو پیاسا بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"شہی! گھبراؤ نہیں۔۔۔ میں ابھی کہیں سے پانی تلاش کر کے لاتا ہوں۔"

وہ شہی کو وہیں چھوڑ کر گھپ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا ہوا پانی کی تلاش میں چل نکلا۔ جنگل میں گھومتے ہوئے اسے پہاڑ کے دامن میں کچھ خیمے نظر آئے۔ یہ خیمے خانہ بدوش کوچیوں کے تھے اور وہاں پانی ملنے کی امید تھی۔ توردلئی اسی طرف چل دیا۔ جونہی وہ خیموں کے قریب گیا خانہ بدوشوں کے خونخوار کتوں نے اسے پر حملہ کر دیا۔ ادھر کوچیوں نے سمجھا کہ شاید چور ڈاکو آ گئے ہیں لہٰذا وہ تلواریں سونت کر نکل آئے اور توردلئی پر ٹوٹ پڑے۔

پیچھے پیاس کی شدت سے شہی کا برا حال ہو رہا تھا۔ اس کا حلق خشک ہوا جا رہا تھا لیکن انتظار کے بعد بھی توردلئی واپس نہ آیا۔ جب کافی دیر ہو گئی تو اس نے ہمت سے کام لیا اور توردلئی کی تلاش میں چل کھڑی ہوئی۔ اندھیرے اور اجنبی راستے میں گرتی پڑتی چلتی رہی۔ یہاں تک کہ صبح کے آثار نمودار ہونے لگے۔ اس کی نظر کوچیوں کے خیموں پر پڑی تو اسی جانب چل دی لیکن جیسے ہی وہ خیموں کے قریب پہنچی اس نے وہاں توردلئی کی لاش پڑی ہوئی دیکھی جو خون میں لت پت تھی۔ وہ بے اختیار لاش پر گر پڑی اور زار و قطار رونے لگی۔ ادھر کوچی بھی بیدار ہو کر اپنے خیموں سے باہر آ گئے تھے۔ انھوں نے توردلئی کی لاش دیکھی تو شور کر دیا۔

"یہ توردلئی ہے۔۔۔۔۔ڈاکو توردلئی!"

انھوں نے لاش کے اوپر سے شہی کو الگ کیا لیکن وہ بھی اپنے پیارے توردلئی کے پاس پہنچ چکی تھی۔ خانہ بدوش دونوں کی لاشوں کے گرد کھڑے افسوس کر رہے تھے کہ غلط فہمی کی وجہ سے دو خون ہو گئے مگر اب یہ افسوس بے سود تھا۔ انھوں نے سوچا' دونوں کی لاشوں کو دفنا دیا جائے اور ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھے کہ اتنے میں شاہی فوج کے سپاہیوں کی ایک ٹولی ادھر سے گزری جو ایک جنازہ اٹھائے ہوئے تھے اور یہ جنازہ منور کا تھا جس نے توردلئی کی جان بچانے کی خاطر اپنی جان پیش کر دی تھی۔ جب سپاہیوں کو پتا چلا کہ توردلئی جس کے لیے منور نے اپنا سر پیش کیا وہ بھی مر چکا ہے اور اس کے ساتھ اس کی محبوبہ بھی مر گئی ہے. جس کے لیے وہ ست لڑا ہار چرانے کے لیے گیا تھا تو انھوں نے ان کی لاشیں بھی اٹھالیں اور ان کے گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔

کہا جاتا ہے کہ اس واقعہ نے یوسف زئیوں اور مندڑوں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا۔ اور پھر ان تینوں کو اسی چراگاہ میں دفن کر دیا گیا جہاں کبھی توردلئی اور مندڑوں کے درمیان خونی لڑائی ہوئی تھی اور جہاں توردلئی اور شہی کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

بلوچستان

ھانی اور شہ مرید

بلوچستان کی عوامی داستانوں میں ھانی اور شہ مرید غالباً سب سے پرانی داستان ہے کیونکہ اس کا ایک مرکزی کردار بلوچوں کے رند قبیلے کا سردار میرچاکر خان رند ہے جو تاریخ میں چاکر اعظم بھی مشہور ہے۔ یہ وہی میرچاکر خان ہے جس کے باپ شیھک کی سرکردگی میں پندرھویں صدی عیسوی کے آخر اور سولھویں صدی عیسوی کے شروع میں بلوچ قبائل سیستان اور مکران سے ہوتے ہوئے کچھی کے علاقے سنی اور سوران میں پہنچے تھے۔ پھر میرچاکر خان رند اور اس کے جنگجو شہسواروں نے سیبّی اور ڈھاڈر میں بلوچ حکومت کی بنیاد رکھی تھی چونکہ اس رومان کا ایک مرکزی کردار خود میرچاکر رند ہے اس لیے کہانی کی قدامت کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ یہ وہ دور تھا جب مغل بادشاہ ہمایوں دوبارہ دہلی کے تخت پر قابض ہوا تھا۔ اس عوامی کہانی کا ہیرو اور اس کا مدمقابل دونوں شاعر تھے اور یہ کہانی منظوم صورت میں ملتی ہے جو خود اس کے کرداروں کی منظوم کردہ ہے۔ بعد میں بعض دوسرے بلوچی شعراء نے بھی اسے نظم کیا ہے۔

میرچاکر خان رند اپنے قبیلے کا سب سے بڑا سردار تھا اور دوسرے قبائل کے لوگ بھی

اس کی سرداری کو تسلیم کرتے تھے۔ وہ بڑا بہادر' معاملہ فہم' جری شہسوار اور بہترین منتظم تھا۔ اسی دور میں ایک اور سردار تھا جس کا نام شہ مبارک تھا۔ اگرچہ وہ اپنی سرداری اور رتبے میں بڑا نہیں تھا لیکن اس کی بزرگی اور نیک نامی کی وجہ سے ہر شخص اس کی عزت اور احترام کرتا تھا۔ وہ اپنے اخلاق و عادات کے سبب لوگوں میں یکساں مقبول تھا اور سبھی لوگ اس کی بڑی تکریم کرتے تھے۔ شہ مبارک کا ایک بیٹا تھا جو اپنے حسن و جوانی میں قبیلے بھر میں مشہور تھا اور اس کا نام شہ مرید تھا۔ وہ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی جوانی میں بھی ممتاز تھا' اسی لیے اپنے ہم عمروں میں دلیری اور بہادری میں مشہور تھا۔ تیر اندازی میں تو قریب و دور کے علاقے میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ اس کی طاقت کا یہ عالم تھا کہ وہ جس کمان سے تیر اندازی کرتا تھا' اس کو کھینچنا عام آدمی کے بس کی بات نہ تھی۔ شہ مرید بہت اچھا شہسوار تھا اور اسے شکار کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ چونکہ وہ اپنے دور کا ایک بہترین شاعر تھا اس لیے اس کی طبیعت رومان پسندی اور حسن پرستی کی طرف مائل تھی جس کی وجہ سے تیر اندازی' نیزہ بازی' شمشیرزنی اور شکار کے شوق کے ساتھ ساتھ راتوں کو رقص و سرور کی محفلیں برپا کرنا بھی اس کے معمولات میں شامل تھا۔ اس طرح اس کا زیادہ تر وقت سیرو تفریح اور عیش و عشرت میں بسر ہوتا تھا۔ اس کا باپ اسے بہتیرا سمجھاتا اور کہتا۔

"بیٹا! اپنے طور طریقے بدلو--- یہ رقص و سرود کی زندگی اچھی نہیں ہے۔"

مگر شہ مرید پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ وہ ہوں ہاں کر کے باپ کی بات ٹال جاتا۔ دراصل اسے اپنی جوانی اور خوبصورتی پر بڑا گھمنڈ تھا۔ شہ مرید کی منگنی بچپن ہی میں ہو چکی تھی اور جس لڑکی سے اس کی منگنی ہوئی تھی وہ اس کے چچا میر مندو کی حسین بیٹی ھانی تھی۔ ھانی اپنے قبیلے کی حسین ترین لڑکی تھی اور شہ مرید کی اس سے بے پناہ محبت تھی۔ صرف وہی محبت نہیں کرتا تھا' ھانی بھی اسے بہت چاہتی تھی اور دونوں بڑی بے چینی سے اس انتظار میں دن گن رہے تھے کہ وہ وقت کب آئے گا جب وہ دونوں ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔؟ شہ مرید' ھانی کے عشق میں شعر کہتا اور اس کے حسن کی تعریفیں کرتا۔ اس کی شاعری

کا موضوع ھانی اور اس کا حسن تھا۔ ایک وہی ھانی کے حسن و جوانی کا عاشق نہیں تھا بلکہ قبیلے کا سردار میر چاکر خان رند بھی اس پر فریفتہ تھا اور دن رات ایسے منصوبے بنا تا رہتا تھا جس سے وہ ھانی کو حاصل کر سکے۔ اگرچہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ ھانی کی شہ مرید سے سگائی ہو چکی ہے' اس کے باوجود اس کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ تاہم وہ کوئی ایسی بات بھی نہ کرنا چاہتا تھا جس سے اس کی شہرت اور عزت داغ دار ہو۔ وہ قبیلے کا سردار تھا اس لیے بڑا محتاط تھا لیکن اپنے دل ہی دل میں ھانی کو حاصل کرنے کی ترکیبیں سوچتا رہتا تھا۔ دراصل وہ چاہتا تھا کسی طرح شہ مرید سے اس کی منگنی ٹوٹ جائے اور وہ اس سے شادی کر لے' مگر یہ کیسے ہو۔؟ اس کے لیے اسے کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔

ایک روز کا ذکر ہے' میر چاکر خان نے بعض سرکردہ لوگوں کے اعزاز میں ایک شاندار دعوت دی' اس دعوت میں قبیلے کے دوسرے چھوٹے بڑے سردار اور معزز لوگ شریک تھے۔ اس نے کھانے پینے کے اہتمام کے ساتھ ساتھ رقص و سرود کا انتظام بھی کیا تھا۔ جب سب لوگ کھانے پینے سے فارغ ہو گئے تو کہنے لگے۔

"اب کچھ تفریح کا سامان ہو جائے۔"

میر چاکر نے تو پہلے ہی اس کا بندوبست کر رکھا تھا۔

"جیسے تم لوگوں کی مرضی۔"

اس نے اسی وقت نوکروں کو حکم دیا۔

"رقص و سرود کی محفل گرم کی جائے۔"

ناچنے گانے والے تو اس کے حکم کے منتظر بیٹھے تھے' جیسے ہی اس نے انھیں طلب کیا' وہ فوراً حاضر ہو گئے پھر دیکھتے ہی دیکھتے مہمان ایک دائرے کی صورت میں بیٹھ گئے اور رقص و سرود کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہر شخص پہلے ہی مست تھا' ایسے میں ناچ گانے نے اور بھی سماں باندھ دیا۔ محفل میں شریک ہر چھوٹا بڑا جھومنے لگا۔

اس موقع پر میر چاکر کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ اس نے دوسرے سرداروں کو

مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

. آج کی اس دعوت کو یادگار بنانے کے لیے ہم سب کو کوئی نہ کوئی عہد کرنا چاہیے۔؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔ اس طرح ہم اس دعوت کو ہمیشہ یاد رکھیں گے؟"

محفل میں شریک تمام لوگوں نے اس کی تائید کی۔

"مگر یہ یاد رہے' ہمیں اپنا دیا ہوا قول ہر صورت میں پورا کرنا ہوگا خواہ اس کے لیے کسی کو اپنی جان ہی کیوں نہ دینی پڑے۔؟"

"ہمیں منظور ہے۔ جو بھی یہاں قول دے گا' اسے پورا بھی کرے گا"

سب نے وعدہ کیا جس پر میرچاکر بولا

"پہلے میں اپنا قول دیتا ہوں"۔

اس کا اتنا کہنا تھا کہ تمام محفل کی نظریں اس پر جم گئیں۔ دیکھیں میرچاکر کیا قول دیتا ہے۔؟ ہر کوئی اپنے دل میں یہی سوچ رہا تھا۔ جب چاکر نے دیکھا سب لوگ اس کی طرف متوجہ ہیں تو اس نے کہا۔

"میں عہد کرتا ہوں کہ زندگی بھر جھوٹ نہیں بھولوں گا"۔

ایک اور سردار جس کا نام جاڑو تھا' اس نے اپنا قول دیتے ہوئے کہا۔

"میں قول دیتا ہوں کہ اگر کوئی شخص میری داڑھی چھوئے گا تو میں اسے موت کے گھاٹ اتار دوں گا خواہ وہ کوئی بھی ہو۔!"

اسی محفل میں بیورغ کا بیٹا ہیستان بھی موجود تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ سب لوگ قول دے رہے ہیں تو وہ بھی آگے بڑھا۔ اس نے پہلے سات بار اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور پھر کہنے لگا۔

"میں قول دیتا ہوں کہ اگر کسی شخص کے اونٹ میرے اونٹوں کے گلے میں مل گئے تو میں وہ اونٹ واپس نہیں کروں گا۔" اس طرح جب دوسرے اپنا اپنا قول دے چکے تو میرچاکر نے شہ مرید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی شہ مرید اب تمہاری باری ہے۔۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔۔ شہ مرید کو بھی اپنا قول دینا چاہیے۔؟"

بعض دوسرے لوگوں نے بھی میر چاکر کی تائید کی۔ جواب میں شہ مرید نے پہلے ایک نظر سب کا جائزہ لیا اور پھر میر چاکر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"آپ سب نے اپنا اپنا قول دیا ہے تو میں بھی تم لوگوں سے پیچھے نہیں رہوں گا۔"

سب لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے تو اس نے کہا

"میں آپ لوگوں کو قول دیتا ہوں کہ اگر کوئی شخص میرے سامنے دست سوال دراز کرے گا تو میں اسے کبھی مایوس نہیں لوٹاؤں گا۔"

اس طرح میر چاکر کی دعوت میں شریک کئی ایک افراد نے اپنا اپنا قول دیا اور یہ دعویٰ بھی کیا کہ وہ اپنے قول کو ہر صورت میں پورا کر کے دکھائیں گے خواہ اس میں ان کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ ویسے بھی یہ بات ہر شخص اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر کوئی بلوچ اپنا قول دے تو وہ مرتے دم تک اسے نبھاتا ہے' پھر اس وقت تو وہ رند قبیلے کے سب سے بڑے سردار کی محفل میں عہد کر رہے تھے جہاں دیگر کئی سردار بھی موجود تھے اس لیے سب کو امید ہی نہیں کامل یقین تھا کہ وہاں جو عہد کیا جا رہا ہے وہ پورا بھی ہو گا۔ جن لوگوں نے قول دیا تھا' وہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ اپنے قول کو پورا بھی کرنا ہے۔ انھیں اپنے آپ پر پورا پورا یقین تھا کہ انھوں نے جو عہد دیا ہے اسے نبھا کے دکھائیں گے۔

جب اس واقعہ کو کچھ عرصہ گزر گیا تو ایک روز میر چاکر خان نے بیٹھے بیٹھے سوچا۔

"جن لوگوں نے دعوت میں قول دیے تھے انھیں کسی طرح آزمانا بھی چاہیے۔؟"

اس دوران ہیستان نے تو اپنا قول پورا بھی کر دکھایا تھا۔ ہوا یہ کہ ایک روز میر چاکر خان کے اونٹ اور اونٹنیاں چر رہے تھے اور اس سے کچھ فاصلے پر ہیستان کے اونٹوں کا گلہ بھی چر رہا تھا۔ اچانک میر چاکر کا ایک اونٹ اپنے گلے سے نکل کر چرتا ہوا دور تک چلا گیا اور پھر چرتا چرتا ہیستان کے اونٹوں سے جا ملا۔ ہیستان نے قول دیا ہوا تھا کہ اگر کسی کا بھی اونٹ اس

کے گلے میں آکر مل گیا تو وہ اسے اس کے مالک کو واپس نہیں کرے گا خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ اسی لیے اس نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ اونٹ رندوں کے سب سے بڑے سردار میر چاکر خان کا ہے، واپس نہ کیا بلکہ اسے اپنے اونٹوں میں ملا لیا تھا۔ اس بات کا علم جب چند رند نوجوانوں کو ہوا تو وہ ہیبتان کے پاس گئے اور کہا۔

"میر چاکر خان کا ایک اونٹ تمہارے اونٹوں میں آکر مل گیا ہے، اسے واپس کر دو ہم اسے لینے آئے ہیں۔؟"

مگر ہیبتان نے اونٹ واپس کرنے سے صاف انکار کر دیا اور جواب دیا۔

"میر چاکر کو معلوم ہے۔ میں نے قول دیا ہوا ہے کہ اگر کسی کا اونٹ میرے گلے میں آملے گا تو میں اس کو واپس نہیں کروں گا۔ میں اپنا قول نبھاؤں گا۔"

ہیبتان کا یہ جواب سن کر رند نوجوان میر چاکر کے پاس گئے اور اسے بتایا کہ آپ کا ایک اونٹ ہیبتان کے گلے میں جا کر مل گیا ہے، ہم اسے لینے کے لیے اس کے پاس گئے تھے لیکن اس نے اونٹ واپس کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ یہ بتانے کے بعد وہ ذرا تیز لہجے میں کہنے لگے۔

"سردار! ہم آپ کا اونٹ اس کے پاس نہیں رہنے دیں گے---!"

میر چاکر دور اندیش تو تھا ہی، دوسرا اسے یہ بھی یاد تھا کہ ہیبتان نے بھری محفل میں قول دیا ہوا ہے، وہ اپنے قول سے نہیں پھرے گا اس لیے اس سے اونٹ کی واپسی کا مطالبہ کرنا بے سود ہو گا۔ پھر وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ ایک اونٹ کی خاطر قبیلے کے لوگوں کو آپس میں لڑانا کوئی دانشمندی نہیں ہے، اگر یہ لڑائی ایک بار شروع ہو گئی تو پھر برسوں تک جاری رہے گی۔ یہی کچھ سوچ کر اس نے نوجوانوں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"محض ایک اونٹ کی خاطر دشمنی پیدا کرنا عقلمندی نہیں ہے۔ تم تو جانتے ہو، میں غریبوں اور ڈوموں کو کئی کئی اونٹ بخش دیا کرتا ہوں۔ اگر ہیبتان نے میرا ایک اونٹ رکھ لیا ہے تو کوئی بات نہیں۔"

اس طرح اس نے نوجوانوں کو سمجھا بجھا کر واپس بھیج دیا۔ ابھی اس واقعہ کو چند ہی روز گزرے تھے اور میر چاکر اپنی مجلس میں بیٹھا باتیں کر رہا تھا کہ اتنے میں اس کا ایک ساربان بھاگتا ہوا آیا۔ اس نے آتے ہی ہانپتے کانپتے سردار سے کہا۔

"سردار! گوہرام لاشاری کے چند نوجوان آپ کے اونٹ ہانک کر اپنی چراگاہوں کی طرف لے گئے ہیں۔!"

اس خبر کے ملتے ہی میر چاکر کے آدمی فوراً تیار ہو گئے اور گھوڑوں پر سوار ہو کے لاشاریوں کا پیچھا کرنے چل دیے۔ ابھی وہ تھوڑی دور گئے تھے کہ انھوں نے ایک طرف سے ہیبتان کو اپنے بہت سے آدمیوں کے ساتھ گھوڑے دوڑاتے ہوئے آتے دیکھا۔ وہ گھبرا گئے، انھیں شک ہوا کہ ہیبتان ان پر حملہ کرنے آ رہا ہے یہ دیکھ کر انھوں نے اپنے گھوڑوں کی رفتار دھیمی کر لی اور ان کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگے، لیکن وہ ان کی جانب آنے کی بجائے لاشاریوں کی طرف مڑ گئے۔ اور پھر جلد ہی انھوں نے جا کر لاشاریوں کو جا لیا۔ لاشاریوں کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ہیبتان ان پر حملہ آور ہو جائے گا' وہ تو میر چاکر کے اونٹ ہانک کر لائے تھے اور ان کے آدمی ابھی وہاں نہیں پہنچے تھے۔ جیسے ہی ہیبتان اور اس کے آدمی ان پر جھپٹے' وہ گھبرا گئے۔ گوہرام کے آدمیوں نے مقابلہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھے' اس لیے سنبھل نہ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہیبتان نے وہ تمام اونٹ ان سے چھین لیے جو وہ میر چاکر کے گلے سے ہانک کر لائے تھے۔ یہ تمام اونٹ وہ اپنے ساتھ لے گئے اور اپنے ڈیرے پر لے جا کر باندھ دیے۔ اس کے بعد ہیبتان نے یہ کیا کہ ان چھینے ہوئے اونٹوں میں میر چاکر خان کا وہ اونٹ بھی شامل کر دیا جو چند روز پہلے اس کے گلے میں آ ملا تھا اور یہ سارے اونٹ اس کے ساربانوں کے سپرد کر دیے۔ ساتھ ہی کہا۔

"سردار میر چاکر کو بتا دینا کہ لاشاری جوان کے اونٹ لے گئے تھے وہ حاضر ہیں۔"

ساربانوں نے جب واپس جا کر میر چاکر کو ساری بات بتائی اور اسے یہ پتا چلا کہ ہیبتان

نے اس کے اونٹ لاشاریوں سے چھین کر واپس پہنچا دیے ہیں' یہی نہیں بلکہ ان میں اس کا وہ اونٹ بھی شامل ہے جو چند روز پہلے اس کے گلے سے جا ملا تھا اور جسے اس نے اپنے قول کے مطابق واپس کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اب اس کا قول چونکہ پورا ہو گیا تھا اس لیے اس نے وہ بھی واپس کر دیا ہے۔ میر چاکر خان اس ساری صورت حال سے واقف ہوا تو بہت خوش ہوا اور کہنے لگا۔

"دیکھو' اگر ہم اس روز ایک اونٹ کی خاطر ہیستان سے دشمنی کر لیتے تو آج وہ ہمارے کہے بغیر ہماری اس طرح مدد نہ کرتا اور ہم اپنے ایک ہمدرد سے محروم ہو جاتے۔"

پھر اس نے پیغام بھیج کر ہیستان کو بلایا۔ جب وہ آیا تو اس سے بڑی محبت سے ملا اور یہ کہتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا۔

"تم نے لاشاریوں سے ہمارے اونٹ چھین کر واپس پہنچا دیے۔ تمہارے اس عمل سے میرے دل میں تمہاری محبت اور بڑھ گئی ہے۔"

پھر اس نے خوشی کے اظہار کے طور پر ہیستان کو ناڑی کا علاقہ عطا کر دیا۔ اس کے علاوہ ڈھاڈر اور سبی کا کچھ حصہ بھی انعام کے طور پر اسے دے دیا۔

جس روز میر چاکر کا اونٹ ہیستان کے اونٹوں سے جا ملا تھا' اسی دن سے اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ہو نہ ہو یہ جاڑو کی حرکت ہے۔ اس نے یہ اس لیے کیا تھا تاکہ ایک طرف تو ہیستان کا قول آزما سکے اور دوسری جانب مجھے نیچا دکھا سکے اور یہ بتا سکے' میں اپنا اونٹ واپس نہیں لے سکا۔ دوسرے لفظوں میں یہ ثابت کرے کہ جاڑو میر چاکر خان سے زیادہ طاقتور اور بڑا ہے۔ اسی خیال سے وہ کئی روز سے سوچ رہا تھا کہ جاڑو کا امتحان لے اور دیکھے وہ اپنے قول پر پورا اترتا ہے یا نہیں؟ لہٰذا ایک روز جب جاڑو اپنے ننھے بچے کو گود میں لیے بیٹھا تھا تو میر چاکر نے بچے کو پیار کرتے ہوئے اکسایا کہ وہ اپنے باپ کی داڑھی سے کھیلنے لگے۔ اس طرح وہ اس کی داڑھی کو ہاتھ لگائے گا اور اس کے قول کا امتحان ہو جائے گا۔ بیچارے معصوم بچے کو کیا معلوم تھا کہ باپ کی داڑھی کو ہاتھ لگانا چاہیے یا نہیں' وہ تو اس کی

گود میں کھیل رہا تھا۔ اس نے کھیلتے کھیلتے جاڑو کی داڑھی پکڑلی اور جاڑو اس طرح اچھل پڑا جیسے اس کو کسی بھڑ نے کاٹ لیا ہو۔ دراصل اسے اپنا وہ قول یاد تھا جو اس نے میر چاکر کی دعوت کے موقع پر دیا تھا۔ جونہی بچے نے اس کی داڑھی پکڑی وہ تڑپ کر اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنے معصوم کو قتل کر دیا۔ اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ وہ معصوم بچہ ہے اور اس کا اپنا بیٹا ہے' اپنا قول پورا کرنے کی خاطر اسی وقت بیچارے بے گناہ کو موت کی نیند سلا دیا۔ اس طرح میر چاکر خان نے جاڑو سے اپنے شک کا بدلہ بھی لے لیا تھا اور اس کا قول بھی آزما لیا تھا۔

میر چاکر یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ھانی' شہ مرید کے چچا مندو کی بیٹی ہے اور دونوں کی منگنی ہو چکی ہے' اس کے باوجود وہ ھانی کے عشق میں گرفتار تھا اور اس کی یہی خواہش تھی کہ اس کی اس سے شادی ہو جائے۔ وہ اکثر تصور ہی تصور میں ھانی سے شادی کے منصوبے بناتا رہتا تھا۔ ایک روز میر چاکر اور شہ مرید دوسرے لوگوں کے ساتھ شکار کھیلنے گئے اور شکار کی تلاش میں دونوں اپنے ساتھیوں سے بہت آگے نکل گئے۔ دونوں گھوڑے دوڑاتے جا رہے تھے اور دونوں کو شدید پیاس لگی ہوئی تھی۔ آپس میں کہنے لگے۔

"پیاس لگ رہی ہے۔ کہیں سے پانی پینا چاہیے؟"

ادھر ادھر بہتیرا تلاش کیا لیکن انھیں کوئی چشمہ نظر نہ آیا۔ وہ تھوڑی دور اور آگے گئے تو انھیں ایک بستی نظر آئی۔ میر چاکر کہنے لگا۔

"چلو' اس بستی میں چلتے ہیں وہاں پانی پی لیں گے۔"

جب سردار نے یہ کہا تو شہ مرید بولا۔

"سردار! اس بستی میں میری منگیتر ھانی بھی رہتی ہے مگر میں اس کے گھر نہیں جا سکتا۔ ایک تو وہ میری منگیتر ہے اور دوسرا مجھ سے پردہ بھی کرتی ہے!"

اس پر میر چاکر نے کہا۔

"شاید تمہیں معلوم نہیں' میری منگیتر بھی اسی بستی میں رہتی ہے اور میں بھی اس کے گھر نہیں جا سکتا۔"

پھر وہ شہ مرید کا جواب سنے بغیر خود ہی کہنے لگا۔

"ایسا کرتے ہیں تم پانی پینے کے لیے میری منگیتر کے گھر جاؤ اور میں تمہاری منگیتر کے گھر جاتا ہوں۔ اس طرح دونوں پیاس بجھالیں گے۔؟"

یہ تجویز شہ مرید کو بھی پسند آئی حالانکہ میرچاکر کا اس تجویز پر عمل کرنے سے مقصد یہ تھا کہ اس بہانے وہ ھانی کو بہت قریب سے دیکھ لے گا۔ اس نے شہ مرید کو اپنی منگیتر کے گھر کا پتا بتایا اور اس سے ھانی کے گھر کے بارے میں معلوم کر لیا۔ اور پھر دونوں گاؤں میں پہنچ گئے۔ جب میرچاکر خان' ھانی کے گھر پہنچا تو وہ اس سے بڑے ادب و احترام سے پیش آئی اور دریافت کیا۔

"سردار! فرمائیں کیسے آنا ہوا۔۔۔؟"

جواب میں اس نے کہا۔

"میں شکار کی تلاش میں تھا کہ شدید پیاس لگ گئی۔۔۔ مجھے تھوڑا سا پانی پلا دو۔؟"

ھانی اسی وقت گھر کے اندر گئی اور ایک صاف ستھرے کٹورے میں پانی بھر کے لائی مگر اس نے یہ کیا کہ پانی سے بھرے ہوئے کٹورے میں چند صاف تنکے ڈال دیے۔

"لیجیے' پانی پیجیے۔!"

میرچاکر نے اس سے کٹورا لے لیا اور جب منہ سے لگا کر پانی پینے لگا تو اس میں تنکے دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے رک گیا۔ پہلے سوچا' ھانی سے دوسرا پانی لانے کو کہے لیکن پیاس شدید لگی ہوئی تھی اس لیے وہ کچھ کہے بغیر آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھر کے اس طرح پانی پینے لگا کہ تنکے کٹورے کی تہہ ہی میں پڑے رہ گئے۔ اس نے پانی تو پی لیا تھا مگر دل میں سوچ رہا تھا' ھانی نے بڑی بدتمیزی سے پانی پلایا ہے' یہ بھی نہیں دیکھا کہ اس میں تنکے پڑے ہوئے ہیں۔؟ بہرصورت اس نے شکریہ ادا کیا اور کچھ ناراض سا واپس آیا۔ جونہی واپس آیا تو دیکھا آگے شہ مرید زمین پر پڑا تھا اور ہائے ہائے کر رہا تھا۔ اسے بڑا تعجب ہوا۔ ابھی تو یہ ٹھیک ٹھاک تھا' دیکھتے ہی دیکھتے اسے کیا ہوا۔؟ اس نے پوچھا۔

"یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔۔۔؟ زمین پر کیوں لیٹے ہوئے ہو۔۔۔؟"

جواب میں شہ مرید نے اسے بتایا۔ میں تمہاری منگیتر کے گھر گیا اور پانی طلب کیا تو اس نے پانی کا بھرا ہوا ایک بڑا پیالہ مجھے لا کر دیا۔ ایک تو میں سفر کے بعد گیا تھا اور اوپر سے پیاس شدید تھی اس لیے بغیر سانس لیے سارا پانی پی گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے الٹی ہو گئی اور میری طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ میر چاکر نے جب یہ بات سنی تو اس کی سمجھ میں آیا کہ ھانی نے کٹورے میں تنکے کیوں ڈالے تھے۔؟ اس کا مقصد یہ تھا' میں رک رک کر پانی پیوں۔ وہ اس کے حسن پر تو پہلے ہی فریفتہ تھا' اب اس کی عقلمندی کا بھی قائل ہو گیا۔ وہ ھانی کا اور بھی دیوانہ ہو گیا تھا۔ اپنے آپ سے کہنے لگا۔

"کچھ بھی ہو۔ میں ھانی کو ضرور حاصل کر کے رہوں گا۔!"

آج اسے اتنی قریب سے دیکھنے' اس سے بات کرنے اور اس کی عقلمندی کا اندازہ کرنے کے بعد تو اس کی یہ خواہش اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ شکار سے واپس آ کر وہ پھر کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگا جس پر عمل کر کے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے۔ سوچتے سوچتے اسے یاد آیا' شہ مرید نے بھی قول دیا تھا کہ اس سے جب کوئی چیز مانگی جائے گی تو وہ اس کے دینے سے انکار نہیں کرے گا۔ یہ بات یاد آتے ہی اس نے ایک منصوبہ بنایا اور اس کے لیے موقع اور وقت کا انتظار کرنے لگا۔ پھر ایک روز شہ مرید نے ایک دعوت کا اہتمام کیا' ابھی رقص و سرود کی محفل شروع ہی نہیں ہوئی تھی کہ میر چاکر خان نے گانے والوں اور رقاصوں کو انعام دے کر پہلے ہی سے سکھا پڑھا دیا تھا کہ جب محفل ختم ہونے کے بعد شہ مرید تم سے تمہاری خواہش پوچھے تو تم لوگ اس سے ھانی مانگ لینا اور ساتھ ہی منگنی توڑنے کا مطالبہ بھی کرنا۔ ڈوموں اور رقص کرنے والوں نے اس کے حکم پر عمل کیا۔ محفل رقص و سرود اپنے عروج پر تھی اور مہمانوں کے ساتھ شہ مرید بھی مستی میں جھوم رہا تھا۔ آج وہ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی خوش اور مست تھا۔ شاید اس لیے کہ محفل اسی نے برپا کی تھی اور رقص کرنے اور گانے والوں نے بھی آج بہت عمدہ فن کا مظاہرہ کیا تھا۔

ایک شہ مرید ہی نہیں محفل میں شریک سارے مہمان خوشی میں جھوم جھوم جا رہے تھے۔ پھر جب یہ محفل رقص و سرود اپنے اختتام کو پہنچی تو شہ مرید نے رقاصوں اور گلوکاروں کو داد و تحسین کے ساتھ ساتھ انعام بھی دیا اور پوچھنے لگا۔

"تم لوگوں نے آج سب کو خوش کر دیا ہے--- بتاؤ تمہیں کیا چاہیے۔؟"

گویوں اور رقص کرنے والوں نے تو پہلے ہی طے کر رکھا تھا۔ جب اس نے یہ پوچھا تو چند لمحوں کے پس و پیش کے بعد کہنے لگے۔

"آپ کی پہلے ہی ہم پر بہت مہربانیاں ہیں!"

مگر شہ مرید اس وقت کچھ ضرورت سے زیادہ ہی خوش تھا۔ وہ اصرار کرنے لگا۔

"نہیں مانگو--- تمہیں کیا چاہیے۔؟"

اب وہ موقع آگیا تھا جب انھیں میر چاکر کے کہے پر عمل کرنا تھا۔ انھوں نے کہا۔

"ہمیں معلوم ہے، آپ اپنے قول کے سچے اور پکے ہیں۔ پھر بھی آپ ہم سے وعدہ کریں کہ ہم جو کچھ مانگیں گے، آپ اس سے انکار نہیں کریں گے---؟"

"میں نے پہلے بھی یہ قول دیا ہوا ہے اور اب پھر تم سے کہتا ہوں کہ میں انکار نہیں کروں گا۔؟"

اس پر ڈوم جھجکتے ہوئے بولے۔

"ہمیں ھانی چاہیے--- ہم چاہتے ہیں، آپ اس سے اپنی منگنی ختم کر دیں تاکہ رندوں کے بادشاہ میر چاکر سے اس کی شادی کی جا سکے۔!"

"ھانی دے دوں---؟ یہ تم لوگ کیا کہہ رہے ہو؟ یہ بھی کوئی مانگنے کی چیز ہے؟"

شہ مرید اچھل پڑا تھا اور اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا تھا۔ وہ نشے کے باوجود سمجھ گیا کہ یہ میر چاکر کا بچھایا ہوا جال ہے جس میں وہ پھنس گیا تھا۔ اس نے گلوکاروں اور رقاصوں کو اپنے ساتھ ملا کے جو چال چلی تھی وہ کامیاب ہو رہی تھی مگر شہ مرید اب کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے قول دیا ہوا تھا اور دوبارہ اپنا عہد نبھانے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ اپنے وعدے سے پیچھے نہیں

ہٹ سکتا تھا کیونکہ اسے اپنے قول کا پاس تھا اس لیے اس نے کہا۔

"میں اپنے ساتھ اپنی ھانی پر بھی ظلم کر رہا ہوں مگر میں نے قول دیا ہے۔ جاؤ' میں نے تمہیں ھانی بخش دی اور اس سے منگنی بھی توڑ لی۔!"

پھر اس نے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ھانی میری منگیتر ہے مگر وہ میرے پاس نہیں ہے۔۔۔ اسے حاصل کرنے کے لیے اس کے ماں باپ کے پاس جاؤ۔!"

یہ سنتے ہی ڈوم بھاگے بھاگے میر چاکر کے پاس گئے اور اسے یہ خوشخبری سنائی کہ شہ مرید نے ھانی بخش دی ہے اور اس سے اپنی منگنی بھی توڑ لی ہے۔ یہ بات سنتے ہی میر چاکر خوشی میں دیوانہ سا ہو گیا تھا۔ اس نے ڈوموں کو انعام دیا اور مزید انعام دینے کا وعدہ بھی کیا۔ اس نے جو چال چلی تھی اس کی کامیابی پر بڑا خوش تھا۔ دوسری طرف جونہی یہ خبر ھانی تک پہنچی تو وہ گویا جیتے جی مر گئی تھی۔ لیکن اس وقت میر چاکر کو کسی کی پرواہ نہ تھی' اس نے اس معاملے میں دیر کرنی مناسب نہ سمجھی اور چند ہی روز میں ھانی سے شادی کر کے اسے اپنے گھر لے آیا۔ اگرچہ ھانی اس کی بیوی بن گئی تھی مگر اس نے صرف اس کے جسم پر قبضہ کیا تھا' جہاں تک روح کا تعلق تھا وہ اب بھی شہ مرید کے ساتھ تھی۔ اس کا دل اب بھی شہ مرید ہی کے لیے دھڑکتا تھا۔ وہ اسی کے ہجر میں المیہ گیت گا رہی تھی اور اسی کی یاد میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس کے سہانے خوابوں کا محل اس طرح دھڑام سے آ گرے گا اور وہ میر چاکر کے محل کی زینت بن جائے گی دوسری طرف شہ مرید نے اپنا قول تو نبھا دیا تھا مگر وہ اپنے کیے پر بہت پریشان تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کیا کرے اور کیا نہ کرے۔؟ اور کدھر جائے۔؟ وہ ھانی کی جدائی کے غم میں دیوانہ سا رہنے لگا۔ اسے نہ شکار کا شوق رہا تھا اور نہ ہی اب وہ دوستوں کی محفلوں میں نظر آتا تھا۔ ہر وقت وہ تھا اور ھانی کی یاد تھی۔ دن ہو یا رات اس کی آنکھوں کے سامنے ھانی کا چہرہ چھایا رہتا تھا اور وہ اسے یاد کر کے آنسو بہاتا رہتا تھا۔ اس کا دکھ اس لیے بھی زیادہ تھا کہ یہ سب کچھ اس کا اپنا کیا کرایا تھا۔ اس نے اپنے

ساتھ ھانی کو بھی دکھ کی بھٹی میں جھونک دیا تھا۔ پہلے ہی اس کی شاعری ھانی کے عشق و محبت میں ڈوبی ہوئی تھی' اب اس میں اور بھی سوز پیدا ہو گیا تھا۔ وہ جنگل میں نکل جاتا' پہروں بے مقصد گھومتا رہتا اور ھانی کے ہجر میں شعر کہتا رہتا جو آج بھی اس کی محبت کی گواہی دے رہے ہیں۔

ادھر ھانی کی حالت بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی لیکن وہ سردار میر چاکر رند کی بیوی بن چکی تھی اس لیے اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھی۔ اب دونوں کا ملنا بھی دشوار تھا کیونکہ ھانی میر چاکر کے بلند دیواروں اور اونچے میناروں والے قلعے میں بند تھی اور اس قلعے کے اندر جانا آسان نہ تھا جس کے بڑے بڑے مضبوط دروازے رات کو بند کر دیے جاتے تھے اور دن کو وہاں بے شمار نوکر چاکر ہوتے تھے۔ اس کے باوجود شہ مرید سے صبر نہ ہوتا تھا۔ وہ رات کو لوگوں کی نظریں بچا کر قلعے کے ارد گرد چکر کاٹتا رہتا کہ شاید کہیں ھانی دکھائی دے جائے لیکن ھانی تو قلعے کی سنگین دیواروں کے اندر بند تھی جس کی ہر وقت نگرانی ہوتی تھی' پھر وہ کیسے اس کی نظروں تک پہنچتی۔؟ یہ بات سمجھنا شہ مرید کے لیے مشکل تھی۔ دراصل وہ سمجھنے سمجھانے کی منزل ہی سے گزر چکا تھا۔ اس کی اس مجنونانہ حالت کی خبر جب ھانی تک پہنچی تو اس نے اسے پیغام بھجوایا اور کہا۔

"میر چاکر کے خونخوار پہرے دار قلعے کے برجوں پر ہر وقت کھڑے ہوتے ہیں' اگر کسی روز انھوں نے تمھیں دیکھ لیا تو تمہارا سر کاٹ کے قلعے کی دیوار پر لٹکا دیں گے۔ اپنی حالت سنبھالو۔!"

اس کا جواب شہ مرید نے اشعار میں دیا جس کا مطلب کچھ اس طرح تھا۔

"مجھے میری بہادر ماں دودھ پلاتی رہی ہے
مجھے بچپن میں میری بہادر دایہ لوریاں دے کر سلاتی رہی ہے
میری ماں کا دودھ اور دایہ کی لوریاں ایسی نہیں تھیں کہ
آج میں میر چاکر جیسے آدمی کے پہرے داروں سے خوفزدہ ہو جاؤں"

اس کی دیوانگی روز بروز بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے باپ مبارک سے اپنے بیٹے کی یہ حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ اس نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”اے بیٹے! پاگل نہ بنو
تم کسی صورت بھی میر چاکر کے مد مقابل نہیں بن سکتے
وہ کوئی معمولی شخص نہیں ہے
اس کے ایک اشارے پر ہزاروں نوجوان
ہتھیاروں سے لیس اصیل گھوڑوں پر سوار ہو کر
لڑ مرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔“

باپ کی ساری نصیحتیں شہ مرید کے لیے بے سود تھیں۔ وہ تو ھانی کے عشق میں اپنے آپ کو بھول چکا تھا۔ اسے اتنا ہوش ہی نہیں تھا کہ اپنے فائدے یا نقصان کے بارے میں سوچے۔ اس کو ہر چیز میں ھانی کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس نے باپ کے جواب میں جو شعر کہے وہ کچھ اس طرح تھے۔

”ھانی حسین دوشیزاؤں کی ملکہ ہے
وہ اندھیری رات میں بجلی کی طرح چمکتی ہے
وہ خوابیدہ دلوں کو بیدار کر دیتی ہے
اسی لیے میں پاگل سا بن گیا ہوں“

باپ نے جب دیکھا کہ شہ مرید پر اس کی نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تو اس نے اسے میر چاکر کے رعب و دبدبہ اور اس کی سرداری سے ڈرانا چاہا لیکن اس نے اس کے جواب میں یہ اشعار کہے۔

”میر چاکر بھی مجھ جیسا ایک انسان ہے
اس میں اور مجھ میں صرف فرق اتنا ہے کہ۔
اسے بلوچوں نے اپنا سردار تسلیم کر لیا ہے

لیکن میں بھی بہادری اور دلیری میں اس سے کم نہیں ہوں
مجھے بھی لوگ خونخوار عاشق مرید کے نام سے یاد کرتے ہیں
پہاڑ اور سنگین قلعے بھی میری راہ میں
رکاوٹ بننے کی جرأت نہیں کر سکتے"

اس طرح شہ مرید اپنی روش پر قائم رہا اور راتوں کو میر چاکر کے قلعے کے گرد چکر لگاتا رہا۔ ایک رات وہ تین بار قلعے کی فصیل کے باہر اپنے اشعار گاتا ہوا گزرا اور ہر بار ھانی اس کی آواز سن کر قلعے کے برج پر جاتی تاکہ اسے دیکھ سکے۔ جب وہ پہلی بار گئی تو ننگے سر تھی۔ جب وہ دوسری بار گئی تو دوپٹے سے سر کو ڈھانپے ہوئے تھی اور جب تیسری بار گئی تو اس کے بال بکھرے ہوئے تھے جو ہوا سے اڑ اڑ کر اس کے چہرے کو چھپائے ہوئے تھے۔ اس وقت میر چاکر بھی جاگ رہا تھا اور ھانی کو آتے جاتے دیکھ رہا تھا (مشہور مستشرق لانگ ورتھ ڈیمز نے لکھا ہے کہ ھانی اصطبل میں گئی تھی جہاں شہ مرید چھپا ہوا تھا۔ جب وہ واپس آئی تو میر چاکر نے گھوڑوں کی بے چینی کی وجہ دریافت کی تو اس نے بتایا کہ گھوڑے بجلی کی کڑک سے پریشان ہو گئے ہیں) دوسرے روز جب میر چاکر کی مجلس جمی ہوئی تھی تو اس نے حاضرین سے پوچھا۔

"بتاؤ کل رات کتنی بار بجلی کوندی تھی۔؟"

جواب میں سب خاموش رہے کیونکہ کسی کی سمجھ میں اس کا سوال ہی نہیں آیا تھا۔ آخر ایک رند نے کہا۔

"سردار! کل رات تو بادل ہی نہیں تھے' پھر بجلی کیسے چمک سکتی تھی۔۔۔؟"

اس وقت مجلس میں شہ مرید بھی بیٹھا ہوا تھا اس کا باپ مبارک بھی موجود تھا۔ شہ مرید نے میر چاکر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ اجازت دیں اور ناراض نہ ہوں تو میں اس کا جواب دوں۔؟"

"بالکل دو میں ناراض نہیں ہوں گا۔؟"

اجازت ملنے پر شہ مرید بولا۔

"رات تین بار بجلی چمکی---- پہلی بار تیز روشنی ہوئی' دوسری بار وقفے وقفے سے دھیمی روشنی ہوئی' اور تیسری بار جب بجلی چمکی تو بادل بھی چھائے ہوئے تھے۔"

اتنا کہنے سے نہ تو مجلس کے لوگ کچھ سمجھ سکے اور نہ ہی خود شہ مرید کو تسلی ہوئی۔ اس نے سوچا میرچاکر نے ناراض نہ ہونے کا وعدہ تو کر ہی لیا ہے چنانچہ اس نے صاف صاف کہہ دیا۔

"وہ بجلی تو دراصل ھانی تھی--- میرچاکر رند کی بیوی ھانی!"

شہ مرید نے بھری مجلس میں سردار کی توہین کردی تھی۔ اگر اس نے ناراض نہ ہونے کا وعدہ نہ کیا ہوتا تو ہو سکتا تھا' شہ مرید جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ بہرصورت اس نے اپنے قول کا پاس کرتے ہوئے اپنے آپ پر جبر کر کے ضبط کیا مگر وہاں مبارک موجود تھا' اس نے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تمہیں سردار کی عزت کرنی چاہیے اور اس کی بیوی کے بارے میں ایسی بات نہیں کہنی چاہیے۔؟"

جواب میں شہ مرید نے جو اشعار کہے ان کا مفہوم یہ تھا۔

"اے باپ ھانی کا حسن آگ کی طرح ہے
اور تم اب تک حسن کی آگ میں نہیں جلے
اے باپ! ھانی دنیا کی حسین ترین عورت ہے
اگر تم ھانی کے عشق میں مبتلا ہو جاؤ تو۔
خوشی سے پاگل ہو جاؤ گے اور
برہنہ ہو کر رقص کرنے لگو گے"

شہ مبارک بیٹے کے یہ گستاخانہ اشعار سن کر آگ بگولا ہو گیا اور اس نے اس بھری محفل میں اپنا جوتا اتار کر اسے دے مارا۔ اس طرح بھری محفل میں شہ مرید کی بے عزتی ہو

گئی تھی اور یہ بے عزتی اس کے اپنے باپ نے کی تھی جس کو وہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا البتہ اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ اپنے گھر نہیں رہے گا اور ہمیشہ کے لیے وہاں سے چلا جائے گا۔ اس نے اس موقع پر یہ اشعار کہے۔

اے میرے بزرگ باپ
تم نے جوتا مار کر میری بے عزتی کی ہے
قسم ہے' میں اپنا سر منڈالوں گا
اور بہت جلد چلا جاؤں گا
دور کسی ملک میں جا بسوں گا
اپنے گراں بہا ہتھیاروں کو چھوڑ دوں گا
اور اپنے قیمتی ملبوسات بھی چھوڑ جاؤں گا"

اس کے باپ کو جب یہ علم ہوا کہ شہ مرید واقعی جا رہا ہے تو وہ بہت پچھتایا۔ سوچنے لگا' مجھے سب کے سامنے بیٹے کو نہیں مارنا چاہیے تھا۔ اس نے اسے بہت سمجھایا' اپنی ندامت کا اظہار کیا لیکن شہ مرید نہ مانا۔ اس نے تو پکا ارادہ کر لیا تھا لہٰذا فقیرانہ لباس پہنا اور درویشوں کی ایک ٹولی میں شامل ہو کے مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ وطن سے دور جانے کے باوجود اس کے دل میں عشق کی بھڑکتی ہوئی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی اور وہ وہاں رہ کے بھی ھانی کی یاد میں شعر کہتا رہا۔ ادھر پیچھے بے بس اور مجبور ھانی میر چاکر کی قید میں اس کے فراق میں اکیلی تڑپتی رہی۔

اس طرح شہ مرید کو مکہ گئے ہوئے کئی برس گزر گئے تھے۔ آخر اس کا دل چاہا کہ وہ واپس اپنے وطن جائے اور دیکھے' ھانی کس حال میں ہے۔؟ اس کے خاندان والے کیسے ہیں۔؟ انہی دنوں درویشوں کی ایک ٹولی بلوچستان آ رہی تھی' وہ بھی اس میں شامل ہو گیا اور سفر کرتا کراتا ایک بار پھر اپنے وطن پہنچ گیا جب وہ میر چاکر کے قلعے کے پاس پہنچا تو وہاں چند نوجوان تیر اندازی میں مصروف تھے۔ اسے بھی اپنا وہ زمانہ یاد آ گیا جب تیر اندازی میں اس کا

کوئی مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ وہ بے اختیار ہو کر آگے بڑھا اور کمان مانگی۔ جب ایک نوجوان نے اسے کمان دی تو اس نے چلّے پر تیر چڑھایا اور کمان کھینچی مگر وہ ٹوٹ کر دو ٹکڑے ہو گئی۔ اس نے دوسری کمان لی، وہ بھی ٹوٹ گئی اور پھر تیسری کمان کا بھی یہی حشر ہوا۔ اس طرح مسلسل تین کمانیں ٹوٹ گئی تھی اور وہاں موجود لوگ اس اجنبی درویش کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں کسی نے کہا۔

"شہ مرید کی کمان اس کے گھر سے منگوائی جائے۔ وہ کمان لوہے کی ہے اور اس قدر بھاری ہے کہ شہ مرید کے سوا کوئی نہیں کھینچ سکتا۔!"

اسی وقت دو چار نوجوان بھاگے بھاگے شہ مرید کے گھر گئے اور اس کی کمان اٹھا لائے۔ شہ مرید نے اپنی کمان دیکھی تو دل ہی دل میں خوش ہو گیا۔ اسے ابھی تک کوئی نہیں پہچان سکا تھا کیونکہ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور وہ درویشوں کے لباس میں تھا۔ اس نے کمان لے کر اسے چوما اور پھر تیر چڑھا کر چلا دیا۔ پہلا ہی تیر ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔ اس نے دوسرا تیر چلایا تو وہ جا کر پہلے تیر میں پیوست ہو گیا۔ یہ دیکھتے ہی لوگوں میں سے کسی نے بلند آواز میں کہا۔

"اس آہنی کمان کو کھینچنے والا شہ مرید کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔۔۔ یقیناً یہ شہ مرید ہے۔!"

تمام لوگ چونک گئے اور ان کی نظریں درویش پر جم گئیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ خبر ہر طرف پھیل گئی "شہ مرید آ گیا۔ شہ مرید آ گیا!"

یہ خبر ھانی تک بھی پہنچ گئی اور اسے سنتے ہی اس کے مردہ تن میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ شہ مرید کے گھر والوں نے بھی سنا تو وہ بھی بھاگے بھاگے آئے اور اس طرح تھوڑی ہی دیر میں شہ مرید کے چاروں طرف بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ جن میں جوان بوڑھے سبھی شامل تھے۔ اسی وقت چند چھوٹے بلوچ سرداروں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا۔ ایک ساتھ میر چاکر کے پاس گئے اور درخواست کی۔

"سردار! ہماری درخواست ہے کہ اب آپ عشق کے دو متوالوں کو زندگی کا آخری حصہ ایک ساتھ گزارنے کا موقع دیں۔ شہ مرید اور ھانی نے بہت دکھ برداشت کر لیے ہیں۔؟"

میر چاکر کو بھی احساس تھا کہ وہ ھانی کو اپنی بیوی بنانے کے باوجود ابھی تک اس کا دل نہیں جیت سکا۔ اتنا عرصہ گزر گیا لیکن ابھی تک اس کے دل میں شہ مرید کی محبت کا چراغ روشن تھا۔ وہ اپنے دل میں سوچنے لگا' اب اس پر مزید ظلم نہیں کرنا چاہیے۔ بہتر یہی ہے کہ جس طرح شہ مرید نے اسے میرے سپرد کر دیا تھا' اب اسی طرح میں بھی کھلے دل کا ثبوت دوں اور اس کی امانت اسے واپس کر دوں یہی سوچ کر اس نے سرداروں سے کہا۔

"مجھے تم لوگوں کی تجویز سے اتفاق ہے۔"

اس نے اسی وقت ھانی کو طلاق دے دی اور اس کی شہ مرید سے شادی کر دی گئی۔ شہ مرید نے ایک تیز رفتار اونٹنی منگوائی اور وہ دونوں اس پر سوار ہو گئے۔ لوگوں نے انھیں بہتیرا روکنا چاہا' ماں باپ نے بھی بہت اصرار کیا کہ وہ کہیں نہ جائیں اور وہیں رہیں لیکن شہ مرید نے کسی کی بات نہ مانی اور ھانی کو لے کر اونٹنی دوڑاتا ہوا ایک طرف کو چلا گیا۔ کہا جاتا ہے' آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ عشق و محبت کے یہ دونوں دیوانے کدھر چلے گئے اور انھوں نے اپنی باقی زندگی کہاں اور کیسے بسر کی۔؟

شہداد اور ماہناز

اگر بلوچستان کی مقبول عوامی داستانوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ عجیب اتفاق سامنے آتا ہے کہ اس خطے کی زیادہ تر رومانی داستانیں رند قبیلے کے عظیم سردار میر چاکر خان رند کے دور کی یادگار ہیں۔ یہ کہانی بھی اسی زمانے سے تعلق رکھتی ہے جس کا مرکزی کردار میر چاکر خان رند کا بیٹا میر شہداد ہے جسے بعض کتابوں میں شہزاد بھی لکھا گیا ہے۔ یہ بھی دلچسپ اتفاق ہے کہ بلوچستان کی ایک مشہور عوامی کہانی کی ہیروئن ھانی سردار میر چاکر خان کی بیوی بنی اور اس کہانی کی ہیروئن ماہناز کی شادی میر چاکر رند کے بیٹے میر شہداد سے ہوئی۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ سولھویں صدی عیسوی کا درمیانی زمانہ تھا کیونکہ جب ۱۵۵۵ء میں مغل بادشاہ ہمایوں نے سوریوں کو شکست دی تو اس وقت بلوچوں نے اس کی مدد کی تھی اور ان کی فوج میں میر شہداد بھی شامل تھا۔ اس نے اپنی ایک نظم میں لکھا ہے۔

"سورج نکلتے ہی فوجیں ظاہر ہوئیں
ہمایوں کی فوج لاتعداد تھی
نیزوں کی وجہ سے زمین پر سایہ ہو گیا

زمین پر ٹھہرنے کی جگہ بھی نایاب تھی
پرندے اپنی اونچی جگہوں پر سوئے ہوئے تھے
آدمیوں اور گھوڑوں کی تعداد بے شمار تھی
چمڑے کے بنے ہوئے دمامے گرجنے لگے
اور ایک ہی قوم کے چالیس ہزار رند جوان چل پڑے
ان کے دل گھمسان کی جنگ کے تصور سے نہیں گھبراتے
اور بہادر رند تیز دھار والی تلواریں لیے آگے بڑھے
تمہاری جانوں کا رکھوالا اللہ ہے
تمہاری عورتیں اور سونے جیسے نقوش والے بیٹے خدا کے حوالے
اب سردھڑ کی بازی لگ گئی ہے"

اس کہانی کے دونوں مرکزی کردار شاعر ہیں۔ اگرچہ میر شہداد رند بھی شاعر تھا لیکن اس کی محبوبہ ماہناز بلوچی زبان کی نامور اور منفرد شاعرہ ہے جس کی شہرت آج بھی بلوچی زبان و ادب میں مسلم ہے۔ اس کی زندگی نے بڑا عروج و زوال دیکھا' بڑے اتار چڑھاؤ سے گزری لیکن اس نے ہر مشکل کو برداشت کیا۔ نہ صرف برداشت کیا بلکہ ثابت قدم رہی۔ اس پر الزامات لگائے گئے' تہمتیں تراشی گئیں مگر وہ پاک دامن رہی۔ اس نے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی شاعری کو اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ایک جگہ اس نے کہا ہے۔

"میں چوڑے پتوں والے انجیر کے درخت کی مانند ہوں
جو تنگ دروں اور گھاٹیوں میں اُگ آیا ہو
موسم خزاں کی ہوا کسی سمت کی کیوں نہ ہو
آخر درختوں کے سر جھکا کر انھیں لنڈ منڈ کر دیتی ہے
لیکن میرے سر کو آج تک ہوا بھی ہلانے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔"

یہ کہانی زیادہ تر ماہناز کی زندگی کے گرد گھومتی ہے جو نوہانی بلوچوں سے تعلق رکھتی

تھی۔ اس کی منگنی بچپن ہی میں رندوں کے سردار میر چاکر خان رند کے بیٹے میر شہداد سے ہو گئی تھی اور یہ دونوں ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتے تھے۔ دونوں بڑی بے تابی سے اس وقت کا انتظار کر رہے تھے جب ان کی شادی ہو اور وہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہو جائیں۔ اس طرح دونوں اپنی اپنی جگہ خوابوں کے جال بن رہے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ شاعری کے پھول بھی کھلا رہے تھے کہ اتفاق سے دونوں خاندانوں میں کچھ رنجشیں پیدا ہو گئیں جس کی وجہ سے ان کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ شہداد اور ماہناز کا خیال تھا کہ خاندانوں میں یہ اختلافات وقتی طور پر پیدا ہو گئے ہیں جو وقت کے ساتھ ختم ہو جائیں گے لیکن ان کا یہ خیال غلط نکلا۔ اختلافات روز بروز بڑھتے ہی چلے گئے اور شادی ہونے کی ساری امیدیں دم توڑ گئیں۔ ادھر میر شہداد جوان تھا اور پھر رندوں کے سب سے بڑے سردار کا بیٹا تھا لہٰذا اس کے لیے دوسرا رشتہ تلاش کیا جانے لگا۔ بھلا سردار کے بیٹے کے لیے رشتوں کی کیا کمی ہو سکتی تھی۔؟ قبیلے کی بہت سی لڑکیوں کی تمنا تھی کہ وہ میر شہداد کی بیوی بن جائیں۔ آخر ایک لڑکی پسند کر لی گئی مگر میر شہداد نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

"میں شادی نہیں کروں گا۔!"

"شادی نہ کرنے کی کیا وجہ ہے۔۔۔؟ تم جوان ہو اور آگے چل کے قبیلے کی سرداری بھی تمہیں کرنی ہے۔۔۔؟"

باپ نے پوچھا، جس پر اس نے جواب دیا۔

"میں صرف ماہناز سے شادی کروں گا۔۔۔ وہ میری بچپن کی منگیتر ہے، میں اسی سے شادی کروں گا!"

لیکن گھر والوں نے اس کی یہ خواہش پوری نہ کی اور زور دے کر کہا۔

"نہیں۔۔۔ ماہناز کو بھول جاؤ۔۔۔ اب تمہیں یہیں شادی کرنی پڑے گی۔۔۔"

اس طرح شہداد کی شادی زبردستی ایک جگہ کر دی گئی اور جس لڑکی سے اس کی شادی ہوئی تھی اس کا نام مرگو تھا۔ اس کی شادی تو مرگو سے ہو گئی تھی لیکن اس کے دل میں اب

بھی ماہناز بس رہی تھی۔ مرگو سے تو اس نے خاندان والوں کے اصرار پر ایک رسم پوری کی تھی ورنہ اس کا دل و ذہن تو اب بھی ماہناز کی امانت تھے۔ ادھر ماہناز بھی یہ بات اچھی طرح جانتی اور سمجھتی تھی کہ شہداد کی مرگو سے شادی اس کی مرضی کے خلاف ہوئی ہے اور اس نے یہ سب کچھ مجبوری میں کیا ہے چنانچہ اس کے دل میں بھی شہداد کی محبت پہلے کی طرح زندہ اور تازہ تھی۔ تاہم دونوں اپنی اپنی جگہ مجبور و بے بس تھے لیکن وہ ناامید اور مایوس نہیں تھے۔ انھیں یقین تھا کہ ہو سکتا ہے کسی وقت حالات بدل جائیں اور دونوں خاندانوں کی رنجشیں ختم ہو جائیں۔ یہی کچھ سوچ کر وہ دونوں ایک دوسرے کی امید میں زندہ تھے اور کسی اچھے وقت کے انتظار میں تھے۔

جس طرح وقت گزرتے دیر نہیں لگتی اسی طرح کبھی کبھی انسان کا وقت بدلنے میں بھی دیر نہیں لگتی۔ ان دونوں خاندانوں میں جو اختلافات پیدا ہو گئے تھے وہ وقت کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ دھندلے پڑتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آیا جب ان کے ٹوٹے ہوئے رشتے ایک بار پھر سے جڑ گئے اور تعلقات کا سلسلہ پھر سے پیدا ہو گیا۔ دونوں جانب کے لوگ پھر سے ایک دوسرے کے غموں اور خوشیوں میں شریک ہونے لگے۔ حالات کی اس بہتری نے شہداد کے دل میں ایک نئی امید پیدا کر دی۔ اس نے دل میں سوچا کہ یہ بات تو ماہناز کے خاندان والے بھی بخوبی جانتے ہیں اور خود ماہناز بھی جانتی ہے کہ میں نے مرگو سے شادی مجبوری میں کی تھی، اب خاندانوں کے رشتے پھر سے قائم ہو گئے ہیں تو میری شادی میری منگیتر سے ہونی چاہیے۔ اس نے پہلے اپنے گھر والوں کو راضی کیا اور پھر ماہناز کے ماں باپ سے رابطہ کر کے انھیں پیغام بھیجا کہ۔

"ماہناز میری بچپن کی منگیتر ہے۔۔۔ میں نے پہلی شادی مجبوری میں کی تھی۔۔۔ اب دونوں خاندانوں میں رشتے جڑ گئے ہیں تو کیا ہی اچھا ہو جو ہماری شادی ہو جائے۔؟"

ماہناز کے گھر والوں کو جب شہداد کا یہ پیغام ملا تو انھوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ انھیں بھی اس بات کا علم تھا کہ ان کی بیٹی ماہناز اور شہداد ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور یہ

محبت ابھی تک قائم ہے۔ شہداد کی مرگو سے شادی کے بعد بھی دونوں دکھی تھے‘ خاص طور پر ماہناز کی حالت تو قابل رحم ہو رہی تھی۔ گھر والے دیکھتے تھے کہ وہ ہر وقت گم سی رہتی تھی۔ جب بھی دیکھو کھوئی کھوئی سی دکھائی دیتی تھی۔ ان دنوں اس کی شاعری میں بھی حزن و ملال اور غم واندوہ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی پوری شاعری المیہ ہو کر رہ گئی تھی جس میں سماج پر شدید طنز بھی ہوتا تھا۔ وہ یہ بھی سوچ رہے تھے کہ شہداد سردار میر چاکر خان رند کا بیٹا ہے‘ بہتر ہے یہ ٹوٹا ہوا رشتہ پھر سے جوڑ دیا جائے۔ انھوں نے شہداد کو جواب دیا۔

''ہمیں تجویز منظور ہے مگر تمہاری پہلی بیوی کی موجودگی میں ہماری بیٹی کا کیا ہو گا۔؟''

شہداد نے انھیں یقین دلایا کہ۔

''ماہناز میری پہلی اور آخری محبت ہے۔ ماضی میں جو کچھ ہوا سو ہوا‘ اب میں نئی زندگی شروع کرنا چاہتا ہوں۔؟''

جب ماہناز کے گھر والے راضی ہو گئے تو شہداد بہت خوش ہوا۔ اسے خطرہ تھا کہ اس کی پہلی بیوی موجود ہونے کی وجہ سے شاید ماہناز کے ماں باپ رشتے سے انکار کر دیں لیکن جب انھوں نے ہاں کر دی تو اس کی محبت جواب تک چنگاری کی طرح سلگ رہی تھی‘ ایک دم بھڑک اٹھی۔ وہ ایک بار پھر سے ماہناز کے ساتھ زندگی گزارنے کے منصوبے بنانے لگا۔ دوسری جانب جب سے ماہناز کو یہ پتا چلا تھا کہ شہداد نے اس کا رشتہ مانگا ہے تو وہ خوشی میں پھولے نہیں سما رہی تھی پھر جب اسے اس بات کا علم ہوا کہ اس کا رشتہ منظور کر لیا گیا ہے تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس کی بعض سہیلیوں نے اسے سمجھایا بھی کہ

''اس کے گھر میں تو پہلے ہی ایک بیوی مرگو موجود ہے۔؟''

مگر ماہناز کو اس کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ اس نے جواب دیا۔

''اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ شہداد ہمیشہ سے میرا ہے اور میرا رہے گا۔ ہم دونوں بچپن کے منگیتر ہیں اور ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔''

اس طرح رشتے کی بات پکی ہوئی اور چند ہی روز میں شہداد‘ ماہناز کو بیاہ کر لے آیا۔

شادی کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں اس طرح کھو گئے جیسے ان کی زندگی کا اور کوئی مقصد نہ تھا۔ شہداد کو یہ خیال تک نہ رہا کہ اس کی ایک بیوی مرگو بھی گھر میں موجود ہے۔ اس نے اسے بالکل ہی نظرانداز کر دیا تھا اور اس کا یہ طرز عمل مرگو کے لیے بڑا تکلیف دہ تھا۔ اس نے شہداد کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور اسے اپنے وجود کا احساس دلانے کی بہت کوشش کی مگر سب بے سود رہا۔ وہ تو اب ہر وقت ماہناز ہی کے گیت گاتا رہتا تھا۔ یہ ٹھیک تھا کہ ماہناز حسین تھی، ذہین تھی اور سب سے بڑھ کر اس کی محبوبہ تھی لیکن مرگو بھی تو اس کی بیوی تھی۔؟ ایک تو شہداد اس پر سوت لے آیا تھا اور دوسرا اسے بالکل ہی نظرانداز کر رہا تھا جیسے گھر میں اس کا وجود ہی نہ ہو۔ اس کے اسی رویے نے مرگو کے دل میں حسد اور انتقام کی آگ بھڑکا دی تھی۔ وہ اپنے آپ سے کہتی۔

"اس عورت نے میری ساری خوشیاں چھین لی ہیں۔ میں اس سے ایسا انتقام لوں گی کہ یاد کرے گی!"

اس طرح وہ دل ہی دل میں حسد و انتقام کی آگ میں بری طرح جل رہی تھی مگر اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ وہ ماہناز سے کیسے انتقام لے۔؟ وہ کوئی ایک منصوبہ بناتی اور پھر خود ہی اسے ناقابل عمل جان کر ترک کر دیتی۔ آخر ایک روز اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی وہ اپنے آپ سے کہنے لگی۔

"مجھے کوئی ایسی چال چلنی چاہیے جس سے شہداد ماہناز سے بدظن ہو جائے۔ اس طرح وہ اس سے نفرت کرنے لگے گا اور خود بخود میری جانب متوجہ ہو جائے گا۔"

اب رقابت میں وہ ہر ایسا کام کرنے پر تیار تھی جس سے شہداد ماہناز سے بدظن ہو جائے، خواہ وہ کام ناجائز اور کتنا ہی برا کیوں نہ ہو۔ اس نے اس بات کا تہیہ کر لیا تھا کہ اپنی سوت کو شوہر ہی سے ذلیل کرائے گی۔ اسی خیال میں دن رات منصوبے بناتی اور ترکیبیں سوچتی رہتی تھی۔

ایک روز کا ذکر ہے۔ شہداد کا ایک پرانا دوست مہمان آگیا جس کا نام عمر تھا اور وہ لنگڑا

تھا۔ عمر بہت دنوں کے بعد شہداد سے ملا تھا اور وہ اس کا جگری دوست تھا۔ ان دونوں نے اپنے بچپن کا زمانہ ایک ساتھ گزارا تھا اور برسوں اکٹھے کھیلے کودے تھے۔ اس زمانے میں ان کی دوستی اپنے دوسرے ہم جولیوں میں مثالی سمجھی جاتی تھی۔ بڑے ہونے کے بعد دونوں کی مصروفیات بدل گئی تھیں' اب وہ کبھی کبھی ملتے تھے اور ان دنوں تو عمر ایک طویل عرصہ کے بعد شہداد کے گھر آیا تھا۔ یہی وجہ تھی شہداد اس سے مل کے بہت خوش ہوا تھا۔ اس کا جگری دوست اس کے ہاں مہمان آیا تھا' اس نے بڑی گرم جوشی اور محبت سے اس کا استقبال کیا۔

''آؤ یار۔۔۔ بہت دنوں کے بعد ملے ہو۔؟''

''میں تو ملنے بھی آ گیا۔۔۔ تم نے تو یاد بھی نہیں کیا۔!''

دونوں بڑی چاہ سے گلے ملے اور شہداد نے اپنے دوست کی آؤ بھگت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ دونوں گزرے دنوں کو یاد کر کر کے لطف اندوز ہوتے رہے عرصہ بعد ملے تھے اور پھر بچپن کی ان گنت یادیں تھیں' ان کی باتیں ختم ہی نہیں ہو رہی تھیں۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد بھی باتوں میں مصروف رہے اور نہ جانے رات کب تک گپ شپ میں لگے رہے اور پھر ایک دوسرے کو شب بخیر کہہ کے سو گئے۔ اس وقت ماہناز بھی گہری نیند سوئی ہوئی تھی مگر مرگو ابھی تک جاگ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیال آ رہے تھے اور وہ سوچ رہی تھی کہ۔

''آج مناسب موقع ہے۔ میں ماہناز سے شہداد کو بدظن کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہوں۔!''

اس نے جب اس بات کا اطمینان کر لیا کہ شہداد اور عمر سو گئے ہیں اور ماہناز بھی گہری نیند میں ہے تو وہ آہستہ سے اپنے بستر سے اٹھی اور دبے دبے پاؤں عمر کے بستر کے پاس گئی۔ اس وقت وہ ننگے پاؤں تھی تا کہ آہٹ نہ ہو سکے۔ عمر کی چارپائی کے پاس جا کر اس نے عمر کے جوتے پہنے اور ہولے ہولے قدم اٹھاتی ہوئی ماہناز کے بستر تک گئی۔ پھر وہاں سے چلتی ہوئی واپس عمر کے بستر کے پاس آ کر اس کے جوتے اتار دیے اور اس کے بعد بڑی خاموشی سے آ کر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ اس طرح اپنی سازش کی بنیاد رکھ کے خود سو گئی۔

دوسرے روز جب صبح کے اجالے پھیلے تو عمر نے ناشتہ وغیرہ کرنے کے بعد شہداد سے جانے کی اجازت طلب کی اور اس نے اسے خوشی خوشی رخصت کیا۔ یہی نہیں بلکہ تھوڑے فاصلے تک اپنے دوست کو چھوڑنے بھی گیا۔ جب وہ اسے رخصت کر کے واپس آ رہا تھا تو اس نے دیکھا، مرگو گھر کے باہر اس طرح کھڑی تھی جیسے اسی کا انتظار کر رہی ہو۔ شہداد کو قدرے تعجب ہوا اور پوچھنے لگا۔

"تم یہاں کھڑی کس کا انتظار کر رہی ہو۔؟"

جواب میں مرگو ذرا طنزیہ لہجے میں بولی۔

"میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔"

"میرا انتظار۔۔۔؟" کیوں کیا بات ہے۔؟"

اس نے حیرانی سے مرگو کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"یہ عمر جسے تم اپنے بچپن کا دوست بتاتے ہو، اچھا آدمی نہیں ہے۔۔۔ اسے تو تمہاری عزت تک کا خیال نہیں ہے۔!"

مرگو کے اتنا کہنے پر اسے تعجب کے ساتھ غصہ بھی آیا اور وہ اسے ڈانٹتے ہوئے بولا۔

"کیا فضول باتیں کر رہی ہو۔؟ تمہیں کیسے پتا چل گیا کہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔؟"

اب موقع آ گیا تھا کہ مرگو اپنا آخری تیر نشانے پر چھوڑے۔ اس نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"شاید تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارا بچپن کا جگری دوست رات بھر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلچھرے اڑاتا رہا ہے!"

یہ سنتے ہی شہداد نے آگے بڑھ کر اسے ایک تھپڑ مارا اور انتہائی غصے میں کہنے لگا۔

"تم مفت میں تہمت لگا رہی ہو۔۔۔ تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے"۔؟

"میرے پاس ثبوت ہے۔۔۔ آؤ میں تمہیں ثبوت پیش کرتی ہوں۔"

وہ شہداد کو کلائی سے پکڑ کے گھر کے اندر لے گئی اور اسے عمر کے جوتوں کے نشان

دکھاتے ہوئے بولی۔

"یہ رہا میرا ثبوت۔ دیکھو یہ عمر کے جوتوں کے نشان۔ اس کے بستر سے ماہناز کے بستر تک جاتے ہیں اور پھر واپس آتے ہیں۔ انھیں غور سے دیکھو اور پھر مجھے بتاؤ میں سچ کہہ رہی ہوں یا جھوٹ۔؟"

شہداد نے دیکھا تو واقعی جس بستر پر رات عمر سویا تھا وہاں سے اس کے جوتوں کے نشان ماہناز کی چارپائی تک جاتے تھے اور پھر لوٹنے کے نشانات بھی موجود تھے۔ وہ یہ سب کچھ دیکھ کر سکتے میں آگیا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ مرگو نے اس کے لیے کیسا جال بچھایا تھا۔؟ اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مرگو کو کیا جواب دے۔؟ اپنے دل میں بار بار سوچ رہا تھا کہ ماہناز جو مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے' وہ مجھے اس طرح دھوکا نہیں دے سکتی؟ کیا وہ ایسے کردار کی مالک ہے۔؟ کیا اس کی برسوں کی محبت سب ڈھونگ تھی۔؟ پھر وہ خود ہی کہنے لگتا۔ نہیں' نہیں' ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مگر پھر یہ جوتوں کے نشانات۔؟ ان کا کیا مقصد ہے۔؟ وہ اسی طرح کے خیالات میں الجھا ہوا تھا اور اس کے قریب ہی مرگو کھڑی اپنی کامیابی پر مسکرا رہی تھی۔ وہ یہ بات جانتی تھی کہ اگر قبیلے میں کوئی عورت اس قسم کا جرم کرے تو اس کا شوہر اسے قتل کر دیتا ہے اور اس کا خیال تھا' اب ماہناز کی موت یقینی ہے مگر مرگو کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔ شہداد نے پہلے تو یہی ارادہ کیا کہ ماہناز کو قتل کر دے لیکن وہ اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور تھا اور ایسا کرنا اس کے بس میں نہیں تھا البتہ وہ ماہناز کے بارے میں بدگمانی کا بری طرح شکار ہو چکا تھا۔ اسے اس کے کردار پر شبہ ہی نہیں بلکہ یقین ہو چکا تھا۔ وہ غصے میں آگ بگولا ہو کر ماہناز کے پاس گیا تو اس نے حسب معمول بڑے پیار سے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا مگر جب اس نے شہداد کو اس طرح غصے میں بھرا ہوا دیکھا تو حیران رہ گئی۔ شہداد نے جاتے ہی کچھ کہے سنے بغیر اسے بالوں سے پکڑ کے گھسیٹا اور یہ کہتے ہوئے مارنے لگا۔

"میں نے تمہاری محبت دیکھ لی۔۔۔ تم اتنا عرصہ مجھ سے فریب کرتی رہی ہو۔ تم نے میری

عزت کو داغ لگایا ہے۔!"

"مگر میں نے کیا کیا ہے۔۔۔؟ مجھ سے کونسا قصور ہوا ہے۔۔۔؟ مجھے کچھ پتا تو چلے۔۔۔؟؟"

اس نے روتے ہوئے شہداد سے دریافت کیا مگر وہ غصے میں پاگل ہو رہا تھا اور اس کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے اسے پیٹتے ہوئے گرج کر کہا۔

"اسی وقت میرے گھر سے نکل جاؤ۔۔۔ ورنہ میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گا۔!"

ماہناز نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے کچھ کہہ سکے مگر شہداد نے اسے اتنا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ چنانچہ وہ بیچاری آنسو بہاتی ہوئی اپنے میکے چلی گئی۔ وہ میکے تو چلی گئی تھی لیکن اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ جو شخص اس کی محبت میں دیوانہ تھا، اس پر اس طرح فدا تھا، اسے یہ یکایک کیا ہو گیا۔؟ اس نے ساری محبت کو نظر انداز کر کے اس قدر مارا پیٹا اور بے عزت کر کے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ اسے یہ بات تو کھٹک گئی تھی کہ یقیناً یہ سب مرگو کا کیا کرایا ہے مگر صفائی کا موقع تو ملنا چاہیے۔؟ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر مجھ پر کوئی الزام لگایا گیا ہے تو مجھ سے اس کے بارے میں پوچھنا تو چاہیے تھا۔؟ نہ اس نے کوئی جرم کیا اور نہ اس سے کوئی گناہ سرزد ہوا، اس کے باوجود اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا گیا۔ اس کی زندگی کی یہ تلخی اس کی شاعری میں بھی آ گئی تھی۔ اس نے شہداد کو مخاطب کرتے ہوئے ایک نظم میں کہا۔

میں نے تمہارے گھوڑے کی باگ تھام لی\
اور دوسرا ہاتھ تمہارے جوتے پر رکھ کر کہا\
اے میرے سردار! مجھ سے اگر کوئی غلطی ہوئی ہے\
تو اللہ کے نام پر مجھے معاف کر دو\
مگر تم نے بڑی بے دردی سے مجھے دھکا دیا\
میں زمین پر گر پڑی اور میری عطر بیز زلفیں خاک آلودہ ہو گئیں"

اب ماہناز اپنے میکے میں اس امید میں بیٹھی تھی کہ چند روز میں جب شہداد کا غصہ

ٹھنڈا ہو جائے گا تو اسے یقیناً اپنی غلطی کا احساس ہو گا۔ اس لیے وہ اس ہتک آمیز سلوک کو بھی بھول گئی تھی جو اسے گھر سے نکالتے وقت کیا گیا تھا۔ اسے آس تھی کہ جونہی شہداد کا غصہ ٹھنڈا ہوا وہ اسے لینے آ جائے گا مگر بہت دن گزرنے کے باوجود وہ اسے لینے نہ آیا اور نہ اس نے کسی کو بھیج کر اس کی خیر خبر معلوم کی۔ ایسے لگتا تھا جیسے اس نے ماہناز کو بالکل ہی فراموش کر دیا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کے ماں باپ بیچارے مایوس ہو گئے تھے۔ ان کے لیے تو یہی بات بڑے دکھ کی تھی کہ ان کی بیٹی میکے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ لیکن اس پر تو بد کرداری کا الزام لگا کے گھر سے نکال دیا گیا تھا جو ان کی بدنامی کا باعث تھا۔ تاہم ماہناز اس رنج و غم اور مایوس کن حالات کے باوجود ابھی تک ناامید نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنے اشعار میں اپنا دکھ بیان کرتی ہے۔

اے راہ گیرو! اگر تم وہاں سے گزرو
تو مجلس کے نوجوانوں کو میرا سلام کہنا

خصوصاً اس بانکے شہداد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ۔

اے میرے چچا زاد بھائی! تم اخلاقی معیار اور اخلاقی بندھنوں کو توڑ چکے ہو۔ اپنے بیوی کے عیب گنوانے میں فخر محسوس کرتے ہو۔"

وہ جان گئی تھی کہ اس پر مرگو کا جادو پوری طرح چل چکا ہے اور اسی کی وجہ سے میرے ساتھ یہ حالات پیش آئے ہیں اسی لیے وہ اپنی ایک نظم میں کہتی ہے۔

"تمہاری عقل اس مشکیزے کی مانند ہے
جو گڈریوں کے کندھوں پر لٹکا رہتا ہے
اور جس کا ایک سرا ہر وقت خشک رہتا ہے

اسی لیے مرگو تمہیں فریب دینے میں کامیاب ہو گئی ہے"

ماہناز جانتی تھی کہ وہ بے گناہ اور پاک دامن ہے' اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ

تہمتوں اور الزامات کا نتیجہ ہے۔ آخر اس نے طے کیا کہ وہ خود جائے گی شداد سے مل کے اس کے ظالمانہ برتاؤ کے بارے میں دریافت کرے گی اور اپنی بے گناہی ثابت کرے گی لہٰذا اس نے اپنے باپ اور بھائی کو ساتھ لیا اور شداد کے پاس پہنچ گئی۔ اس سے کہا۔

"مجھ پر ناحق تہمت لگائی گئی ہے۔ میں بے گناہ اور پاک دامن ہوں۔!"

اس کے باپ اور بھائی نے بھی شداد کو سمجھایا لیکن وہ تو یہی کہے جا رہا تھا کہ اس نے عمر کے ساتھ جسمانی تعلقات قائم کیے ہیں۔ جب وہ کسی طور نہ مانا تو ماہناز نے کہا۔

"میں اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے ہر طرح کی آزمائش سے گزرنے پر تیار ہوں۔!؟"

اس زمانے میں کسی کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے جو روایتی طریقہ رائج تھا وہ یہ تھا کہ ایک کڑھاؤ میں تیل بھر کے اس کے نیچے آگ جلا دی جاتی تھی اور جب تیل کھولنے لگتا تھا تو اس میں ایک انگوٹھی ڈال دی جاتی تھی۔ جس شخص پر کوئی الزام ہوتا تھا اسے اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کی غرض سے اس کھولتے ہوئے تیل میں ہاتھ ڈال کر وہ انگوٹھی نکالنا ہوتی تھی۔ کڑھاؤ میں اتنی گہرائی ہوتی تھی کہ انگوٹھی نکالنے والے کا ہاتھ کہنی تک تیل میں ڈوب جاتا تھا۔ اس طرح اگر وہ واقعی مجرم یا قصوروار ہوتا تو اس کا ہاتھ اور کلائی جلتے ہوئے تیل میں جھلس جاتی۔ اگر وہ حقیقت میں بے گناہ ہوتا تو اسے کوئی نقصان نہ پہنچتا اور اس کی بے گناہی میں کوئی شک نہ رہ جاتا۔ ماہناز کے جھوٹ سچ کو جاننے کے لیے بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ لوگوں کو جمع کیا گیا تو انھوں نے یہی رائے دی۔

"تیل کا کڑھاؤ گرم کیا جائے اور ماہناز کی آزمائش کی جائے۔!"

"اس طرح جھوٹ سچ کا خود بخود پتا چل جائے گا۔"

ہر ایک نے اس پر اتفاق کا اظہار کیا جس پر ماہناز سے پوچھا گیا۔

"کیا تم اس آزمائش کے لیے تیار ہو۔؟"

"میں تیار ہوں۔ میں اپنی پاک دامنی ثابت کرنے کے لیے ہر آزمائش سے گزرنے کے لیے تیار ہوں۔"

شہداد سے بھی رائے طلب کی گئی تو اس نے بھی اس تجویز کی حمایت کی کیونکہ اس سے بڑا امتحان نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ اسی وقت کڑھاؤ لے کر اس میں تیل بھرا گیا اور پھر اس کے نیچے آگ جلا کر گرم کیا گیا جب تیل کھولنے لگا تو اس میں انگوٹھی ڈال دی گئی۔ اس کے بعد قبیلے کے چند معزز افراد نے ماہناز سے کہا۔

"اب تم ہاتھ ڈال کر کڑھاؤ میں سے انگوٹھی نکالو۔!"

ماہناز کا دل اور دامن صاف تھا اس لیے وہ بالکل خوفزدہ دکھائی نہیں دے رہی تھی بلکہ اس کے چہرے پر کسی حد تک اطمینان تھا۔ وہ دل میں سوچ رہی تھی، اس طرح اس کی بے گناہی ثابت ہو جائے گی اور وہ الزام کی جس آگ میں جل رہی ہے اس سے نجات مل جائے گی۔ جب انگوٹھی نکالنے کے لیے کہا گیا تو اس نے پہلے ایک نظر ارد گرد کھڑے لوگوں کی طرف دیکھا، پھر شہداد اور مرگو پر ایک نگاہ ڈالی اور اس کے بعد بڑے اطمینان سے آگے بڑھی۔ اس نے آہستہ سے کلائی پر سے آستین ہٹائی اور دل میں کہا۔

"اے اللہ! تو دلوں کا بھید جانتا ہے۔ تجھے معلوم ہے مجھے بے گناہی کی سزا دی جا رہی ہے!"

اس نے بلند آواز میں بسم اللہ پڑھی اور ہاتھ کھولتے ہوئے تیل کے کڑھاؤ میں ڈال دیا۔ چاروں طرف لوگ دم بخود کھڑے حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ ماہناز نے بڑے اطمینان سے انگوٹھی نکال لی اور اسے ذرا بھی نقصان نہ پہنچا۔ ایسے لگتا تھا جیسے اس نے کھولتے ہوئے تیل میں نہیں، پانی میں ہاتھ ڈالا ہو۔ جونہی اس نے انگوٹھی نکالی پاس کھڑے لوگ ایک دوسرے سے کہنے لگے۔

"ماہناز بے گناہ ہے۔۔۔ اس پر الزام لگایا گیا ہے۔۔۔ وہ بے گناہ ہے!"

شہداد جو چند لمحے پہلے ماہناز کو قہر آلود نظروں سے دیکھ رہا تھا، اب ندامت کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ اس نے بھی دیکھ لیا تھا کہ ماہناز واقعی بے گناہ تھی۔ دل ہی دل میں افسوس کر رہا تھا کہ محض مرگو کی بات پر یقین کر کے اس نے اسے اس قدر دکھ دیے تھے۔ وہ جلدی سے آگے بڑھا مگر ماہناز پیچھے ہٹ کر بولی۔

"میری سوکن نے رقابت کی وجہ سے مجھ پر الزام لگا کر مجھے بدنام کیا۔ اس نے میری پاک دامنی پر تہمت لگائی اور تم نے اس کی باتوں میں آ کر مجھے گھر سے نکال دیا اور صفائی کا موقع بھی نہ دیا۔"

پھر اس نے قریب کھڑے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔

"آپ لوگوں کے سامنے میری بے گناہی تو ثابت ہو گئی۔ اب میں چاہتی ہوں اسی کھولتے ہوئے تیل میں مرگو بھی ہاتھ ڈالے تاکہ یہ پتا چل جائے' اس نے مجھ پر جو الزام لگایا تھا اس میں حقیقت کتنی ہے۔؟"

"ٹھیک ہے۔۔ اسے بھی اس آزمائش سے گزرنا چاہیے۔!"

سب نے تائید کی اور کہنے لگے۔

"مرگو کہاں ہے۔۔۔؟ اس کو لاؤ۔۔۔ ابھی تو یہاں تھی' کہاں چلی گئی۔۔۔؟"

مرگو کو تو پہلے ہی معلوم تھا کہ ماہناز بے گناہ ہے' اس لیے وہ سب کی آنکھ بچا کر وہاں سے چلی گئی تھی۔ شہداد نے آگے بڑھ کے ماہناز سے بات کرنی چاہی تو اس نے بات کرنے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ اس کے دل میں اب بھی محبت کی چنگاری سلگ رہی تھی لیکن اس نے جو دکھ دیے تھے اور جس طرح بے عزتی کی تھی' اس کے بعد اتنی گنجائش ہی نہیں رہی تھی کہ وہ اس سے بات کرتی۔ شہداد نے منت کرتے ہوئے کہا۔

"پہلے میری بات سن لو' پھر جو چاہے فیصلہ کرنا؟"

لیکن ماہناز نے جواب دیا۔

"جب تم نے میری پاک دامنی پر الزام لگا کے مجھے گھر سے نکالا تھا' کیا اس وقت میری بات سنی تھی۔۔۔؟ کیا تم نے مجھے صفائی کا موقع دیا تھا۔۔۔؟ اس وقت تمہاری محبت کہاں گئی تھی۔۔۔؟"

شہداد اپنی جگہ اس قدر شرمندہ تھا کہ اسے کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ اسے اپنی غلطی کا شدید احساس تھا اور دل میں پچھتا رہا تھا۔ کاش! وہ مرگو کی باتوں میں نہ آتا اور حقیقت

جاننے کی کوشش کرتا تو آج یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔ محض بدظنی کی وجہ سے اس نے ماہناز کو بھی اتنے دکھ دیے اور خود بھی پریشانیوں کا سامنا کیا۔ اس نے ماہناز کے باپ سے کہا۔

"آپ ماہناز سے کہیں کہ وہ میری غلطی معاف کردے؟!"

مگر اس نے جواب میں کہا۔

"معافی کا وقت گزر چکا ہے۔ یہ سب کچھ تمہارا اپنا کیا کرایا ہے۔ تم اس کی سوت کے بہکاوے میں آ گئے اور ماہناز کے ساتھ خود کو بھی دکھ کی بھٹی میں جھونک دیا۔!"

شہداد نے ماہناز کے بھائیوں سے مدد طلب کی تو انھوں نے بھی یہی جواب دیا۔

"یہ سب کچھ تمہیں اس وقت سوچنا چاہیے تھا جب تم نے ہماری بہن کے دامن پر بدنامی کا داغ لگانے کی کوشش کی تھی۔"

اس طرح شہداد کو ہر طرف سے مایوسی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا مگر وہ اس کے باوجود ناامید نہیں ہوا تھا۔ اسے اب بھی یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن ضرور ماہناز کے دل میں دبی ہوئی محبت جاگ پڑے گی، وہ اس کی غلطی معاف کر دے گی اور دونوں ایک بار پھر سے ایک دوسرے سے مل جائیں گے۔ وہ تو یہ امید لگائے بیٹھا تھا لیکن ماہناز نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اس کے ساتھ نہیں رہے گی۔ یہ اشعار شاید اس نے اسی زمانے میں کہے تھے جن میں وہ کہتی ہے۔

"اے میرے ماموں کے کم عقل بیٹے
تم نے میری سوکن کی جھوٹی باتوں پر یقین کر لیا
مجھے مارا اور گالیاں دیں
یہ سب باتیں تو کم ذات کے لیے ہوتی ہیں
مجھ جیسی گلبدن کے لیے نہیں"

ماہناز چونکہ شہداد کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھی اس لیے اس نے اس سے طلاق کا مطالبہ کیا۔ جیسے ہی شہداد نے طلاق کا سنا وہ پریشان ہو گیا۔ اگرچہ اس نے بڑی زیادتی کی تھی، اسے بڑے دکھ پہنچائے تھے مگر اس کے دل میں اب بھی ماہناز کی محبت موجود تھی۔ اس نے

قبیلے کے لوگوں سے کہا وہ ماہناز کو سمجھائیں لیکن ان کا بھی یہی کہنا تھا کہ۔
"تم نے اس کے ساتھ جو کچھ کیا ہے اس کے بعد اس کا طلاق مانگنا بجا ہے۔ تمہیں اسے طلاق دے دینی چاہیے کیونکہ اب وہ تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔!"

آخر مجبور ہو کر شہداد نے ماہناز کو طلاق دے دی اور وہ اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ چلی گئی۔ اس کے یہ اشعار اسی زمانے کے ہیں جن میں وہ کہتی ہے۔

"تم نے خوشی سے طلاق کی تین ٹھیکریاں
گن کر مجھے دے دیں اور۔
میں نے مجبوری کے عالم میں
انھیں اپنے دوپٹے کے پلو میں باندھ لیا"

ماہناز تو اپنے میکے چلی گئی تھی مگر شہداد کا برا حال تھا۔ وہ پاگل سا ہو کر ادھر ادھر گھومنے لگا۔ نہ اسے کھانے پینے میں دلچسپی رہی تھی اور نہ ہی اب وہ لوگوں سے ملتا جلتا تھا۔ اس نے یار دوستوں کی محفلیں چھوڑ دیں اور تنہائی میں زندگی بسر کرنے لگا۔ بستی سے نکل جاتا اور پہروں جنگل اور پہاڑوں میں مارا مارا پھرتا رہتا۔ دوسری طرف ماہناز کی حالت بھی عجیب تھی۔ اس نے شہداد سے طلاق کا مطالبہ خود کیا تھا اور اب طلاق حاصل کرنے کے بعد اس کی زندگی بے مقصد سی ہو کر رہ گئی تھی۔ جس طرح شہداد کے دل میں اس کی محبت کا چراغ روشن تھا' اسی طرح تمام نفرتوں کے باوجود ماہناز کے دل میں بھی اس کی محبت موجود تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اس نے طلاق تو شہداد سے انتقام لینے کے لیے حاصل کی تھی اور اب وہ اسی کے لیے پچھتا رہی تھی۔

جب ماہناز کی عدت کے دن پورے ہو گئے تو اس کے ماں باپ نے قبیلے کے لوگوں سے مشورہ کیا اور طے یہ کیا کہ شہداد نے عمر کے ساتھ ناجائز تعلقات کا الزام لگایا تھا' اب اس کی شادی عمر ہی کے ساتھ کر دینی چاہیے۔ جب اس سلسلے میں ماہناز سے بات کی گئی تو اس نے کہا۔

”ابھی تو میری عدت کے دن پورے ہوئے ہیں‘ مجھے کچھ سوچنے دیں۔؟“
مگر گھر والوں نے اصرار کیا کہ۔
”تمہیں شادی تو کرنی ہی ہے۔ اس لیے اگر عمر سے ہو جائے تو بہتر ہو گا۔“

اگرچہ ماہناز ابھی دوسری شادی کے حق میں نہیں تھی لیکن خاندان والوں نے اصرار کیا تو اس نے سوچا‘ چلو شہداد نے میری پاک دامنی پر جو تہمت لگا کے میری بے عزتی کی تھی‘ اس طرح عمر سے شادی کر کے میں اس کا انتقام لے لوں گی۔ یہ سوچ کر وہ اس شادی پر راضی ہو گئی مگر ساتھ ہی اس نے یہ شرط رکھی کہ۔

”جب تک شہداد زندہ ہے وہ اسی کی رہے گی کیونکہ وہ اب بھی اس سے محبت کرتی ہے۔“

چنانچہ اس کی عمر سے شادی کر دی گئی۔ اور جونہی اس شادی کی خبر شہداد کو ملی تو اس کے رہے سہے اوسان بھی جاتے رہے۔ وہ تو پہلے ہی نیم پاگل سا ہو رہا تھا‘ اوپر سے ماہناز کی عمر کے ساتھ شادی کا سن کر واقعی پاگل ہو گیا تھا۔ اس کی حالت آہستہ آہستہ ایسی ہو گئی کہ وہ چلنے پھرنے سے بھی رہ گیا۔ ہر وقت اس کے لبوں پر ماہناز کا نام تھا اور وہ اسی کی یاد میں زندہ تھا۔ اس کی ایسی حالت کی خبر کسی نہ کسی طرح ماہناز تک بھی پہنچ گئی اور وہ بے چین ہو گئی۔ اس سے صبر نہ ہو سکا اور نہ چاہتے ہوئے بھی شہداد کے پاس پہنچ گئی۔

وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ شہداد بہت زیادہ کمزور ہو چکا تھا اور بستر پر اس طرح پڑا ہوا تھا جیسے زندگی کے آخری سانس لے رہا ہو۔ ماہناز اسے دیکھتے ہی بھاگ کر اس کی طرف بڑھی شہداد نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اس میں اتنی طاقت نہیں جو اٹھ سکتا۔ وہ لیٹے لیٹے بڑی حسرت سے اسے دیکھ رہا تھا اور اس میں گفتگو کرنے کا بھی یارا نہ رہا تھا۔ ماہناز نے اس کے بستر پر بیٹھ کر اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور پیار سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ شہداد ٹکٹکی لگائے ماہناز کی طرف اس طرح بے حس و حرکت دیکھ رہا تھا جیسے پتھر کا ہو گیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ماہناز کی آنکھیں بھی آنسوؤں میں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ شہداد کے خشک اور بے جان ہونٹوں پر رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس

نے زندگی کی آخری سانس لی اور اپنی پہلی اور آخری محبت کے زانوؤں پر سر رکھے دم توڑ کر اپنے تمام گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔

عزت اور مہرک

بلوچستان کی یہ عوامی داستان انیسویں صدی عیسوی سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے عہد کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس کا مرکزی کردار بلوچی زبان کا ایک مشہور شاعر ملا عزت ہے جو اردو کے نامور شاعر مرزا غالب کا ہم عصر تھا اور غالب کا زمانہ ۱۷۹۷ء سے ۱۸۶۹ء تک کا ہے۔ عزت کی محبوبہ پیروان نامی قصبے کی رہنے والی تھی، اس کا باپ دنیاوی دولت سے مالا مال تھا اور مہرک کو قدرت نے حسن و جوانی کی دولت سے نوازا تھا۔ اس کا اصل نام تو مہربانو تھا لیکن بچپن میں پیار سے اسے سب مہرک کہتے تھے اور پھر وہ اسی نام سے جانی پہچانی جانے لگی۔ عزت اس کے بارے میں اپنی ایک نظم میں کہتا ہے۔

"پیروان میں مہرک نام کی ایک حسین و جمیل دوشیزہ رہتی ہے،
اس کی نرگسی آنکھوں میں شراب کا سا نشہ ہے،
اس کے رخساروں میں شفق کی سی سرخی ہے،
اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ ایک عالم کو تباہ کرنے کے لیے کافی ہے،
اور اس کی سیاہ زلفیں ناگنوں کی طرح ہیں،

ہر راہ رو کو ڈسنے کے لیے تیار رہتی ہیں"۔

اس کہانی کا آغاز ایرانی بلوچستان کے علاقہ سرباز کے قصبے پیروان سے ہوتا ہے اور اس کا انجام بھی یہیں ہو جاتا ہے۔ شاعر ملا عزت کے عشق کا یہ قصہ ناکامی سے شروع ہوتا ہے اور ناکامی پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اپنی اسی ناکامی کی وجہ سے مہرک کے عشق کے گیت گانے والے اس شاعر نے اس قصبے کو بد دعا دیتے ہوئے کہا تھا۔

اے پیروان! تیری سرزمین نے
مہرک جیسی حسین و جمیل دوشیزہ کو نگل لیا
خدا کرے تیری ان رنگین فضاؤں پر
بھیانک موت کی اداسیاں چھا جائیں

کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں سرباز کے علاقے میں ایک خوشحال اور سبزے میں گھرا ہوا قصبہ آباد تھا۔ اگرچہ یہ قصبہ زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن یہاں کے لوگ امن چین کی زندگی گزار رہے تھے۔ وہاں دولت کی ریل پیل تو نہیں تھی لیکن لوگ ہنسی خوشی سے رہ رہے تھے۔ اسی قصبے میں ایک شخص سالک بھی رہتا تھا جو دولت مند تھا اور قصبے بھر میں اسے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اسے روپے پیسے کی ضرورت تو نہ تھی لیکن وہ اولاد کی دولت سے محروم تھا جس کی کمی اللہ نے بہت جلد پوری کردی تھی۔ اس کے گھر میں ایک خوبصورت بیٹی پیدا ہوئی اور پورا گھر خوشیوں میں بھر گیا۔ چونکہ سالک کی یہ پہلی اولاد تھی اور بڑی آرزوؤں کے بعد نصیب ہوئی تھی اس لیے اس نے جی بھر کے خوشیاں منائیں۔ خوشیاں کیا تھیں، ایک طرح کا جشن منایا جا رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"قصبے والوں کی ایسی دعوت کی جائے کہ لوگ اسے ہمیشہ یاد رکھیں"۔

یوں تو وہ بیٹے کی آس لگائے بیٹھا تھا لیکن جب بیٹی پیدا ہوئی تو وہ اس سے بھی انتہائی خوش تھا۔

جو خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھی۔ جو بھی اسے دیکھتا یہی کہتا۔

"ماشاءاللہ! سارے قصبے میں یکتا ہے"

"اللہ نظرِبد سے بچائے"۔

سالک اور اس کی بیوی کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ انھوں نے بیٹی کے بہت سے ناموں پر غور کیا اور آخر اس کا نام مہرہانو رکھا۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی' خدمت کے لیے نوکر چاکر موجود تھے اور اس طرح مہرہانو بڑے ناز و نعم سے پرورش پانے لگی۔ جوں جوں بڑی ہو رہی تھی توں توں اس کا حسن نکھرتا جا رہا تھا۔ بڑی بوڑھیوں کا کہنا تھا۔ "مہرہانو واقعی مہربن کر چمکے گی"۔

اس کو جو کوئی بھی دیکھتا تھا اس کے حسن کی تعریف کیے بغیر نہ رہتا تھا اور سب اسے مہرہانو کی بجائے مہرک کے نام سے پکارتے تھے۔ جب وہ ذرا بڑی ہوئی تو اس کی نسبت اس کے چچا زاد سے کر دی گئی جو اس سے بہت محبت کرتا تھا اور یہ بھی اسے چاہتی تھی اس لیے سارے خاندان والوں کا خیال تھا کہ:

"یہ جوڑی مثالی بنے گی"۔

مہرک بچپن سے آگے بڑھ کے نوعمری کی منزل پر پہنچ گئی اور پھر جوانی کی طرف سفر کرنے لگی۔ وقت کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے وہ عمر کی منزلیں طے کر رہی تھی ویسے ہی اس کا حسن بھی کھلتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ جب وہ جوانی کی سرحد میں داخل ہوئی تو اس کی خوبصورتی کی شہرت بھی پھیلنے لگی۔ پیروان قصبے کے نوجوان جب بیٹھ کر آپس میں ادھر ادھر کی باتیں کرتے تو مہرک کے حسن کا ذکر ضرور آ جاتا۔ یہی نہیں بلکہ ہر نوجوان اس کو اپنانے کی تمنا کرنے لگا تھا اور بہت سوں کی کوشش تھی کہ کسی طرح مہرک اس کی ہو جائے۔ صرف یاروں دوستوں کی محفلوں ہی میں یہ تذکرے نہیں ہوتے تھے' اس کے علاوہ بھی اس کے حسن کا چرچا تھا اور بعض شاعر بھی اس کی تعریف میں نظمیں کہہ رہے تھے جن میں بلوچی کا شاعر ملا فاضل سب سے پیش پیش تھا۔ اس کی شاعری کا موضوع مہرک تھی اور شاعری کے ساتھ ساتھ مہرک کی شہرت بھی پھیل رہی تھی۔ اس کی نظمیں سینہ بہ سینہ لوگوں تک جاتیں اور جن لوگوں نے مہرک کے بارے میں نہیں سنا تھا' وہ بھی ملا فاضل کی شاعری سن سن کر اس کے مداح ہو رہے

تھے۔ فاضل اپنے وقت کا مقبول بلوچی شاعر تھا اس لیے اس کی مقبول شاعری کے دوش بدوش مہرک کے چرچے بھی بڑھ رہے تھے۔ آج بھی اس کی شاعری میں مہرک کا حسن زندہ و تابندہ نظر آتا ہے اور لوگ اسے پڑھ کے ماضی کے حسن کو یاد کرنے لگتے ہیں دلچسپ بات یہ ہوئی کہ مہرک کے حسن کی تعریف تو فاضل نے اپنی شاعری میں شروع کی تھی مگر اس پر عاشق ایک دوسرا شاعر ہوا۔ فاضل کا ایک دوست تھا جن کا نام ملا بوہر تھا' یہ بھی شاعر تھا اور یہ دونوں ہر وقت اکٹھے رہتے تھے کیونکہ دونوں شاعر تھے' ہم عصر تھے' اور ہم مذاق دوست تھے۔ ایک روز کا ذکر ہے ملا فاضل اور ملا بوہر دونوں سرباز گئے۔ ان کا گزر پیروان کے قصبے سے ہوا تو انھوں نے مہرک کے حسن کے بارے میں سنا۔ انھیں بھی اشتیاق ہوا کہ۔

"کسی طرح مہرک کو دیکھا جائے۔ کیا واقعی وہ اتنی حسین ہے جتنی لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں۔؟"

انھوں نے اس کا اتا پتا دریافت کیا اور اس علاقے میں گئے جہاں اس کا گھر واقع تھا۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ جب وہ مہرک کے گھر کے قریب گئے تو اس وقت وہ اپنے گھر کے دریچے میں کھڑی تھی۔ پہلے ملا بوہر کی اس پر نظر پڑی تو اس نے فاضل کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ دیکھو۔۔ ادھر۔۔ شاید یہی مہرک ہے۔۔۔؟"

فاضل نے چونک کر اس طرف دیکھا تو وہ دریچے میں ایسے کھڑی تھی کہ اس کے لمبے لمبے سیاہ بال کسی جال کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ بکھرے ہوئے بالوں میں سے اس کا سرخ و سفید چہرہ ایسے چمک رہا تھا جیسے بادلوں میں سے چاند جھانک رہا ہو۔ وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"واقعی لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔۔۔ مہرک اپنا جواب آپ ہے۔۔"

اس وقت دونوں حیران ہو کے دریچے پر نظریں جمائے کھڑے تھے۔ اگرچہ وہ دونوں دیوانہ وار مہرک کی جانب دیکھ رہے تھے لیکن ملا فاضل کی حالت دیدنی تھی۔ وہ تو مہرک کو ایک

نظر دیکھتے ہی اس کا شیدا ہو گیا' دونوں پیروان سے واپس آ گئے مگر فاضل کے دل میں مہرک کی خوبصورتی نقش ہو گئی تھی۔ وہ اس کی تعریف میں نظمیں کہنے لگا اور اس کی شاعری کی وجہ سے مہرک کا چرچا کہیں زیادہ بڑھنے لگا۔ اسی فاضل کا ایک دوست تھا جس کا نام ملا عزت تھا۔ یہ بھی اس وقت اچھے شاعروں میں سے ایک تھا لیکن یہ عمر میں فاضل سے چھوٹا تھا۔ یہ جوان تھا اور خوبصورتی میں بھی کم نہ تھا۔ فاضل چونکہ مہرک کو دیکھ آیا تھا اس لیے وہ اکثر عزت کے آگے اس کی تعریفیں کیا کرتا تھا۔۔۔ کبھی کہتا۔

"اس کی آنکھیں دیکھ کر آدمی سحر زدہ ہو جاتا ہے۔ اس کے سیاہ لمبے بال بکھر جائیں تو ایسے لگتا ہے جیسے کالی گھٹا چھا گئی ہو۔ اس کا چہرہ طلوع ہوتے ہوئے سورج کی طرح ہے۔"

اور کبھی کہتا۔

"مہرک جیسی حسین اور دوشیزہ پیروان تو کیا پورے بلوچستان میں نہیں ہو گی۔ اگر تم اسے ایک نظر دیکھ لو تو اپنا آپ بھول جاؤ۔ وہ تو سر سے پاؤں تک ایک مرصع نظم ہے۔ اس کا انگ انگ ایک خوبصورت اور معنی خیز شعر ہے۔ اس پر شاعروں کی ساری تخلیقات نثار ہیں۔"

یوں وہ عزت کے آگے اکثر مہرک کے حسن کی تعریف کرتا رہتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنے اشعار میں بھی اس کے گن گاتا رہتا تھا۔ اس کی ان روز روز کی تعریفوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملا عزت مہرک کو دیکھے بغیر اس کے حسن کا دیوانہ ہو گیا۔ اس نے اپنے دل میں پکا ارادہ کر لیا کہ وہ پیروان جا کے مہرک کو دیکھے اور اس کے حسن کا نظارہ کرے۔ عزت پیشے کے لحاظ سے سنار تھا اور جو زیورات وغیرہ تیار کرتا تھا' وہ قریہ قریہ گھوم کر فروخت کر کے اپنی گزر بسر کرتا تھا۔ وہ اپنے آپ سے کہنے لگا۔

"اس بار زیورات فروخت کرنے کی غرض سے مجھے پیروان جانا چاہیے۔ اس طرح اپنے کام کے ساتھ ساتھ میں مہرک کو دیکھ سکوں گا۔"

چنانچہ اس نے پیروان جانے کی تیاری شروع کر دی۔ جب مطلوبہ تعداد میں زیورات

تیار کر لیے تو اپنے دوست ملا فاضل کے پاس گیا اور اس سے کہنے لگا۔
"میں بھی مہرک کو دیکھنے کے لیے پیروان جا رہا ہوں۔ دیکھتا ہوں‘ تم جس قدر اس کی تعریفیں کرتے ہو کیا واقعی وہ اتنی حسین ہے یا پھر تم محض شاعری کرتے ہو۔؟"
جواب میں فاضل نے جو اشعار کہے‘ وہ کچھ اس طرح تھے۔

مہرک کی زلفیں زہریلی ناگنوں کی طرح تمہاری جوانی کو ڈس لیں گی
اس کی خمار آلود آنکھیں تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مدہوش کر دیں گی
اس کے سرخ لبوں کا تبسم تمہاری زندگی کے سمندر میں طوفان برپا کر دے گا
اور تم مہرک مہرک پکارتے پھرو گے۔!

جواب میں عزت بولا۔
"جو کچھ بھی ہو‘ میں مہرک کو دیکھنے ضرور جاؤں گا اور اسے حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا خواہ مجھے اپنی زندگی ہی قربان کرنی پڑے!"

دو چار روز کے بعد وہ اسی ارادے سے دوستوں سے رخصت ہو کر سرباز کے پیروان قصبے کی طرف چل دیا۔ راستے میں آنے والے دیہات اور قصبوں میں اپنے زیورات فروخت کرتا کراتا جا رہا تھا۔ جہاں رات ہوتی رات بسر کر لیتا اور صبح پھر اپنا سفر شروع کر دیتا۔ اس وقت زیورات فروخت کرنا تو ایک وسیلہ تھا‘ ورنہ اس کا مقصد تو پیروان جا کر مہرک کو دیکھنا تھا جس کے حسن کا چرچا سن کر وہ آیا تھا۔ وہ راستے میں جس کسی سے پیروان کے بارے میں دریافت کرتا تو وہ یہی کہتا۔
"سرسبز اور خوبصورت پیروان جہاں مہرک جیسی خوبصورت دوشیزہ رہتی ہے"۔

وہ پہلے ہی نادیدہ مہرک کے حسن پر فریفتہ ہو رہا تھا‘ اب لوگوں کی زبانی اس قسم کی باتیں سن سن کر اور بھی اس کا پرستار بن گیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اب تو وہ بھی فاضل کی طرح مہرک کے حسن کی شان میں اشعار بھی کہنے لگا تھا اور اس نے اپنی ان دیکھی محبوبہ کو اپنی شاعری کا موضوع بنا لیا تھا‘ فاضل تو مہرک کو دیکھ کر اس کا دیوانہ ہوا تھا لیکن عزت تو اسے دیکھے بغیر

ہی اس کی چاہت کا اسیر ہو گیا تھا۔ اسی طرح چلتا چلاتا جب وہ پیروان کے قصبے میں پہنچا تو لوگوں نے بلوچی روایات کے مطابق اس کو خوش آمدید کہا اور اس کی خاطر تواضع کی پھر جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ وہاں چند روز قیام کرنا چاہتا ہے تو انھوں نے اسے رہنے کے لیے جگہ بھی دی جب لوگوں کو اس بات کا پتا چلا کہ ان کا مہمان شاعر ہے تو اس کی اور بھی آؤ بھگت کی اور آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے۔

"یہ ہمارے قصبے کی عزت افزائی ہے کہ ہمارے ہاں ایک شاعر مہمان ہوا ہے۔"

اس طرح عزت وہاں رہنے لگا اور ساتھ ہی ساتھ مہرک کو دیکھنے کا موقع تلاش کرنے لگا۔ وہ کسی سے کھل کے اس کے بارے میں پوچھ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ یہ بات اخلاق و آداب کے خلاف تھی مگر دل ہی دل میں ایسے منصوبے ضرور بناتا رہتا تھا، جن پر عمل کر کے وہ مہرک کو دیکھ سکے۔ ایک روز وہ ندی کے کنارے ٹہل رہا تھا کہ اس نے ایک جگہ چند نوجوان لڑکیاں دیکھیں جو ایک حسین و جمیل دوشیزہ کو اپنے جھرمٹ میں لیے ہوئے تھیں۔ یوں تو ان لڑکیوں میں ایک سے ایک حسین لڑکی شامل تھی لیکن اس وقت وہ جس لڑکی کے گرد جمع تھیں اس کے حسن کی بات ہی کچھ اور تھی۔ وہ ان میں شامل ہو کے بھی سب سے الگ تھلگ دکھائی دے رہی تھی۔ جونہی عزت نے اسے دیکھا، وہ دیکھتا رہ گیا۔ اپنے آپ سے کہنے لگا۔

"ہو نہ ہو، یقیناً یہی مہرک ہے یہی وہ حسینہ ہے جس کو دیکھنے کی آرزو میں وہ پیروان آیا ہے اور یہی وہ حسین و جمیل دوشیزہ ہے جس کے گیت فاضل گا رہا ہے۔"

اس کے اس قیاس کی تصدیق بھی اس وقت ہو گئی جب ان لڑکیوں میں سے کسی ایک نے اس کا نام لے کر کہا۔

"مہرک دیر ہو رہی ہے۔۔۔۔۔ ہمیں گھر چلنا چاہیے۔"

اس تصدیق کے ساتھ عزت کی شیفتگی میں کہیں زیادہ اضافہ ہو گیا۔ لڑکیاں تو چلی گئیں لیکن وہ وہیں اس طرح بت بنا کھڑا رہا جیسے اس پر کسی نے جادو کر دیا ہو۔ اس وقت اس نے جو

شعر کہا وہ کچھ اس طرح تھا۔

''میرے معبود نے مجھے ایک بے مثال تحفے سے نوازا ہے
اور مہرک رب کی درگاہ سے نمودار ہوئی ہے''۔

اس روز کے بعد سے عزت کی شاعری کا محور بھی مہرک بن گئی تھی۔ اب اسے دنیا اور دنیا والوں سے کوئی غرض نہ تھی۔ اس کی نظروں میں ہر وقت مہرک کی تصویر تھی اور وہ تھا۔ دن رات اسی کے خیال میں کھویا رہتا اور اسی کے حسن کی تعریف و توصیف میں شعر کہتا رہتا۔ مہرک نے اس کی شاعری میں چار چاند لگا دیے تھے۔ اس میں اس قدر دلکشی آ گئی تھی کہ سننے والے کے دل میں اتر جاتی اور پھر جلد ہی لوگوں کے لبوں پر آ جاتی۔ وہ مہرک کے حسن و جوانی کی تعریف میں اشعار کہہ رہا تھا جو پیروان میں مشہور و مقبول ہو رہے تھے۔ عالم یہ تھا کہ ادھر وہ کوئی نظم یا اشعار کہتا اور اس کے ساتھ ہی وہ لوگوں کی زبان پر آ جاتے۔ عزت کے اشعار تو مقبول ہو رہے تھے مگر یہ بات بھی مشہور ہو گئی تھی کہ پیروان میں ایک پاگل شاعر آیا ہوا ہے جو مہرک کے حسن و جمال کے گیت گاتا پھر رہا ہے۔ جوں جوں لوگوں میں یہ بات مشہور ہوتی جا رہی تھی توں توں مہرک کے گھر والوں کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی دراصل عزت کی شاعری ان کے لیے بدنامی کا باعث بن رہی تھی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اس مسئلے کا کیا حل نکالیں۔؟ ظاہر ہے وہ اس کو شعر کہنے سے تو نہیں روک سکتے تھے' اگر اسے زور زبر سے روکتے تو یہ بات مزید بدنامی کا باعث ہو سکتی تھی۔ آخر کئی دنوں کی سوچ بچار کے بعد مہرک کے باپ سالک نے ایک روز آدمی بھیج کر عزت کو اپنے پاس بلایا۔ جب وہ آ گیا تو اس کی خوب خاطر تواضع کی اور اس کے بعد سالک کہنے لگا۔

''تم ہمارے قصبے میں مہمان ہو اور تمہارے آرام و آسائش کا خیال رکھنا ہمارا فرض ہے۔۔۔ مجھے بتاؤ یہاں کوئی تکلیف تو نہیں۔۔''

عزت نے شکریہ ادا کرتے ہوئے جواب دیا۔

''میں آپ لوگوں کی اس عزت افزائی کے لیے بہت ممنون ہوں۔''

سالک نے بات آگے بڑھانے کی غرض سے کہا۔

"تمہاری شاعری بھی ہمارے قصبے کے لوگوں میں بہت مقبول ہے۔۔؟"

اس پر عزت پھر تشکر کے انداز میں بولا۔

"قصبے کے لوگوں نے مجھے اتنی محبت دے کر مجھ پر احسان کیا ہے۔"

جب اس نے یہ کہا تو سالک نے قدرے تیز اور تلخ لہجے میں کہا۔

"مگر ہماری اس محبت اور عزت افزائی کا تم جس طرح شکریہ ادا کر رہے ہو اسے کسی طرح بھی مناسب نہیں کہا جا سکتا۔ تمہیں یہ حق ہرگز نہیں پہنچتا کہ ایک نیک اور باعصمت دوشیزہ کو اپنے شعروں سے بدنام کرو۔۔۔ لوگوں میں اس کی خیالی محبت کا چرچا کرو۔"

سالک کی یہ بات سن کر عزت قدرے سٹپٹا سا گیا۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ سالک اتنی خاطر تواضع کے بعد اس قسم کی بات کرے گا مگر اس کی یہ بات غلط بھی نہ تھی جس کی وہ کوئی وضاحت یا تردید کرتا۔ اس وقت اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔۔؟ وہ اپنے میزبان کے سامنے جھوٹ بھی نہیں بولنا چاہتا تھا اور سچ کہنے کی اس میں جرأت نہیں ہو رہی تھی۔ آخر اس نے ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ برا نہ مانیں تو میں ایک عرض کروں۔۔۔؟"

"بالکل کہو۔۔۔ تمہیں اپنے دل کی بات صاف صاف کہنی چاہیے۔۔۔؟ اگر تم سچ بولو گے تو مجھے خوشی ہو گی۔؟"

جب سالک نے یہ کہا تو اس کے جواب میں عزت جھجکتے ہوئے بولا۔

"دراصل میں مہرک سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور اسی غرض سے پیروان آیا ہوں۔!"

سالک کو تو اس کے ارادوں کا پہلے سے اندازہ تھا مگر وہ غصے کا اظہار کر کے بات کو بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح بات بڑھنے کی بجائے یہیں ختم ہو جائے۔ اس نے عزت کی طرف دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

"اے نوجوان شاعر! شاید تمہیں معلوم نہیں، مہرک بچپن ہی سے اپنے چچازاد سے منسوب ہو

چکی ہے۔ اس لیے تم اپنے دل سے یہ خیال نکال دو۔۔۔۔ تمھاری یہ تمنا پوری نہیں ہو سکے گی۔!"

سالک کا یہ جواب سن کر عزت واپس چلا گیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ مہرک کا خیال چھوڑ دیتا لیکن وہ تو اسے ہر صورت میں حاصل کرنے کا پختہ ارادہ کر چکا تھا' پھر وہ کیسے یہ خیال چھوڑ دیتا۔؟ مہرک کی محبت تو اس کی رگ رگ میں خون کی طرح دوڑ رہی تھی' وہ اسے کیسے ترک کر سکتا تھا۔؟ یہی وجہ تھی کہ اس نے مہرک کے باپ کے جواب کے بعد بھی اس کی محبت کے گیت گانا بند نہ کیے بلکہ اس میں اور بھی شدت پیدا ہو گئی تھی۔ پہلے تو اس کی شاعری میں صرف مہرک کے حسن کی تعریفیں ہوتی تھیں مگر اب اس کے اشعار میں اسے حاصل کرنے کی آرزو کا کھلم کھلا اظہار ہونے لگا تھا۔ مہرک کے ماں باپ کے لیے یہ صورت حال اور بھی زیادہ پریشان کن تھی۔ انھوں نے آپس میں مشورہ کر کے طے کیا کہ۔

"اس دیوانے شاعر سے پیچھا چھڑانے کی ایک یہی ترکیب ہے کہ مہرک سے شادی کرنے کے لیے کوئی ایسی شرط لگا دی جائے جو یہ پوری نہ کر سکے۔ صرف اسی طرح اس سے ہمیں نجات مل سکتی ہے۔"!

سب نے اس بات پر اتفاق کیا اور پھر ایک روز سالک نے عزت کو گھر پر بلایا تو وہ خوشی خوشی چلا آیا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید مہرک کے ماں باپ نے اس کی درخواست منظور کر لی ہے' یہی سوچ کر جب وہ ان کے گھر پہنچا تو انھوں نے اسے اس طرح خوش آمدید کہا جیسے وہ اس سے ناراض نہیں ہیں۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی گفتگو کرنے کے بعد سالک نے عزت سے کہا۔

"اگر تم واقعی مہرک سے شادی کرنا چاہتے ہو تو تمھیں ہماری چند شرائط پوری کرنی ہوں گی۔؟"

یہ سن کر عزت خوش ہوتے ہوئے جلدی سے بولا۔

"میں مہرک کی خاطر ہر شرط پوری کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے بتائیے وہ شرائط کیا ہیں۔؟"

اس کے اتنا پوچھنے پر مہرک کے والد نے بتایا کہ تمھیں مقررہ تعداد میں گائے اور بھیڑ بکریوں کے علاوہ نقد روپیہ' زیورات اور کپڑے دینا ہوں گے اور تب تمھاری شادی ہو سکے گی۔ عزت نے ان کی یہ شرط منظور کرتے ہوئے گائے' بھیڑ بکریوں' زیورات اور کپڑوں کی تعداد کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے ان کی اس قدر تعداد بتائی جو مہیا کرنا عزت کے بس کی بات نہ تھی۔ اس کے پاس زیورات فروخت کر کے جو جمع پونجی تھی' وہ بھی اتنے روز وہاں رہتے رہتے خاصی حد تک خرچ ہو چکی تھی اور اب جو پیسے بچے تھے ان میں مہرک کے ماں باپ کی مطلوبہ چیزیں خریدنا ممکن نہیں ہو سکتا تھا' اس لیے وہ بہت پریشان ہو گیا۔

دوسری طرف سالک کا اصرار تھا کہ۔

"اگر تمھیں مہرک سے شادی کرنی ہے تو مطلوبہ چیزیں فراہم کرنا لازمی ہیں۔"

یہ سن کر عزت نے ان سے کہا:۔

"مجھے اس کے لیے کچھ مہلت درکار ہے تاکہ یہ چیزیں مہیا کر سکوں۔؟"

"ٹھیک ہے۔۔۔ ہم تمھیں اس کے لیے مہلت دیتے ہیں لیکن یہ یاد رکھنا کہ جب تک تم شرائط پوری نہ کر سکو' پیروان میں مت آنا۔؟!"

"مجھے منظور ہے۔ آپ لوگ میرا انتظار کریں گے۔ اللہ نے چاہا تو میں بہت جلد آپ کی مطلوبہ چیزیں لے کر آؤں گا اور پھر مہرک سے شادی کروں گا۔"

مہرک کے ماں باپ کو یقین تھا کہ یہ شرائط ایسی ہیں جو عزت کبھی بھی پوری نہ کر سکے گا اور انھیں اس سے نجات مل جائے گا لیکن عزت تو ہر طور پر مہرک کو حاصل کرنے کے درپے تھا' چاہے اس کے لیے اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ اس نے جتنی مہلت مانگی تھی مہرک کے والدین نے دے دی تھی لہٰذا وہ ان کو خدا حافظ کہہ کے واپس گھر چلا آیا اور سوچنے لگا۔

"اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔؟ اتنے پیسے کیسے جمع کیے جائیں۔؟"

جہاں اس کا قیام تھا وہاں اس کا ایک دوست بن چکا تھا۔ وہ اس کا رازدار بھی تھا'

عزت نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا کہ وہ مہرک سے محبت کرتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ واپس آ کر اس نے اپنے دوست کو ساری بات بتائی اور یہ بھی کہا میں ان سے اتنے عرصہ کی مہلت لے آیا ہوں تاکہ ان کی شرائط پوری کرنے کے لیے وسائل پیدا کر سکوں۔ اس نے شرائط کی تفصیل بھی بیان کی اور یہ بھی بتایا کہ انھوں نے اتنی تعداد میں گائیں' بھیڑبکریاں' زیورات' کپڑے وغیرہ طلب کیے ہیں۔ یہ سب کچھ بتانے کے بعد وہ اپنے دوست سے کہنے لگا۔

"یہ شرائط پوری کرنے کے لیے میں کیسے کامیاب ہو سکتا ہوں۔ تم مجھے کوئی مشورہ دو۔؟"

دوست اس کی ساری بات سن کر مشورہ دیتے ہوئے بولا۔

"تم پیروان میں رہ کے تو یہ شرائط پوری نہیں کر سکو گے' بہتر یہ ہے یہاں سے کسی دوسرے شہر چلے جاؤ اور وہاں جا کر کوشش کرو۔"

"تمھارا مشورہ ٹھیک ہے۔ یہاں رہ کر یہ ممکن نہیں ہو گا۔"

عزت کو بھی دوست کا مشورہ پسند آیا تھا لہٰذا اس نے اپنا مختصر سا سامان باندھا اور وہاں سے رخصت ہو کے قسمت آزمائی کے لیے گوادر کی طرف چل دیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے محنت شروع کر دی اور زیورات بنا کے بیچنے لگا تاکہ مہرک کو حاصل کرنے کے لیے اتنے پیسے جمع کر سکے جس سے اس کے ماں باپ کی مطلوبہ چیزیں مہیا ہو سکیں۔ وہ دن رات محنت کر رہا تھا' مہرک کی امید میں زندہ تھا اور اس کی یاد میں شاعری کے پھول کھلا رہا تھا۔ اس کی شاعری کا موضوع تو وہی پہلے والا تھا' وہی مہرک کا حسن تھا جس کی وہ تعریفیں کر رہا تھا اور وہی اس کا عشق تھا جس میں وہ دردر مارا مارا پھر رہا تھا لیکن اب اس کے شعروں میں ہجر و فراق کی آگ کچھ زیادہ ہی بھڑک چکی تھی۔

اس دوران پیروان میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا اور مہرک اپنی سہیلیوں کے ساتھ سیر و تفریح کر رہی تھی۔ ساری سہیلیاں باتیں اور چہل قدمی کرتی ہوئی ندی پر آ گئیں مہرک اپنی سہیلیوں سے کہنے لگی۔

''آؤ' ندی میں نہائیں۔؟''
مگر سہیلیاں راضی نہ ہوئیں۔ انھوں نے کہا۔
''تم نہالو۔ ہمارا جی نہیں چاہتا۔۔۔۔!''
ٹھیک ہے۔۔۔ تم ذرا خیال رکھنا کوئی مرد ادھر نہ آجائے۔۔۔۔۔!''

اس نے یہ کہا اور ندی میں داخل ہو کر نہانے لگی۔ ادھر اس کی سہیلیاں بھی اپنی باتوں میں لگ گئیں اور انھیں پتا ہی نہ چل سکا کہ تاجروں کا ایک قافلہ آ رہا ہے۔ انھوں نے جب قافلہ دیکھا' اس وقت وہ بہت قریب آ چکا تھا۔ یہ دیکھتے ہی شور کرتے ہوئے پکارنے لگیں۔

''مہرک جلدی کرو' باہر نکلو' لوگ آ رہے ہیں جلدی سے کپڑے پہن لو۔۔۔۔۔!''

لیکن اب اتنا وقت نہیں تھا کہ مہرک ندی سے باہر آ کر کپڑے پہن سکتی کیونکہ قافلے والے بالکل ہی قریب آ گئے تھے۔ لوگوں کو دیکھ کر اس کی سہیلیاں ادھر ادھر درختوں کی آڑ میں کھڑی ہو گئیں تاکہ ان کی نظریں ان پر نہ پڑیں مگر مہرک کچھ نہ کر سکتی تھی جب اس سے کچھ نہ بن پڑا تو اس نے اپنا جسم پانی میں ڈبو کے چہرے اور گردن کو باہر رکھا اور پھر چہرے اور گردن پر اپنے سیاہ لمبے بال پھیلا کے اپنے آپ کو چھپا لیا لیکن اتفاق سے قافلے میں شامل بعض لوگوں نے مہرک کا چہرہ دیکھ لیا تھا۔ جو قافلہ ندی کے کنارے کے پاس پہنچا تو لوگوں نے دیکھا کہ پانی کے اوپر ایک نسوانی چہرہ تیر رہا تھا جسے سیاہ لمبے بالوں نے چھپایا ہوا تھا۔ ان میں سے بعض یہ منظر دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے۔ انھوں نے سمجھا' شاید پانی میں کوئی ڈائن یا بلا ہے اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

جب یہ قافلہ قصبے میں پہنچا تو وہاں کے سرکردہ افراد نے استقبال کیا۔ پھر جب سب بیٹھ کے ستانے لگے تو بلوچی روایت کے مطابق ان سے سفر کے حالات دریافت کیے گئے۔ قافلے کے سالار نے پہلے اپنے سفر کے حالات بیان کیے اور آخر میں کہنے لگا۔

''جب ہم پیروان میں داخل ہونے والے تھے تو ہم نے ندی میں ایک چڑیل دیکھی جس کا چہرہ پانی کے اوپر تیر رہا تھا جسے اس کے سیاہ لمبے بالوں نے چھپایا ہوا تھا۔''

جب اس نے اتنا کہا تو قصبے کا ایک بوڑھا آدمی بولا۔

"آپ لوگوں کی غلط فہمی ہوئی ہو گی۔۔۔۔ پیروان میں چڑیل کہاں سے آ گئی۔"

"شاید کوئی عورت نہا رہی ہو۔!"

ایک اور نے رائے دی۔ اور پھر سب ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔

ادھر ہوا یہ کہ قافلہ گزر جانے کے بعد مہرک پانی سے باہر آئی مگر دیر تک پانی میں رہنے سے اس کا سانس پھول گیا تھا اور وہ نڈھال سی ہو گئی تھی کیونکہ جب تک قافلے والے اس کے قریب سے گزرتے رہے تھے' اتنی دیر تک اسے خود کو گردن تک پانی میں رکھنا پڑا تھا' چونکہ اب وہ نڈھال ہو گئی تھی اس لیے سہیلیاں اسے سہارا دے کر گھر لے گئیں۔

دوسرے روز سالک نے قافلے کے سالار اور اس کے چند ساتھیوں کو دعوت پر مدعو کیا۔ انھوں نے جب وہاں مہرک کو دیکھا تو ان میں سے دو تین آدمی آپس میں کہنے لگے۔

"یقیناً یہی وہ دوشیزہ ہے جو ندی میں نہا رہی تھی۔۔۔ ہم نے اس کا چہرہ دیکھ لیا تھا۔۔۔۔۔"

اتنے میں سالک نے بتایا

"یہ میری بیٹی مہرک ہے۔۔۔۔"

وہ یہ تو جان گئے تھے کہ جس چہرے کو بعض قافلے والوں نے چڑیل سمجھا تھا' وہ مہرک ہی تھی لیکن انھوں نے اس بات کا اظہار نہیں کیا اور اب جب کہ سالک نے اپنی بیٹی کا تعارف کرایا تو سالار نے دعا دیتے ہوئے کہا۔

"بیٹی جیتی رہو۔۔۔۔ اللہ تمھیں خوش رکھے۔۔۔"

جب وہ دعوت سے واپس اپنی قیام گاہ پر آئے تو بڑی دیر تک مہرک کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اس کی جھیل سی آنکھوں اور گھٹاؤں جیسے بالوں کا تذکرہ کرتے رہے۔ سبھی اس کے پھول جیسے سرخ و سفید چہرے کی تعریف کر رہے تھے اور اس کے سرو قد ہونے پر آفریں کہہ رہے تھے۔

مہرک تو اسی وقت سے نڈھال ہو رہی تھی جب وہ ندی سے آئی تھی اور اب اس کی

طبیعت اور زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ بیمار پڑ گئی اور لمحہ بہ لمحہ بیماری میں اضافہ ہوتا چلا گیا گھر والوں نے وید حکیم بلائے' ہر طرح کا علاج کیا لیکن اس کی بیماری کم ہونے کی بجائے اور بڑھتی چلی گئی۔ وہ روز بروز کمزور اور نحیف ہوتی جا رہی تھی اور دوا دارو کام نہیں آ رہا تھا۔ پھر لوگوں نے دیکھا کہ چند ہی دنوں کے اندر اندر چاند کو شرمانے والی حسن کی دیوی مہرک ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کے رہ گئی تھی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر پیروان کے بڑے بوڑھوں کا کہنا یہ تھا کہ۔

"اسے قافلے کے سالار کی نظر لگ گئی تھی۔۔۔۔"

دوسری طرف عزت' مہرک سے شادی کی شرائط پوری کرنے کے لیے پوری تندہی سے دولت کے حصول میں لگا ہوا تھا۔ اس عرصہ میں اس نے نہ رات کو رات دیکھا اور نہ دن کو دن سمجھا' بس دولت کمانے میں مصروف رہا۔ یہاں تک کہ وہ دن آ گیا' جب اس کے پاس اتنا پیسہ جمع ہو گیا تھا جس سے وہ شرائط کی مطلوبہ چیزیں آسانی سے خرید سکتا تھا' یہ دیکھ کر اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا کیونکہ اس نے وہ کامیابی حاصل کر لی تھی جس کی اسے توقع نہیں تھی۔ حقیقت تو یہ تھی' اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنی دولت کمانے میں کس طرح کامیاب ہو گیا۔؟ وہ چلنے کی تیاری کرتے ہوئے خود سے کہنے لگا۔

"اب مہرک میرے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی۔۔۔وہ صرف میری ہے!"

اس نے مہرک کی یاد میں جس قدر شاعری کی تھی' وہ حقیقت کا روپ دھارنے والی تھی' اس نے کپڑے' زیورات اور دوسرا ضروری سامان تو وہیں سے خرید لیا تھا لہٰذا ایک روز رخت سفر باندھا اور پیروان کی جانب روانہ ہو گیا' راستے میں وہ طرح طرح کے خیالات میں گھرا ہوا تھا اور جلد سے جلد پیروان پہنچنا چاہتا تھا کیونکہ اس نے مہرک کے باپ کی تمام شرائط پوری کر دی تھیں۔

"مہرک میری ہے۔۔۔۔ ہم دونوں ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہو جائیں گے!"

وہ نہ جانے کیا کچھ سوچتا ہوا جا رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنی محبوبہ کی تعریف میں شعر

بھی کہتا جا رہا تھا۔ وہ کہہ رہ تھا۔

"تم نے میری محبوبہ کو نہیں دیکھا' جب وہ ناز و ادا کے پھول بکھیرتی ہوئی نکلتی ہے تو اس کے حسن کے سامنے چاند اور ستارے ماند پڑ جاتے ہیں۔

جب وہ زیور پہنتی ہے اور قید (ایک زیور) ڈالتی ہے

تو مجھ جیسے نوجوان عاشقوں کے ہوش اڑ جاتے ہیں

جب وہ عطر' مشک' اور عنبر لگاتی ہے

تو مجھے اس پر پہاڑی ہرنی کا گمان ہوتا ہے

جب وہ بڑی بڑی حسین آنکھوں میں کاجل لگا کر پتلیوں کو حرکت دیتی ہے

تو میرے سینے میں تیر پیوست ہو جاتے ہیں اور میں بے حال ہو جاتا ہوں

جب وہ اپنی پتلی کمر کو کمان کی طرح لچکاتی ہے

تو اس کی لمبی اور خوبصورت گردن ہزار فتنے برپا کر دیتی ہے

وہ تخت پر بیٹھ کر شیریں کی یاد تازہ کرتی ہے

اور اس نامراد دل کو قرار پہنچاتی ہے

میں کسی دیوانے کی مانند مست ہوں

اور میری محبوبہ حسین سہیلیوں کے جھگھٹے میں اپنے دوست کو بلا رہی ہے۔"

اس طرح عزت' مہرک کے خیالات میں کھویا ہوا چلا جا رہا تھا۔ جوں جوں پیروان قریب آ رہا تھا توں توں اس کے جذبات میں ہلچل مچتی جا رہی تھی اور جب وہ پیروان کے پاس پہنچا تو اس نے قصبے کے باہر دیکھا بہت سے لوگ ایک جنازہ لیے جا رہے تھے اور ساتھ ساتھ بعض افراد آہ و زاری بھی کر رہے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کے جنازے میں شریک ایک آدمی سے پوچھا۔

"یہ کس کا جنازہ ہے۔۔۔؟ ظالم موت نے کسے اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔۔۔۔؟"

جواب میں وہ آدمی آنسو بہاتا ہوا آہستہ سے بولا۔

"پیروان کے سالک کی پیاری بیٹی مہرک مرگئی ہے۔۔۔یہ اسی کا جنازہ ہے!"

یہ سنتے ہی عزت دھک سے رہ گیا۔ اسے اس آدمی کی بات پر یقین نہ آیا تھا اس لیے دوسرے سے دریافت کیا تو اس نے بھی یہی بتایا یہ سن کر عزت نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

"مہرک کیسے مر سکتی ہے۔۔۔؟"

ابھی وہ یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ اتنے میں مہرک کا باپ سالک بھی اسے دکھائی دیا جو جنازے کے ساتھ روتا ہوا جا رہا تھا۔ اب اسے مزید تصدیق کی ضرورت نہ تھی۔ اس نے وہ تمام سامان ادھر ادھر پھینک دیا جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا اور مہرک مہرک پکارتا ہوا دیوانوں کی طرح جنازے میں شریک ہوگیا۔ بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے کہ مہرک کی موت کے بعد عزت نے پیروان قصبے کو بددعا دیتے ہوئے کہا تھا۔

"اے پیروان! تیری سرزمین نے
مہرک جیسی حسین و جمیل دوشیزہ کو نگل لیا
خدا کرے تیری ان رنگین فضاؤں پر
بھیانک موت کی اداسیاں چھا جائیں ۔"

اور لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ 'عزت کی اس بددعا کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیروان میں ایک خوفناک مہلک بیماری پھیلی جس کی وجہ سے وہاں کے باشندے نقل مکانی کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس طرح وہ قصبہ جو کبھی سرسبز و شاداب اور خوشحال و آباد تھا' وہاں موت کی خاموشیاں رقص کرنے لگیں۔ مہرک مرگئی تھی مگر عزت کے دل میں مہرک کی محبت ابھی تک زندہ تھی' تاہم اب پیروان میں رہنا اس کے لیے مشکل تھا۔ اس کی خود فراموشی اب دیوانگی کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ اس کے لبوں پر ہر وقت مہرک کا نام ہوتا تھا اور وہ اس کی یاد میں شعر کہتا رہتا تھا۔ آخر ایک روز اس نے اپنی محبوبہ مہرک کی قبر کو الوداعی نظروں سے دیکھا اور پیروان سے نکل کھڑا ہوا۔ قریہ قریہ اور شہر شہر گھومنے لگا' پہاڑوں اور جنگلوں میں مارا مارا پھرنے لگا اس کے لبوں پر مہرک کا نام تھا اور وہ اس کی یاد میں درد بھرے اشعار کہہ رہا تھا۔

"میں نے خراساں کا سفر اختیار کیا
اور ہندوستان کی آرام دہ زندگی دیکھ لی
میں نے یہودیوں کے ملک کا بھی نظارہ کیا
مگر مجھے گل اندام مہرک سی صورت کہیں نظر نہ آئی
کابل سے غزنی تک
گنداوہ سے مریوں کے دیس تک
مجھے ایسی پری نظر نہیں آئی
جو مہرک کی ہم پلہ ہو
میں اب مہرک کو نہیں دیکھ سکتا
کاش! میں دنیا کے باغ کا یہ خوبصورت پھول حاصل کر سکتا۔"

سمو اور مست توکلی

سمو اور مست توکلی کی کہانی بلوچستان کی عوامی داستانوں کی آخری کڑی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس کا زمانہ انیسویں صدی عیسوی ہے اور اس کا تعلق ایک ایسے پاک باز بزرگ سے ہے جس کے عقیدت مندوں کی تعداد آج بھی بے شمار ہے جو اسے ولایت کا درجہ دیتے ہیں۔ یہ بزرگ ہی اس داستان کا مرکزی کردار ہے جس کا نام طوق علی تھا چونکہ وہ بچپن ہی سے مجذوب تھا اور اس نے اپنی پوری زندگی مجذوبیت میں گزار دی اس لیے مست کے نام سے مشہور ہوا۔ بلوچی زبان کے اس نامور شاعر اور مست الست درویش سے بہت سی کرامات اور خارق عادت واقعات منسوب ہیں۔ سمو سے اس کے عشق کی ابتدا کے بارے میں دو روایات بیان کی جاتی ہیں۔

طوق علی کا تعلق مری قبیلے شیرانی کی شاخ درکانی سے تھا اور وہ ۱۸۲۸ء میں کاہان یا کوہلو کے مقام پر پیدا ہوا۔ اس کے خاندان والوں کا ذریعہ معاش بھیڑ بکریاں پالنا تھا اس لیے جب یہ ذرا بڑا ہوا تو اس کو بھی بھیڑ بکریوں کا ریوڑ چرانے پر لگا دیا گیا۔ یہ روزانہ اپنے ہم عمر دوسرے لڑکوں کے ساتھ جنگلوں اور پہاڑوں میں نکل جاتا اور جب شام ہونے لگتی تو اپنا ریوڑ واپس

لے آتا۔ یہ لوگ جس علاقے میں رہتے تھے وہ بلوچستان کے دیگر علاقوں کی نسبت قدرے زیادہ سرسبز تھا اس لیے سب دوست اپنی اپنی بھیڑ بکریاں چرنے کے لیے چھوڑ دیتے اور خود ادھر ادھر جنگلی پھل وغیرہ کھانے میں لگ جاتے۔ ان پہاڑوں میں انجیر، انار، بیر اور زیتون کے درخت عام پائے جاتے تھے۔ طوق علی چونکہ بچپن ہی سے مست الست واقع ہوا تھا اس لیے اکثر ایسے ہوتا کہ وہ اپنی بھیڑ بکریوں سے بے خبر ہو جاتا اور اس کے ساتھی انھیں جمع کر کے واپس لاتے۔ اگر کبھی کوئی بھیڑ یا بکری کم ہو جاتی تو باپ پوچھتا۔

"ایک جانور کم ہے، اسے کہاں چھوڑ آئے۔۔؟"

مست جواب دینے کی بجائے خاموش رہتا کیونکہ اسے ان باتوں کا ہوش ہی نہ ہوتا تھا۔ اس کی ماں بچپن ہی میں وفات پا گئی تھی اور یہ چھ بھائی تھے جن میں سے چار بھائی یکے بعد دیگرے وفات پا گئے تھے۔ صرف مست اور اس کا بھائی پیرک رہ گئے تھے۔ جب اس کی عمر چودہ برس کی ہوئی تو باپ کا بھی انتقال ہو گیا۔ پھر جب یہ اٹھارہ برس کی عمر کو پہنچا تو اس نے اپنے بھائی کی شادی کر دی مگر خود ازدواجی بندھن سے آزاد رہا۔ اسے قدرتی نظاروں سے تو بچپن ہی سے لگاؤ تھا لیکن اب یہ لگاؤ حد سے بڑھ گیا تھا۔ اس زمانے میں بھی مست اپنی بھیڑ بکریاں چرانے جاتا تھا، وہ اپنا ریوڑ وادی میں چھوڑ کر خود کسی پہاڑ پر چڑھ کے بیٹھ جاتا اور چاروں طرف پھیلے ہوئے فطرت کے مناظر دیکھتا رہتا۔ اس دور میں اس پر جذب و کیف کی کیفیت بھی کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی اور یہی وہ زمانہ ہے جب اس کے عشق کی داستان شروع ہوتی ہے۔ وہ عین شباب کے عالم میں سمو نام کی عورت پر فدا ہوا اور ایسے ہوا کہ زندگی بھر اسی کا نام جپتا رہا۔ وہ نہ تو اسے حاصل ہوئی اور نہ ہی اس نے اسے حاصل کرنے کی کوشش کی، بس صرف عشق کیا اور اس عشق میں بلوچی زبان کو لازوال شاعری کا سرمایہ دیا۔ ایک روایت میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ رحمکانیوں نے کسی دشمنی کی بنا پر شیرانیوں کے چند افراد کو زخمی کر دیا تھا جس پر ان سے انتقام لینے کا طے کیا گیا۔ سب نے بیٹھ کر مشورہ کیا اور سات آدمیوں کا انتخاب کیا گیا جن کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ رحمکانیوں سے بدلہ لینے جائیں گے۔

ان سات آدمیوں کا انتخاب قرعہ اندازی سے کیا گیا اور ان میں مست کا نام بھی شامل تھا۔ مست کو جنگ و جدل اور خون ریزی سے سخت نفرت تھی۔ اس کی شاعری تو محبت کا پیغام تھی، پھر وہ ہر وقت مجذوبیت میں رہتا تھا مگر اس کا نام قرعہ اندازی میں آگیا تھا اور قبائلی رسم و رواج کے مطابق انکار نہیں کر سکتا تھا لہٰذا ہتھیاروں سے لیس ہو کر یہ ساتوں آدمی رمکانیوں سے بدلہ لینے کی خاطر توڑی نامی پہاڑ کی جانب چل دیے جہاں انکے دشمن رہتے تھے۔ یہ لوگ جا رہے تھے کہ راستے میں بارش شروع ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے شدید ہو گئی۔ موسلا دھار بارش کی وجہ سے یہ لوگ ادھر ادھر کوئی پناہ گاہ تلاش کرنے لگے کہ اتنے میں ایک طرف سے چند خیمے نظر آئے وہ سب اس طرف چل دیے اور وہاں جا کر ایک خیمے میں داخل ہو گئے۔ اس وقت اس خیمے میں صرف ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی جو انتہائی حسین و جمیل تھی اور اس کا نام سمو تھا۔ قبیلے کی روایت کے مطابق سمو نے انھیں خوش آمدید کہا اور بولی۔

"لائیے میں آپ کے ہتھیار محفوظ جگہ پر رکھ دوں۔۔۔!"

سب نے اپنے اپنے ہتھیار دے دیے جو اس نے خیمے میں ایک طرف رکھ دیے اور ان کے لیے قہوہ بنانے لگی۔ ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ بارش کے ساتھ تیز جھکڑ بھی چلنے لگے۔ یہ دیکھ کر سمو خیمے سے باہر نکل آئی اور خیمے کی طنابیں کسنے لگی۔ اس دوران تیز ہوا سے اس کا دوپٹا سر سے سرک گیا اور پھر اڑ کر دور جا گرا۔ اب وہ ننگے سر تھی اور اس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ بارش کی وجہ سے وہ بالکل بھیگ گئی تھی یہ وہ عجیب و غریب اور بے ساختہ کیفیت تھی جس سے اس کے خوبصورت جسم کے اعضاء کے نشیب و فراز دکھائی دینے لگے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر مست دم بخود رہ گیا تھا۔ اس کی نظریں سمو کی ناگنوں کی طرح سیاہ زلفیں خوبصورت چہرے اور حسین جسم پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بیچاری شرما رہی تھی اور یہ تھا کہ مسلسل اسے دیکھے چلا جا رہا تھا۔ اس وقت مست یہ بھی بھول گیا تھا کہ بلوچی قبائلی رسم و رواج کے مطابق کسی شادی شدہ عورت سے عشق کرنا اپنی موت کو دعوت دینا ہے۔ وہ تو سمو کے چہرے اور جسم میں ایسا گم ہوا تھا کہ اسے اپنا ہوش تک نہ رہا تھا۔

اس سلسلے میں دوسری روایت یوں بیان کی جاتی ہے کہ مست ایک روز دھربی پہاڑ کی وادیوں میں اپنا ریوڑ چرانے گیا ہوا تھا کہ یکایک بادل چھا گئے اور بوندا باندی شروع ہو گئی۔ ادھر شام کے سائے گہرے ہو گئے تھے۔ اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں تاکہ کہیں آنے والی بارش سے بچنے کے لیے پناہ لی جائے۔ پھیلتے ہوئے اندھیروں میں اسے دور ایک خیمے میں روشنی دکھائی دی' وہ اپنے ریوڑ کے ساتھ اس طرف چل دیا۔ جب خیمے کے پاس گیا تو خیمے کا مالک باہر آیا اور اس نے اپنے مہمان کے بیٹھنے کے لیے ایک چٹائی بچھا دی۔ اتنے میں بارش تیز ہو گئی' اس کے ساتھ خنک ہوا بھی چل رہی تھی۔ یہ دیکھ کر خیمے کے مالک نے مست کو خیمے کے اندر بلا لیا۔ اس نے خیمے میں نہ صرف اسے آرام سے بیٹھنے کی محفوظ جگہ دی بلکہ اس کی خاطر تواضع بھی کی۔ بارش اتنی تیز ہو گئی تھی کہ اب مست کا واپس جانا ممکن نہیں تھا اس لیے میزبان نے اسے وہیں رات گزارنے کی دعوت دی۔ وہ بڑی دیر تک بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے' یہاں تک کی آدھی رات ہو گئی اور موسلادھار بارش کا پانی خیمے کا اندر آنا شروع ہو گیا۔ یہ دیکھ کر میزبان نے اپنی بیوی سمو کو آواز دے کر جگایا اور کہا۔

''اٹھو' اور باہر جا کر خیمے کی طنابیں اچھی طرح کس دو۔۔۔''

اتفاق سے اس وقت مست بھی جاگ رہا تھا اور اپنا مٹی کا پائپ پینے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے پائپ سلگانے کے لیے دیا سلائی جلائی اور روشنی میں اس کی نظر سمو پر پڑی جو اس وقت ابھی ابھی نیند سے بیدار ہوئی تھی اور بغیر دوپٹے کے کھڑی تھی۔ اس کی سیاہ اور دراز زلفیں گھٹنوں تک پہنچ رہی تھیں اور یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے اس نے سیاہ چادر اوڑھ رکھی ہو۔ اس کا چہرہ اندھیرے میں طلوع ہوتے ہوئے چاند کی طرح نظر آ رہا تھا۔ مست اسے دیکھتے ہی اس طرح خود فراموش ہو گیا تھا کہ اسے یہ بھی یاد نہ رہا' اس کے ہاتھ میں جلتی ہوئی دیا سلائی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی انگلیوں میں آبلے پڑ گئے۔ سمو کی ایک ہی جھلک نے توق علی کو زندگی بھر کے لیے مست بنا دیا تھا۔ صبح تک اس پر غشی کی کیفیت طاری رہی اور اس بات کا احساس بھی نہ رہا کہ سمو اس آدمی کی بیوی ہے جو اس کا میزبان اور جس نے اسے

رات پناہ دی تھی۔ پھر یہ بھی تھا کہ وہ شادی شدہ تھی اور اس کو حاصل کرنا ناممکن تھا' اس کے باوجود وہ بے اختیار ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے اشعار میں ایک جگہ خود کہا ہے۔

"تم جس عورت کو دل دے بیٹھے ہو
وہ شادی شدہ ہے اور زندگی بھر جدوجہد کرنے کے باوجود تمہارے ہاتھ نہ آسکے گی
اس لیے سمو کا خیال دل سے نکال دو"

جب صبح ہوئی تو مست پر اسی طرح غشی کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ دیوانگی کے عالم میں بیٹھا تھا اور رات بارش اور تیز ہوا کی وجہ سے اس کا ریوڑ ادھر ادھر تتر بتر ہو چکا تھا۔ سمو اور اس کے شوہر کا تعلق پھروئی قبیلے سے تھا اس نے لوگوں کو بتایا کہ۔

"یہ شخص کل رات بارش میں پناہ لینے آیا تو میں نے اسے اپنے خیمے میں پناہ دی مگر یہ رات ہی سے سمو کو دیکھنے کے بعد دیوانگی کے عالم میں ہے اور مسلسل اسے دیکھے چلا جا رہا ہے۔۔۔!"

اس موقع پر بعض لوگوں کی رائے تھی کہ اس نے شادی شدہ عورت کو بری نظر سے دیکھا ہے اس لیے اسے قتل کر دینا چاہیے لیکن جب انھوں نے مست کا جائزہ لیا تو واقعی وہ دیوانوں کی طرح خود فراموشی کے عالم میں تھا۔ اسے تو اپنا ہوش تک نہ تھا۔ یہ دیکھ کر انھوں نے طے کیا کہ۔

"بہتر یہی ہے' اسے اس کے قبیلے والوں کے سپرد کر دیا جائے۔۔۔!"

اور پھر انھوں نے یہی کیا۔ اس طرح مست کی عشقیہ داستان کی ابتدا ہونے کی دونوں روایتوں میں کچھ فرق ہے لیکن ان میں ایک بات مشترک ہے اور وہ یہ کہ مست بارش میں پناہ حاصل کرنے کی خاطر خیمے میں گیا تھا اور اسی وجہ سے اس نے سمو کو دیکھا تھا جس پر وہ زندگی بھر فدا رہا۔ اس نے اپنی ایک نظم میں اس واقعہ کا اس طرح ذکر کیا ہے۔

"بادلوں نے گرجنا شروع کر دیا اور بارش ہونے لگی
ہم بھی نہیں چھپے' بارش میں چلتے گئے کہ

اس بیابان میں کسی قبیلے والے کا گھر نظر آئے
ادھر چلیں جہاں میری موتی جیسی محبوبہ کا خیمہ ہے
میں بھی اپنے ہتھیاروں سے مسلح تھا
سفید بادل گرجے اور رقص شروع کر دیا جیسے شادی بیاہ میں ہوتا ہے
بارش کے تیز چھینٹوں نے خیمے کی طنابیں ڈھیلی کر دیں
اسی وقت طنابیں کس دی گئیں
تیز ہوا نے بارش کے ساتھ مل کر اس کا دوپٹا سر سے اتار دیا
میری دور بیں اور حیرت زدہ نگاہوں نے دیکھا
میرے جسم کے تمام اعضا نے میری آنکھوں کی تائید کرتے ہوئے ساتھ دیا
اس کی دو آنکھیں لالٹین کی طرح روشن ہیں
چونک جانے والے ہرن کی مانند وحشی ہیں
زلفیں بل کھا کے کالے ناگوں کی طرح شانوں پر پڑی ہیں
مجھے دیوانگی کی لہروں نے اپنے گھیرے میں لے لیا
مجھے نشانے لگنے والی گولی نے مار ڈالا
جب وہ اپنی پر کیف آنکھیں جھکاتی ہے
تو عاشق کی بے قراری اور بڑھ جاتی ہے"

مست کو شیرانیوں کے سپرد کر دیا گیا لیکن معاملہ یہاں ختم نہ ہوا' یہ تو عشق کی ابتدا تھی۔ مست' پھر واپس آ کر سمو کے خیمے سے دور پہاڑ کے دامن میں بیٹھ گیا اور ٹکٹکی لگائے خیمے کی طرف دیکھنے لگا۔ اب یہی اس کا معمول بن گیا تھا کہ دور بیٹھا سمو کے خیمے کی طرف دیکھتا رہتا تاکہ سمو کسی کام سے باہر آئے تو وہ اس کا دیدار کر سکے۔ اس کی شاعری بھی سمو کے لیے وقف ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے حسن کی تعریف' اس کی چاہت' اس سے ملنے کی خواہش' اس کے عشق میں دل کی بے قراری' اس کی شاعری کا یہی موضوع تھا۔ وہ خیمے پر نظریں جمائے دور

بیٹھا شعر کہتا رہتا اور اگر کوئی اس کے پاس سے گزرتا تو اس سے پوچھتا۔
"کیا تم نے سمو کو دیکھا ہے۔۔۔؟ سمو کہاں ہے۔۔۔؟"

لوگ اس کی حالت دیکھ کر ہنستے ہوئے گزر جاتے 'بعض کو اس کی دیوانگی پر افسوس ہوتا لیکن مست ان تمام باتوں سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ وہ پہاڑوں سے باتیں کرتا' درختوں سے خطاب کرتا اور پرندوں کو پیغام دے کر اپنی محبوبہ سمو کی طرف بھیجتا اور کہتا۔

"اے سبز پرندے
جدائی کا شکوہ کرنا چھوڑ دے
چٹان سے نیچے اتر آ
تاکہ میں تجھے اپنا پیغامبر بناؤں
میرے محبوب کے پاس میرا سلام لے جا
ہوا میں تیرتا ہوا وسیع میدانوں کو پار کر کے
اس کے پاس جا
میرے محبوب کی نشانیاں یہ ہیں
اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے ہیں
اس کی ستواں ناک سرمے کی سلائی جیسی ہے
اس کے دونوں ابرو ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں
میرے دوست کے سینے پر تین لڑوں والا چاندی کا تعویز آویزاں ہے
اس کی گردن کونج جیسی ہے
جس میں سفید چاندی کا زیور زیب دیتا ہے
سمو کی چاہت
میرے بدن پر چابک کی طرح لگ رہی ہے"

سمو کا شوہر اور اس کے عزیز رشتہ دار اس صورت حال سے بڑے پریشان تھے۔ یہ

بات ان کے لیے بڑی ندامت اور بدنامی کا باعث تھی کہ ان کی عورت سے اس طرح کھلے عام عشق کا اظہار کیا جا رہا تھا چنانچہ پھروئی قبیلے کے چند آدمی اور اس کا شوہر شیرانی قبیلے کے سردار گزین خان مری کے پاس آئے اور شکایت کرتے ہوئے کہا۔

''سردار! اس آدمی کی وجہ سے ہمارے پورے پھروئی قبیلے کی بدنامی ہو رہی ہے۔۔۔ وہ سمو کے خیمے سے کچھ فاصلے پر بیٹھ کر اس کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔۔۔''

سردار نے ساری بات سنی اور آدمی بھیج کر مست کو بلوایا مگر اس کی مجذوبانہ حالت دیکھ کر اسے یقین ہو گیا کہ اس کا عشق سچا ہے جس میں جسمانی ہوس کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اس نے سمو کے شوہر کو سمجھایا مگر اسے اس بات کا یقین نہ آیا کیونکہ وہ تو خود مست کو پہروں خیمے کی طرف نظریں جمائے دیکھتا تھا۔ دن ہو یا رات، صبح ہو یا شام وہ دور بیٹھا دیکھتا رہتا تھا اور پھر اس کی شاعری میں بھی سمو ہی سمو دکھائی دیتی تھی۔ یہی نہیں وہ لوگوں سے بھی سمو ہی کے بارے میں پوچھتا رہتا تھا، اس لیے وہ اس بات کو کیسے تسلیم کر سکتا تھا۔؟ وہ دل ہی دل میں اس سے نجات حاصل کرنے کی ترکیبیں سوچتا رہتا تھا۔

ایک دن ہوا یہ کہ مست خود ہی سردار گزین خان کے پاس پہنچ گیا اور اس سے کہنے لگا۔

''اے مہربان سردار۔۔۔ مجھ پر احسان کر اور میری ایک تمنا پوری کر دے۔۔۔؟!''

''کہو، تمہاری تمنا کیا ہے۔۔۔؟ اگر میں پوری کر سکا تو ضرور کروں گا۔۔۔؟''

اس پر مست نے کہا

''میں نے آج تک سمو سے ملاقات نہیں کی اور نہ ہی کبھی اس سے بات کی ہے۔ کسی طرح مجھے اس سے ملاقات کرا دے۔؟''

سردار سوچنے لگا، موقع اچھا ہے، کوئی ایسی ترکیب کی جائے جس سے اس کی سمو سے ملاقات ہو جائے۔ اس سے یہ بھی پتا چل جائے گا کہ اس کے عشق کی حقیقت کیا ہے۔۔۔؟

اس نے چند آدمیوں کے علاوہ مست کو بھی ساتھ لے لیا اور شکار کے لیے چل دیا۔ وہاں پہنچ گیا جہاں پھروئی قبیلے کے لوگ آباد تھے۔ اس نے سمو کے خیمے کے قریب ہی جا کر ڈیرا جما دیا۔

سمو کے شوہر نے جب یہ دیکھا کہ سردار گزین خان آیا ہے تو اس نے اسے اپنی عزت افزائی سمجھا اور اس کی خاطر تواضع میں لگ گیا۔ جو روایتی کھانے تھے وہ تیار کرائے اور سردار کے ساتھ ساتھ اس کے آدمیوں کو بھی پیش کیے۔ رات کو محفل جمی اور صبح ہوئی تو سردار نے سمو کے شوہر کو حکم دیا کہ وہ قریبی پہاڑوں سے لکڑیاں کاٹ کرلائے۔ جب وہ چلا گیا تو اس نے سمو سے کہا کہ وہ اپنا ریوڑ لے کر سامنے والے پہاڑ کے دامن میں جائے اور وہاں چرا کے لائے۔ وہاں پہلے ہی سے مست کو بٹھا دیا گیا تھا اسی لیے سردار نے سمو کو یہ بھی تاکید کی۔

"اگر تمہیں وہاں مست مل جائے تو اس سے دو چار باتیں ضرور کرلینا۔۔۔!"

یہ سردار کا حکم تھا' بھلا سمو اس سے انکار کیسے کر سکتی تھی۔ وہ سردار کے کہنے کے مطابق ریوڑ لے کر پہاڑ کے دامن میں چلی گئی اور ادھر ادھر بھیڑ بکریاں چرا رہی تھی کہ ایک جگہ مست کو بیٹھے دیکھا۔ اسے کیا معلوم تھا' وہ اسی کے انتظار میں بیٹھا ہے۔ وہ اس کی طرف بڑھی اور جونہی اس پر مست کی نظریں پڑیں وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ سمو نے قریب جا کر اس سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن اسے ہوش نہ آیا۔ یہ دیکھ کر وہ گھبرا گئی' بھاگی بھاگی سردار کے پاس آئی اور ہانپتے کانپتے کہنے لگی۔

"سردار! آپ کا آدمی وہاں بے ہوش پڑا ہے۔۔۔"

"بے ہوش پڑا ہے۔۔۔؟ وہ کیسے۔۔۔؟"

سردار کے اتنا پوچھنے پر سمو نے بتایا۔

"میں جیسے ہی اس کے قریب پہنچی اور اس کی نگاہ مجھ پر پڑی تو وہ بے ہوش ہو گیا۔ میں نے اس سے بات کرنے کی بہتیری کوشش کی لیکن اسے ہوش نہیں آیا۔"

یہ سنتے ہی سردار اپنے آدمیوں کے ساتھ وہاں پہنچا اور دیکھا مست بے ہوش پڑا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر سب کو یقین ہو گیا کہ مست واقعی سچا عاشق ہے اور اس سے کسی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہے۔ سردار نے اسی وقت سمو کے شوہر کو بلایا اور کہا۔

"مست کے بارے میں برا مت سوچو' وہ تو مست قلندر ہے۔۔۔ اگر تم نے اسے کچھ برا بھلا

کہا تو ہو سکتا ہے کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ۔۔۔ اس کا عشق پاک ہے۔"

اس کے بعد سردار گزین خان اپنے آدمیوں کے ساتھ واپس کاہان چلا گیا مگر مست وہیں رہا اور دیوانگی کے عالم میں دور بیٹھ کر سمو کے خیمے کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا۔ اس طرح وہ کئی کئی دن تک مسلسل بیٹھا رہتا تھا۔ نہ دن دیکھتا اور نہ رات' بس مجذوبانہ انداز میں بیٹھا رہتا اور سمو کی تعریف میں شعر کہتا رہتا۔ اس کے یہ اشعار بہت جلد لوگوں کی زبان پر آ جاتے تھے اور سینہ بہ سینہ پھیل جاتے تھے۔ اس کی ساری شاعری کا ایک ہی موضوع تھا اور وہ تھا سمو۔ ادھر سمو پر بھی اس کا رد عمل ہو رہا تھا اور وہ دل ہی دل میں اسے چاہنے لگی تھی۔ وہی نہیں بلکہ اس کا شوہر بھی یہ بات جان گیا تھا کہ مست درویش ہے' وہ ہوس پرست نہیں ہے اس لیے وہ بھی اس کا احترام کرنے لگا تھا لیکن ان کے قبیلے والے ابھی تک ناراض تھے۔ ان کے خیال میں قبیلے کی کسی شادی شدہ عورت کے عشق میں اس طرح شعر کہنے سے پورے قبیلے کی بدنامی ہو رہی تھی۔ انھوں نے بارہا مست کو وہاں آنے سے منع کیا اور سمو کے خیمے کو مسلسل دیکھنے سے ٹوکا بھی مگر وہ تو اپنے آپ ہی میں نہیں تھا' پھر اس پر ان کی باتوں کا اثر کیا ہوتا۔؟ تھوڑی دیر کے لیے ادھر اُدھر چلا جاتا اور پھر واپس آ کر وہیں بیٹھ کر خیمے کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگتا۔ آخر قبیلے کے بعض لوگوں نے آپس میں مشورہ کر کے طے کیا کہ۔

"اس کو جان سے ختم کر دینا چاہیے۔۔۔ اسی طرح اس سے نجات مل سکے گی۔!"

انھوں نے اس کام کے لیے ایک آدمی کو تیار کیا جس کا نام گدا تھا۔ وہ مست کی تاک میں لگ گیا اور کسی ایسے موقع کا انتظار کرنے لگا جب وہ اس کا کام تمام کر سکے۔ ایک روز مست بے خودی کے عالم میں ایک پہاڑی پر کھڑا ادھر ادھر قدرت کا نظارہ کر رہا تھا' اس وقت گدا بھی اس کا پیچھا کر رہا تھا جس نے یہ موقع غنیمت جانا۔ وہ چپکے سے دبے دبے پاؤں پیچھے سے اس کے قریب گیا اور پہاڑی سے نیچے دھکا دے کر گرا دیا۔ اس کا خیال تھا مست جب پہاڑ کی بلندی سے نیچے پتھروں پر گرے گا تو ہلاک ہو جائے گا لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران و پریشان رہ گیا کہ وہ پہاڑ سے اس طرح نیچے گرا جیسے کوئی پرندہ اڑتا ہوا نیچے آ بیٹھے۔ اسے ذرا سی

چوٹ بھی نہ آئی۔ یہ دیکھتے ہی گدے پر خوف سے لرزہ طاری ہو گیا۔ وہ اسی وقت نیچے آکر مست کے قدموں میں گر کر معافی مانگنے لگا۔

"سائیں مست! میں نے گناہ کیا ہے مجھے معاف کر دو۔؟"

مست اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک شعر میں کہتا ہے

وہ گدا ہو یا طوق علی، دونوں اپنے اپنے مقصد کے لیے دیوانے ہیں

"میں سمو کے عشق میں اپنے ہوش کھو بیٹھا ہوں اور گدا اپنی قوم کی عزت کی خاطر میری جان لینے پر دیوانہ ہو رہا ہے۔"

لوگوں کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو وہ دل سے اس کے عقیدت مند ہو گئے۔ ادھر سمو کی عقیدت بھی محبت میں بدل رہی تھی مگر اس کی یہ خاموش محبت کسی طلب کے بغیر تھی۔ وہ جب اسے نہ دیکھ پاتی تو بے چین سی ہو جاتی۔ مست چونکہ ہر وقت جذب و مستی میں رہتا تھا اور دن رات پہاڑوں اور وادیوں میں گھومتا رہتا تھا اس لیے کئی کئی روز تک غائب رہتا اور پھر اچانک کسی دن ادھر آنکلتا جسے دیکھ کر سمو نہال ہو جاتی۔ ان کے خیمے بھی آج یہاں ہوتے تھے تو کل کہیں اور چلے جاتے تھے مگر مست جب بھی آتا اسے تلاش کر لیتا تھا۔ وہ تو اپنی سمو سے کبھی جدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر وہ آنکھوں کے سامنے نہ ہوتی تو اس کے اشعار میں موجود ہوتی۔ وہ اس کی یاد میں شعر کہتا اور سیلانی بنا یہاں سے وہاں گھومتا رہتا۔ اب اسے سمو کے خیمے سے دور بیٹھنے کی بھی ضرورت نہیں رہی تھی کیونکہ وہ دونوں میاں بیوی بھی اس کے عقیدت مندوں میں شامل ہو چکے تھے، اس لیے اب جب کبھی وہ ادھر کا پھیرا کرتا تو انھی کے پاس ٹھہرتا اور وہ اس کی خوب خاطر تواضع کرتے۔ اپنی صحرا نوردی کے بارے میں مست خود کہتا ہے۔

"خوشا تیری متوالی چال جو تیری دلفریب ہنسی کی ترجمانی کرتی ہے

میں کوہلو، کاہان اور بارکھان کے علاقے تیری سبک رفتاری پر قربان کر دوں

اے سمو! تیری سبک رفتاری پر مست کی آنکھیں قربان ہیں

مجھے روح نے بے چین کر دیا ہے' اے سمو آؤ اس پہاڑ سے نکل چلیں
آ میری محبوبہ! میں تجھے اچھے راستوں پر لے چلوں
سمو کی شکل و صورت کی مثال کہاں سے لائیں
جہاں بھی تلاش کریں سمو کا جواب نہیں ملتا
سمو ایسی حسین ہے جیسے آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے
سمو کے بدن کی خوشبو ایسی ہے جیسے بارش کے بعد زمین سے قدرتی مہک آتی ہے
میں سفر سے واپس لوٹ آیا کہ سمو کا حال معلوم کروں"

سمو کی چاہت مست کے روئیں روئیں میں رچ بس چکی تھی جو اس کی سیاحت اور صحرا نوردی میں بھی اس کے ساتھ ساتھ ہوتی تھی۔ ایک بار یہ گھومتے گھماتے قصبہ مل میں سردار میر محمد گنگوری کے ہاں مہمان بن گیا سردار نے بڑی آؤ بھگت کی۔ سردیوں کا موسم تھا' آگ جل رہی تھی' خیمے میں قالین بچھے ہوئے تھے۔ اور ایک جانب خوبصورت پلنگ پر بستر بچھا تھا۔ سردار نے مست سے کہا۔

"سائیں! آپ بستر پر بیٹھیں۔!"

مگر مست نے جواب دیا۔

"نہیں۔۔۔اس پر میں نہیں بیٹھ سکتا۔۔۔اس پر سمو بیٹھے گی۔

اور خود نیچے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک خالی کٹورا طلب کیا اور جب کٹورا دیا گیا تو خیمے سے نکل کر ایک طرف چل دیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ دودھ سے بھرا ہوا کٹورا ہاتھ میں لیے مست وہاں کھڑا تھا۔ سردار نے پوچھا تو جواب دیا۔

"یہ دودھ سمو کی ہرنیوں کا ہے۔"

اس میں سے ایک گھونٹ خود پیا اور پھر کٹورا دیتے ہوئے کہا

"یہ بچا ہوا دودھ سمو کی سہیلیوں میں تقسیم کر دو۔"

ایک بار مست کے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ بگٹی سردار غلام مرتضیٰ کے پاس جا کر ڈیرا جمالیا۔

سردار نے ایک روز دریافت کیا۔

"سائیں مست میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔۔۔؟ مجھے کوئی خدمت بتائیں۔؟"

جواب میں مست کہنے لگا

"سردار! میں سمو سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ میرے ساتھ چند بگٹی شہسوار اور گانے بجانے والے میراثی روانہ کر دو۔۔۔ میرے اور سمو کے لیے نیا جوڑا بنوا دو اور کچھ بھیڑیں دنبے بھی ساتھ کر دو تاکہ شادی کی دعوت کی جا سکے۔۔۔"

سردار نے اس کے لیے نیا جوڑا اور سمو کے لیے جوڑے کے ساتھ زیورات بھی بنوائے۔ جب شادی کا سامان تیار ہو گیا تو چند شہسواروں کے علاوہ کچھ بھیڑیں اور دنبے بھی ساتھ کر دیے۔ اس طرح مست گانے بجانے والوں کو ساتھ لیے مری علاقے کی جانب چل دیا۔ ایک جگہ پہنچ کر پہاڑ کے دامن میں ڈیرا جما لیا جو بگٹی اور مری کے علاقوں کے درمیان تھی۔ جونہی ڈیرا جما، مست نے گانے والوں کو کہا۔

"گانا شروع کیا جائے۔"

دیکھتے ہی دیکھتے پہاڑ کے دامن میں ڈھول ڈھماکوں اور باجوں گاجوں کی آوازیں گونجنے لگیں جس مقام پر یہ سب کچھ ہو رہا تھا وہاں سے سمو کی رہائش ڈیڑھ سو میل دور تھی، اسے خبر تک نہ تھی اور یہاں شادی کی رسمیں ادا کی جا رہی تھی۔ جب کچھ دیر تک گانا بجانا ہو چکا تو مست نے ساتھ آنے والے شہسواروں سے کہا۔

"اب تم لوگ واپس جاؤ۔۔۔ اور سردار کو بتا دینا کہ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی ہے۔۔۔"

ایک بار مست سیاحت کرتا ہوا ڈیرہ غازی خان پہنچ گیا۔ نواب جمال لغاری کو پتا چلا کہ مست آیا ہے جو سمو کے حسن کی تعریف میں شعر سنا کر لوگوں سے پوچھتا پھرتا ہے کہ سمو کہاں ہے۔۔۔؟ اس نے سوچا۔

"مست کا امتحان لینا چاہیے۔!"

اسی وقت آدمی بھیج کر اسے دربار میں طلب کیا۔ جیسے ہی یہ دربار میں پہنچا' سمو کی شان میں شعر پڑھنے لگا۔ نواب نے اس کا امتحان لینے کی خاطر شہر کی سب سے حسین طوائف موراں کو بلایا اور اسے ہدایت کی کہ کسی طرح مست کے دماغ سے سمو کا خیال نکال دو۔ چنانچہ رات کو ایک آراستہ پیراستہ کمرے میں مست کو رکھا گیا اور کہا گیا کہ رات کو سمو آئے گی۔ مست خوشی خوشی کمرے میں چلا گیا۔ جب رات ہوئی تو موراں چھم چھم کرتی پورے ناز نخرے کے ساتھ کمرے میں آگئی۔ اسے دیکھتے ہی مست نے پوچھا۔

''سمو کہاں ہے۔؟''

اس نے جواب میں بڑی دلربائی سے کہا۔

''میں ہی تو سمو ہوں!''

پھر اس نے ناز و ادا کا حربہ استعمال کیا۔ مست کو رام کرنے کے لیے اپنے حسن کا ہر تیر' آزمایا مگر اس نے نظر بھر کے بھی اس کی جانب نہ دیکھا اور کسی نہ کسی طرح وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ مست نے ایک نظم میں اسی واقعہ کے بارے میں کہا ہے۔

''طوائفوں میں موراں بہت مشہور ہے
وہ چودھویں کے چاند کی طرح آئی
ساون کے بادلوں کی طرح مٹکتی ہوئی آئی
اپنی زلفوں کی خوشبو بکھیرتی ہوئی آئی
اپنے خوبصورت دراز گیسوؤں کے ساتھ
وہ کہنے لگی' میں تیری ہوں اور کسی کی نہیں
آدھی شب کے لمحوں میں تجھے بہلاؤں گی
تجھے اپنے وطن جانا بھول جائے گا
اس پر مست' سفید بادلوں کی طرح گرج اٹھا
اس نے کہا۔۔۔ اے میرے طاقتور سردارو

مجھے زبردستی طوائف کے ساتھ کمرے میں بند مت کرو
دل کو قید کرنے والی بھنگ مجھے زبردستی نہ پلاؤ
میں فاحشہ عورتوں کے لیے
سمو سے کیا ہوا عہد وفا نہیں توڑ سکتا"

مست زندگی بھر سیلانی رہا اور اس نے کسی ایک جگہ مستقل قیام نہیں کیا لیکن سیاحت میں اس وقت کے ہندوستان کے بیشتر شہروں میں گھوما پھرا۔ سندھ 'پنجاب' اور دیگر علاقوں میں واقع بزرگوں کے مزاروں پر گیا اور پھر واپس سمو کے پاس پہنچ گیا۔ کہا جاتا ہے' ایک بار اس نے معمول سے زیادہ روز تک سمو کے ہاں قیام کیا اور پھر جب وہاں سے رخصت ہونے لگا تو اس نے وہاں کی ہر چیز کو بڑی حسرت سے دیکھا۔ چند ہی روز بعد کچھ لوگوں کے ساتھ کاہان سے وادی ممّاڑ کی طرف جا رہا تھا۔ مست ساتھیوں سے آگے آگے تھا اور تیز رفتاری سے جا رہا تھا۔ اس نے اپنی رفتار اور تیز کرتے ہوئے کہا۔

"میں جا رہا ہوں۔۔۔ تم لوگ سب سمو کے ہاں آجانا!"

تھوڑی ہی دیر میں مست نظروں سے اوجھل ہو گیا اور جب دوسرے لوگ سمو کی قیام گاہ پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں' وہاں سب آہ وزاری کر رہے ہیں۔ پھروئی قبیلے والے جمع تھے کیونکہ سمو کا انتقال ہو چکا تھا۔ انھوں نے سمو کو دفن کر دیا تھا اور مست قبر کے پاس کھڑا زور زور سے کہہ رہا تھا۔

"تم لوگوں نے میری سمو کو میری اجازت کے بغیر کیسے دفن کر دیا۔؟"

سمو کے شوہر نے اس سے کہا۔

"سائیں مست! تم جہاں کہیں کہو ہم سمو کو دوبارہ وہاں دفن کر دیتے ہیں۔۔۔؟"

جواب میں مست اپنے عصا کے سہارے قبر کے پاس جھکا خاموش کھڑا رہا اور تھوڑی دیر بعد بولا۔

"میں نے سمو کی مرضی دریافت کر لی ہے۔ سمو کی خواہش ہے کہ اسے یہیں دفن رہنے دیا

جائے۔۔۔"

اس کے بعد اس نے تمام لوگوں کو وہاں سے چلے جانے کے لیے کہا اور خود وہیں ٹھہر گیا اور کئی روز تک وہیں بیٹھا رہا۔ جس جگہ سمو کی قبر ہے وہ گمماڑ میں ہے اور آج بھی سمو کی پٹی یا سمو کا میدان کے نام سے معروف ہے۔ مست نے سمو کی موت پر جو نظم کہی ہے اس میں کہتا ہے۔

"مجھے عرش کے فرشتوں نے زمین پر خبر دی ہے کہ
سمو جنت میں طوبیٰ کے نیچے حوروں کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہے
وہ نورانی پیالوں میں آبِ کوثر پیتی ہے
ایک نورانی پیالہ مست کے لیے بھی رکھا ہوا ہے
سمو کی خوش خرامی کی نقل کرنے کے لیے کونجوں نے قطار بنا رکھی ہے
وہ اپنی زبان میں نازک حسیناؤں کو آواز دیتی ہے
مست سندھ کے دور دراز علاقوں میں گھوم رہا ہے
اے سمو! میں سندھ میں تیری ہم شکل تلاش کر رہا ہوں
حالانکہ میں جانتا ہوں، تمہارا بدل نہیں مل سکتا کیونکہ تم جیسا کوئی نہیں"

مست سیلانی تو تھا ہی مگر سمو کی وفات کے بعد تو وہ بالکل ہی سیروسیاحت کا ہو کر رہ گیا تھا۔ پہلے تو وہ گھوم گھما کر چند روز بعد سمو کے پاس پہنچ جاتا تھا لیکن اس کی موت کے بعد یہ کشش بھی ختم ہو گئی تھی۔ اب وہ کس کے پاس جاتا۔۔۔؟ پہاڑوں، وادیوں میں گھومنا اور سمو کی یاد میں شعر کہنا، اب یہی اس کی زندگی تھی۔ آج یہاں تو کل وہاں۔۔۔ چند روز کہیں قیام کیا اور چند روز کسی اور جگہ ٹھہر گیا۔ اس صحرانوردی اور بے گھری میں صرف سمو کی یاد تھی جو اس کی زندگی کا سہارا بنی ہوئی تھی۔ ۱۸۸۱ء میں جب سردار نواب جمال خان لغاری حج پر جانے لگا تو اس نے ملازموں سے کہا، مست کو تلاش کر کے لاؤ، اسے بھی ساتھ لے جائیں۔ لوگ اسے تلاش کرنے گئے تو وہ سمو کی قبر پر بیٹھا تھا۔ جب اسے سردار کا پیغام دیا تو

کہنے لگا۔

"میں آج رات یہیں قیام کروں گا تاکہ سمو سے اجازت لے لوں۔۔۔"

جب سردار کے آدمی دوسرے روز مست کو لینے گئے تو وہ تیار تھا' بولا۔

"سمو نے اجازت دے دی ہے۔"

انھوں نے سواری کے لیے گھوڑا پیش کیا تو مست نے یہ کہتے ہوئے گھوڑے پر سوار ہونے سے انکار کردیا کہ

"سمو بیلی (سمو کا دوست) گھوڑے کی سواری نہیں کرے گا کیونکہ سمو نے اپنی زندگی میں مجھے ہمیشہ پیدل چلتے دیکھا ہے۔۔۔"

زندگی کے آخری دنوں میں مست ہنڑا میں ڈیوا خان کے پاس ٹھہرا ہوا تھا کہ بیمار پڑ گیا علاج کیا گیا مگر بیماری کم ہونے کی بجائے شدید ہوتی چلی گئی۔ یہ دیکھ کر مست نے ڈیوا خان سے کہا۔

"شیرانی قبیلے والوں کو اطلاع کردو کہ مجھے لے جائیں۔۔۔!"

آدمی بھیجے گئے' شیرانی قبیلے والے آئے اور مست کو چارپائی پر ڈال کر لے چلے۔ جب راستے میں کاہان سے ابھی تقریباً چودہ میل کے فاصلے پر تھے اور ایک ندی کے پاس پہنچے ہی تھے تو مست نے کہا۔

"یہاں ٹھہر جاؤ۔۔۔ اور مجھے زمین پر رکھ دو۔۔۔!"

مست کی زندگی کی یہ آخری منزل تھی۔ یہیں پر ۱۸۹۵ء میں اس کا انتقال ہو گیا' اس وقت اس کی عمر ۶۷ برس کی تھی اور اسی مقام پر اس کی آخری آرام گاہ ہے۔ آج بھی اس کے مزار پر ہزاروں عقیدت مند دور دور سے آکر اپنی محبت کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔ اس شہید عشق کے مزار پر منتیں مانگنے اور چڑھاوے چڑھانے والوں کی کمی نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے جب عقیدت مند خواتین مست کے مزار پر جاتی ہیں اور منتیں مانگتی ہیں تو اپنی زلفوں کا کچھ حصہ کاٹ کر نذرانے کے طور پر پیش کرتی ہیں تاکہ وہ اس عاشق صادق کی طفیل اپنی محبت میں

کامیاب ہو جائیں۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ مست کے مزار پر حاملہ عورتوں کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔

مست زندگی بھر سمو کے عشق میں مارا مارا پھرتا رہا' وہ بارہا اس کے پاس بھی رہا' اسے جی بھر کے دیکھا بھی لیکن اس کے دل اور نظروں کی تشنگی کبھی ختم نہ ہو سکی۔ یہ تشنگی اور یہ پیاس دید کے اس پہلے منظر کی دین تھی جب اس نے بارش سے بچنے کی خاطر سمو کے خیمے میں پناہ لی تھی اور اپنی محبوبہ کو پہلی بار دیکھا تھا۔ یہ منظر ساری زندگی اس کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو سکا۔ وہ آخر دم تک یہی کہتا رہا۔

"میں ایسا پیاسا ہوں کہ سات دریاؤں کا پانی پی کر بھی میری پیاس نہیں بجھتی
مگر سمو کے ہاتھ کے چلو بھر پانی سے میری تشنگی دور ہو جاتی ہے
میں ہاتھ اوپر اٹھا کر اپنے مالک سے عرض کرتا ہوں کہ۔
سمو کی جھگی پر موسلا دھار بارش کی بوندیں سایہ کریں
پھر وہ اپنی جھگی کی چھت پر اپنی مخروطی انگلیوں سے چٹائی رکھے
جھگی کا ستون گر گیا ہو گا اور وہ انھیں دیکھ رہی ہو گی کہ بارش کی تیز دھاریں کیسے گر رہی ہیں۔"

کتابیات

ہیر وارث شاہ	ایڈیٹر۔ عبدالعزیز	لاہور
مرزا صاحباں	پیلو	لاہور
سوہنی مہینوال	فضل شاہ	لاہور
پورن بھگت	قادر یار	لاہور
حکایاتِ پنجاب	رچرڈ ٹمپل	لاہور
(ترجمہ: لیجینڈز آف دی پاکستان)	ترجمہ: میاں عبدالرشید	
پاکستان کی عوامی کہانیاں	مرتبہ: قرۃ العین حیدر	کراچی
چناب سے پرما تک	مرتبہ: رفیق خاور	کراچی
پنجاب کے رومان	عبدالسلام خورشید	لاہور
پنجاب کے رومانی افسانے	فیروز سنز	لاہور
پنجاب کی لوک داستانیں	شفیع عقیل	کراچی
پریت کہانیاں	ایم ایس رندھاوا	جالندھر
شاہ عبداللطیف بھٹائی	محکمہ اطلاعات سندھ	کراچی
رسالہ شاہ عبداللطیف	سندھ یونیورسٹی	حیدر آباد

سندھ کی تاریخی کہانیاں	اعجاز الحق قدوسی	کراچی
پٹھانوں کے رومان	فارغ بخاری، رضا ہمدانی	پشاور
سرحد کے رومان	خاطر غزنوی	پشاور
بلوچوں کے رومان	انجم قزلباش	کوئٹہ
سرمست بلوچستان	ذکیہ سردار بلوچ	کوئٹہ
بلوچی لوک کہانیاں	جمیل زبیری	اسلام آباد
بلوچستان۔ شخصیات کے آئینہ میں	عزیز محمد بگسی	لاہور
تحفۃ الکرام	میر شیر علی قانع ٹھٹھوی ترجمہ: اختر رضوی	حیدر آباد
لوک تھیٹر	افضل پرویز	اسلام آباد

Pakistan Kee Lok Dastanain

Shafi Aqeel

National Language Authority
Pakistan